شہر اہرام و نیل اور وادی دجلہ و فرات

کی

سیاسی و تہذیبی سرگزشت

دجلہ و نیل

ہند و پاک کے عظیم دانشور

سید محمد تقی کے قلم کا انشائی معجزہ

(زیر طبع)

وہ......جنکو گردش دوراں نے پیس ڈالا ہے
انہی مستقبل ساز نسلوں کا مستقبل ساز ادب

"قطعات"

اُردو کے عظیم شاعر رئیس امروہی کا عظیم لہجہ
جو شیریں بھی ہے اور زہرناک بھی

قیمت تین روپے آٹھ آنے مجلد

ادارہ ذہن جدید - ۲۱ - فخرو بلڈنگ - میریٹ روڈ - کراچی - ۲

ماہنامہ

انشاء کراچی

جولائی ۶۵۸

موسس
رئیس امروہوی — سید محمد تقی

مدیر
جون ایلیا

ادارۂ تحریر
ممتاز سعید
سید نقی اختر
سبط اختر

یکے از مطبوعات ادارۂ ذہن جدید

۲۱- فخرو بلڈنگ
میریٹ روڈ کراچی

فون نمبر: — ۳۲۴۳۳ ۳۲۶۱۲

قیمت ۶ ر سالانہ ۷۲

چہرہ نما

انشائیہ — ادارہ — ۶

مضامین

تخلیقی عمل اور وجدان — شان الحق حقی — ۱۰
مشرق - جو مر رہا ہے — رئیس امروہوی — ۱۳
سرمایہ داری طرز پیداوار (داس کیپیٹال) — سید محمد تقی — ۱۵
عظیم سائنس دان نیل بوہر کے ساتھ چند لمحے — نقی اختر — ۱۸
آیئے ایک سائنسی سماج بنائیں — برٹرینڈ رسل ترجمہ ممتاز سعید — ۲۱

منظومات

• — نظر حیدرآبادی — ۲۶
وہ انتظار — ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۲۷
• — نازش پرتاب گڈھی — ۲۸
• — نظر امروہوی — ۲۹
خردمند سیاست کے نقیب — سحر انصاری — ۳۰
• — وسیم فاضلی - اکرام للتاپوری — ۳۱

افسانے اور خاکے

منزل — شوکت پرویز مسیحی — ۳۲
ہدایت نامۂ طلبہ بے تصویر — احمد جمال پاشا — ۳۹
آوارہ — ژالمیر سودربرگ - ترجمہ سلیم عاصمی — ۴۰
ڈاکٹر عبدالحق کے ساتھ ایک شام — جون ایلیا — ۴۳
تبدیلیاں — زبیر رشید صدیقی — ۴۶

طابع و ناشر رئیس امروہوی مطبوعہ مشہور آفسٹ پریس کراچی

بچے ہنستے کھیلتے
ہی
اچھے لگتے ہیں
گھر کی رونق اور مسرت بچوں کے دم سے ہی قائم
ہے۔ وہ ایک پل بھی نچلا نہیں بیٹھ سکتے۔ ان کا ننھا منھا
ذہن ہر لحظہ نئی نئی اور میٹھی میٹھی شرارتوں کی آماجگاہ بنا
رہتا ہے۔ اور اس طرح گھر بار کا دل موہ لیتا ہے۔ جب
وہ خاموش اور پژمردہ ہوں تو اسکا مطلب یہ ہے کہ
وہ تندرست نہیں۔ دودھ اور اشیاء خوراک میں غذائیت کی
کمی ہے ان کے نازک اور بڑھتے ہوئے قویٰ زیادہ حرکت کے
متحمل نہیں ہو سکتے۔ انکو نونہال بے بی ٹانک سے مضبوط بنائیے
نونہال
بے بی ٹانک

پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
قوم کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہے
صرف زیل پاک اور میپل لیف
سیمنٹ کے کارخانوں میں تقریباً ایک کروڑ ساٹھ لاکھ بوری سیمنٹ
(۱۶۰۰۰۰۰۰)
تیار ہوا ہے
جسکی بدولت آٹھ کروڑ روپے کے زر مبادلہ کی بچت اور آمدنی ہوچکی ہے
(۸۰۰۰۰۰۰۰)
یہ عظیم کارنامہ
صرف دو سال کی قلیل مدت میں
انجام پذیر ہوا ہے
ان کارخانوں کا کل سرمایہ
سات کروڑ روپے سے کم ہے
(۷۰۰۰۰۰۰۰)
پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے سیمنٹ
کے کارخانوں کا یہ عظیم کارنامہ
ان کے تیار کردہ سیمنٹ کی
عمدگی اور اعلیٰ معیار کی بدولت
ممکن ہوا
زیل پاک اور میپل لیف
پاکستانی صنعت کے لئے باعث فخر ہیں
منیجنگ ایجنٹس:- پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

اِنشائیہ

آزاد قوموں کے لئے چیزوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانا، اُن کا جائزہ لینا اور حقیقت شناسی کے ساتھ کسی تعیّنی اور قطعی فیصلے تک پہنچنا قومی زندگی کی سب سے پہلی اور سب سے اہم ضرورت ہے۔ اس نشست میں ہم اپنی صحافت کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کریں گے۔

جہاں تک بذاتِ خود صحافت کا تعلق ہے وہ قوموں کے عہدِ غلامی میں، کارزارِ حریت طلب مجاہد و مہم جو اور دورِ آزادی میں ایک مخلص دلسوز اور خیر اندیش مشیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ گر صحافت کی اس حیثیت کو ملحوظ رکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اردو صحافت نے ہر دور میں اپنا فرض بہر قیمت و بہر صورت ادا کیا ہے۔ جنگِ آزادی کے دوران کم و بیش سو سال تک ہمارے رسائل و صحائف نے اپنی کس مپرسی، بے بضاعتی اور مشکلات و موانع کے باوجود جو وطنی اور ملی خدمات انجام دی ہیں اُن کی مثال پیش کرنا کافی مشکل ہے۔ یہ دور وہ تھا جب ہماری قوم کا اعلیٰ اور متوسط طبقہ اردو کے (لوں) رسائل اور اخباروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ان کا مطالعہ شرفائے قوم کے نزدیک اس امر کا ثبوت تھا کہ پڑھنے والا یا تو جاہل ہے یا مفلس و پسماندہ۔ اس طرح حکومت کے جبر و احتساب کے علاوہ خود قوم کے صاحبِ مقدرت و صاحبِ وجاہت افراد بھی تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور اردو کی غریب صحافت کسی ہمت افزائی کے بغیر ہمت آزمائی میں مصروف تھی۔ اسے نہ ستائش کی تمنا تھی اور صلہ کی پروا۔ جتنے وسائل و ذرائع ہو سکتے تھے وہ صرف و محض انگلش جرنلزم سے مخصوص تھے۔ اردو اخبارات و رسائل تو ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چہ جائیکہ اُن کے حصول کی کوشش۔ پھر بھی صحافت کا بے سروسامان قافلہ غریب مگر وطن پرست و حریت پسند عوام کی تائید کے سہارے ہر لمحہ آگے بڑھتا رہا۔ اسے ہر موڑ پر اپنے عوام کی توجہ اور قوم کے حقیقی شعور اور مخصوص مزاج کی محرمانہ نمائندگی حاصل رہی۔

آج تو ہم ان حالات کا تصور بھی نہیں کر سکتے جن کا مقابلہ ہماری صحافت کو مدتوں تک کرنا پڑا ہے۔ کتنی مشقتیں جھیلی گئیں۔ کتنی عقوبتیں اور تعزیریں برداشت کرنا پڑیں۔ کیسے کیسے زہر کے گھونٹ پینا پڑے۔ کتنے ہاتھ قلم ہوئے۔ ان جیالوں کی حکایات خونچکاں لکھی ہی جاتی رہیں۔ وہ حکایاتِ خونچکاں ---- جن کا ایک ایک حرف ہماری قومی تاریخ کا سرمایہ اور ہمارے عملیۂ حیات کا عنوان ہے۔ اگر تحریکِ آزادی کے ہر دور کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اردو کے صحافیوں کی خدمات قادرین سے کہیں زیادہ ہیں۔ بعض افراد کو چھوڑ کر ارباب قیادت میں شروع سے لے کر آج تک ان افراد کی اکثریت رہی ہے جو صرف نفسِ خود نمائی، امتیاز طلبی اور اقتدار جوئی کے لئے مختلف جماعتوں میں شامل ہو جانے کے عادی ہیں۔ یہی ہوتا رہا ہے اور یہی آج بھی ہو رہا ہے۔

بجا طور پر امید کی جا سکتی ہے کہ آزادی کے بعد اردو صحافت کے دن بھی پھریں گے اور اس خزاں رسیدہ گلشن میں بھی بہار آئے گی۔ قومی صحافت کو اپنا حقیقی منصب حاصل ہوگا اور وہ بیان کا نظام پا سکے گی۔ آزادی ملی، تقدیریں بدلیں لیکن بدقسمتی سے جس کی امید کی جا رہی تھی نہیں ہوا

شانُ الحق حقی

تخلیقی عمل اور وجدان

حقی صاحب نے اپنے زیر طبع مجموعۂ کلام تارِ پیراہن میں نا منظوم کے عنوان سے ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ یہ مضمون اسی مقدمہ کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔

تخلیقی عمل۔ فن اور شعور کے سلسلے میں انیسویں صدی سے لے کر آج تک تجربی سائنس کی روشنی میں جو تنقیدی اور جمالیاتی بحثیں کی جاتی رہی ہیں اُن سے قطع نظر جدید نظریاتی سائنس کے جدید ترین رجحانات اور نتائج کی موجودگی میں مذکورہ حقائق کی آخر کیا تعبیر و توجیہہ ہو گی؟

کیا سائنس کی ریاضیاتی صداقتوں کو تاثراتی اور وجدانی صداقتوں پر پوری طرح منطبق کیا جا سکتا ہے؟ کیا خود سائنسی انداز فکر حیات و کائنات کے بارے میں تضادات کا شکار نہیں؟

کیا ان تضادات کے ہوتے ہوئے فنون لطیفہ میں آئیڈیل کے حصول، شعور کو فن کار اور ناظر کے ذاتی تاثر پر مبنی قرار دیا جائے؟

اس مضمون میں اس قسم کے ان گنت سوالات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پھر ان سوالات سے کتنے ہی سوالات خود پیدا ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ اور حضرات بھی اس بحث میں شرکت کریں گے۔ (مدیر)

ایک عرصے تک تو میری شاعری میں پیغام کا کیا ذکر مضمون کا بھی پتہ نہ تھا۔ بعض کیفیات میں کچھ کہنے کو جی چاہتا مگر بات تھوڑی سی نغمہ آفرینی سے آگے نہ بڑھتی۔ پھر میں نے قصداً بھی اس میں کچھ مدعا سمانے کی کوشش کی مگر آورد ہو کر رہ گئی۔ البتہ جو بیکلہ دلاحاصل باتیں خود بخود اور خواہ مخواہ موزوں ہو گئیں ان میں کبھی کوئی دلچسپ نکتہ، لطیفہ، یا الفاظ کا ایک انوکھا سا مجموعہ ضرور ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ موزوں کلمات اپنی نظر میں کچھ زیادہ پڑھی ہوتے چلے گئے لیکن اس شعر گوئی کے ساتھ ایک تشنگی کا احساس بھی رہا کہ جو کچھ کہا وہ بہت ادھورا اور ناکافی ہے یہ تشنگی مشق شاعری کے ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ اور اس مجموعہ کو پیش کرتے وقت بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

اس مسلسل تشنگی و ناتمامی کے علاوہ تخلیقی کاوش کے وقت بھی ایک خلش یا تشنگی کا احساس رہا۔ جو کبھی تھوڑی سی آمد کے بعد اور کبھی پوری نظم یا غزل ہو جانے کے بعد رفع ہو گئی۔ مگر ایسی صورت میں یہ طے کرنا محال تھا کہ یہ خلش کسی خاص بات کی آمد کے لئے تھی۔ یا جس شعر کے کہنے سے جی ہلکا ہوا اس میں کوئی خاص بات پائی جاتی تھی۔ جسے کہے بغیر کل نہ پڑے۔ بظاہر تو وہ زندگی کا کوئی بہت مانوس تجربہ یا بہت گہرا نقش نہیں معلوم ہوتا۔ یہ اپنی ذات کے وہ بھید ہیں جو پہلے نہیں جاتے۔

شانُ الحق حقی

تخلیقی عمل اور وجدان

حقی صاحب نے اپنے زیرِ طبع مجموعۂ کلام تارِ پیراہن میں نا منظوم کے عنوان سے ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ یہ مضمون اسی مقدمہ کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔

تخلیقی عمل۔ فن اور شعور کے سلسلے میں انیسویں صدی سے لے کر آج تک تجربی سائنس کی روشنی میں جو تنقیدی اور جمالیاتی بحثیں کی جاتی رہی ہیں ان سے قطع نظر جدید نظریاتی سائنس کے جدید ترین رجحانات اور نتائج کی موجودگی میں مذکورہ حقائق کی آخر کیا تعبیر و توجیہہ ہوگی؟

کیا سائنس کی ریاضیاتی صداقتوں کو تاثراتی اور وجدانی صداقتوں پر پوری طرح منطبق کیا جا سکتا ہے؟ کیا خود سائنسی انداز فکر حیات و کائنات کے بارے میں تضادات کا شکار نہیں؟

کیا ان تضادات کے ہوتے ہوئے فنونِ لطیفہ میں آئیڈیل کے حصول و شعور کو فن کار اور ناظر کے ذاتی تاثر پر مبنی قرار دیا جائے؟

اس مضمون میں اس قسم کے ان گنت سوالات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پھر ان سوالات سے کتنے ہی سوالات خود پیدا ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ اور حضرات بھی اس بحث میں شرکت کریں گے۔ — جون ایلیا۔

ایک عرصے تک تو میری شاعری بس بے نام کا کیا، کہ مضمون کا بھی پتہ نہ تھا۔ بعض کیفیات میں کچھ کہنے کو جی چاہتا مگر بات تھوڑی سی نغمہ آفرینی سے آگے نہ بڑھتی۔ پھر میں نے قصداً بھی اس میں کچھ معنی لانے کی کوشش کی مگر آمد دہ ہو کر رہ گئی۔ البتہ جو بے ربط و لاحاصل باتیں خود بخود اور خواہ مخواہ موزوں ہو گئیں ان میں کبھی کوئی دلچسپ نکتہ (لطیفہ) بالفاظ ایک، اوکھا سا مجموعہ صور ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ موزوں کلمات اپنی فطرت کچھ زیادہ بامعنی ہوتے چلے گئے لیکن اس عمل کے ساتھ ایک تشنگی کا احساس بھی رہا کہ جو کچھ کہا وہ بہت ادھورا اور ناکافی ہے یہ تشنگی مشقِ شاعری کے ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ اور اس مجموعے کو پیش کرتے وقت بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

اس تشنگی و نا تمامی کے علاوہ تخلیقی کاوش کے وقت بھی ایک خلش یا تشنگی کا احساس رہا۔ جو کبھی تھوڑی سی آمد کے بعد اور کبھی پوری نظم یا غزل ہو جانے کے بعد رفع ہو گئی۔ مگر ایسی صورت میں یہ طے کرنا محال تھا کہ یہ خلش کسی خاص بات کی آمد کے لئے تھی۔ یا جس شعر کے کہنے سے جی ہلکا ہوا اس میں کوئی خاص بات پائی جاتی تھی۔ جسے کہے بغیر کل نہ پڑے۔ بظاہر تو وہ زندگی کا کوئی بہت ماورا تجربہ یا بہت گہرا نقش نہیں معلوم ہوتا۔ یہ اپنی ذات کے وہ پہلو ہیں جو پہلے نہیں جانے۔

رالف رسل اور مرزا سودا :- علاوہ ادب و انجمن ترقی اردو علیگڑھ کی ایک ماہانہ نشست میں مسٹر رالف رسل نے جو لندن یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں اور علمی، ادبی اور ثقافتی حالات کا جائزہ لینے ہندوستان تشریف لائے ہوئے ہیں۔ مرزا سودا کی طنز نگاری پر انگریزی میں ایک لیکچر دیا۔ موصوف نے فرمایا کہ میں سودا سے بیحد متاثر ہوں۔ لیکن سودا ایسا شاعر ہے جو تنقید نگاروں کی [illegible] سے مایوسی ہوئی۔ تنقید نگاروں نے سودا کی سب سے بڑی خصوصیت طنز نگاری ہے اس طرح [illegible] میں نہیں کیا۔ نقادوں کا خیال ہے کہ اس عہد کی تمام شاعری زوال و انحطاط کا مظہر ہے۔ شاعر اپنے عہد کے خلاف بے اطمینانی کا تو اظہار کرتا ہے لیکن حالات کی خرابی کا کوئی حل پیش نہیں کرتا۔ رسل صاحب نے فرمایا کہ میرے خیال میں سودا کی شاعری توانا جاندار اور رجائی ہے۔ سودا نے خوبی اور خرابی کا جو معیار پیش کیا ہے وہ جدید اعتبارات کی رو سے بھی قابل قدر ہے۔ یہ غلط ہے کہ سودا کا طنز محض ایک ہجو نگار کا طنز ہے۔ سودا کی بیشتر ہجو نظموں میں اپنے عہد کے ناپسندیدہ ناصحت مند اور مذموم رجحانات اور معاشرے کے غلط اعتبارات کے خلاف بڑا تیز و تند طنز ملتا ہے۔ اس عہد کا عام رجحان یہ تھا کہ لوگ طنز و مزاح میں شدت و تیزی کو پسند کرتے تھے۔ موصوف نے فرمایا کہ اس دور میں خود یورپ کا مذاق طنز کے معاملے میں حد درجہ شدت پسندانہ تھا۔ جس کے مقابلے میں سودا کی طنزیات معتدل و متوازن معلوم ہوتی ہیں۔

بحوالہ ہماری زبان علیگڑھ

داس کیپٹل :- ابتک داس کیپٹل کے دیباچوں کا ترجمہ پیش کیا گیا اب اصل کتاب شروع ہو رہا ہے اور اس طرح صحیح معنی میں ہمارا وہ وعدہ تکمیل پذیر ہو رہا ہے جو ابتدا میں کیا گیا تھا۔ جلد ہی اشپنگلر اور [illegible] کو بھی پیش کیا جائے گا۔ ہمیں امید ہے کہ اردو کے دانش پسند حلقے ہماری کوششوں کی ہمت افزائی فرمائیں گے ہماری حقیر مساعی کا شریف ترین مقصد صرف یہ ہے کہ اردو کی تہی دامنی کو دور کیا جا سکے اور اس میں عالمی علوم و ادبیات کا وہ ذخیرہ منتقل ہو جائے جس کے بغیر کوئی زبان بھی ایک علمی زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

کراچی بورڈ کا شرمناک اقدام

کراچی ایجوکیشن بورڈ نے میٹرک کے لئے انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا ہے چنانچہ اب اردو کے پرچے کو چھوڑ کر باقی تمام پرچے انگریزی میں تیار [illegible] جیسا کہ مسئلہ طے ہوا۔ گویا قوم کے لئے سب سے اہم فریضہ یہی تھا جس کی ادائیگی واجب تھی۔ ہم ذہنی اعتبار سے بے حس، بے حیائی اور غلامانہ خیرہ چشمی کی اس حد پر پہونچ چکے ہیں جہاں سے آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ ہمارا ہر عمل ہماری ہر تجویز اور ہر منصوبہ شعور آزادی کے خلاف ایک معاندانہ دراز دستی کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا کوئی غیور پاکستانی کراچی بورڈ کی اس شرمناک حرکت کو برداشت کر سکتا ہے؟

ہم بورڈ کے ارباب کار کو توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے فیصلے کو فوراً تبدیل کریں اور اس ذلیل ترین الزام کو اپنے سر عائد نہ ہونے دیں جسکو کوئی بھی حریت پسند طبقہ قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔

اب ذرا اس قرارداد کی داد دیجئے جو پشاور کی دمنڈکٹ اور ری پبلکن پارٹی کے جلسے میں منظور کی گئی ہے۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ملک پر جنگ بے یقینی اور بے اطمینانی کی کیفیت ختم نہ ہو جائے اس وقت تک عام انتخابات نہیں ہونا چاہئیں۔ اور صدر مملکت کو چاہئے کہ وہ انقلابی کونسل قائم کرکے تمام اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ اس قرارداد کو سنئے اور سر دھنئے

کتنی عجیب بات ہے کہ جو بات اس امر کی دلیل ہے کہ انتخابات جلد سے جلد ہو جانا چاہئیں اسکو انتخابات کے خلاف بطور دلیل پیش کیا جا رہا ہے ایسے عالم میں اگر ہم سر دھنیں نہیں تو اور کیا کریں؟ سوال یہ ہے کہ موجودہ بے یقینی، سیاسی عدم استحکام اور ابتری کا سبب کیا ہے؟ اور جب یہ حالات ختم ہو جائیں گے تو پھر انتخابات کی ضرورت ہی کیا رہ جائے گی؟ یہ کوئی مذہبی فریضہ تو ہے نہیں جو محض حصول ثواب و مغفرت کیلئے ادا کیا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ انتخابات بذات خود کسی اہمیت اور تقدس کے حامل نہیں وہ تو ان مطالبات و مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہیں جو بدقسمتی سے اب تک حاصل نہ ہو سکے۔ اور بجا طور پر یہ توقع ہے کہ انتخابات کے بعد حاصل ہو جائیں گے

ایسی صورت میں یہ کہنا کہ موجودہ بے یقینی کے ہوتے ہوئے انتخابات نہیں ہونا چاہئیں اور انقلابی کونسل قائم ہو جانا چاہیئے، انتہا کی کم بات ہے ہمیں صدر مملکت جناب اسکندر مرزا کی معاملہ فہمی حالات شناسی۔ اور جمہوریت نوازی پر پوری طرح بھروسہ ہے اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس تجویز کو ہرگز پسند نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ وہ خود عرصے سے اس بات کے لئے کوشش کر رہے ہیں کہ عام انتخابات ۱۹۵۸ء میں ضرور ہو جائیں۔

یقیناً انھیں اس امر کا پوری طرح احساس ہے کہ انتخابات کا جلد از جلد عمل میں آ جانا موجودہ حالات میں کس درجہ ناگزیر ہے

یوم شیکسپیئر۔ بین الکلیاتی بزم ادب کراچی کی جانب سے جولائی [illegible] بزم شیکسپیئر منایا جا رہا ہے اس سے قبل بھی بزم ادب کی جانب سے ادبی اور ثقافی اجتماعات منعقد ہوتے رہے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بزم کے احباب زندگی اور مقاصد زندگی کا کما حقہ شعور رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کی سرگرمیاں بیحد قابل قدر ہیں۔ اور ہمیں امید ہے کہ وہ پاکستان کے دانش دوست حلقوں سے پوری پوری داد حاصل کریں گے۔

ہمیں اس موقع پر ایک خاص بات عرض کرنا ہے اس اعتماد کے ساتھ کہ اس پر خلوص کے ساتھ غور کیا جائے گا۔ وہ یہ کہ یوم شیکسپیئر منانا بلاشبہ ایک پسندیدہ اقدام ہے لیکن خود ایشیا کے کتنے ہی اکابر علم و ادب اور بزرگان دانش و فن شیکسپیر کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہماری توجہ اور مرتبہ شناسی کے مستحق ہیں۔ شیکسپیر کا عرس منانے کے لئے یورپ کے وہ وسیع ترین انگریزی علاقے ہی کیا کم ہیں جہاں کا ایک معمولی تعلیم یافتہ فرد بھی اپنے ادیبوں، شاعروں کا پوری طرح قدر شناس اور مرتبہ داں ہے۔ بلکہ انھوں نے تو ہماری بیگانہ گریزی، اور بیگانہ آشنائی کو دیکھ کر اپنے فن کاروں اور مفکروں کی یادگاریں منانا اور قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے خیام اور ہمارے بوعلی سینا و فردوسی کو بھی فراموش نہیں کیا ہے۔

اسی سلسلے میں ہم بین الکلیاتی بزم ادب کے علاوہ بطور خاص اپنے ان اصحاب کو توجہ دلائیں گے جو مشرقی فکر۔ مشرقی ثقافت اور مشرقی علوم و فکر کے امین اور وارث ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ایشیا کے اکابر علم و ادب کی یاد میں جلسے منعقد کرکے اپنی گذشتہ ادبی و تہذیبی تاریخ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں۔ کیا ابوالعلا معری، ابن فارض، رومی، فردوسی، خیام، حافظ، عرفی یا کالیداس، تلسی داس، خسرو اور فیضی اس قابل نہیں ہیں کہ وہ اپنی نئی نسلوں سے خراج عقیدت و اعتراف حاصل کر سکیں؟

اس تحلیل اور تجزیئے کے دور میں تخلیقی عمل پر بھی بہت کچھ مشق جراحی ہوتی ہے اصول فطرت کی دریافت کے شوق میں انسانی ذہن اس جستجو میں بھی
ہ کہ شاید اس بنیادی اصول کا پتہ لگائے جو تخلیق کے حیرت ناک عمل میں کارفرما ہوتا ہے۔ اہل تخلیق بھی اس کوشش میں اہل تحقیق کا ساتھ دے رہے ہیں
ب اور آرٹ کی بعض نئی تحریکات کی محرک یہی جستجو ہے کہ لاشعور کو کس طرح حسب منشا کام پر لگایا جائے۔ گویا کہ فرشتۂ غیبی کو تسخیر کیا جائے۔ میں ان تجربوں
ناموافق نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ان کے نتائج ابھی تک اطمینان بخش نہیں معلوم ہوتے۔ ان میں لاشعور کی جھلک تو ضروری ہوتی ہے۔ لیکن اس کی وہ جستجو کا
ئی نہیں ہوتی جس کا کھوج لگانا مقصود ہے۔ سمندر سے سیپ نکل آتے ہیں۔ مگر نہ گوہر جو یہ سمندر کبھی خود بخود اگل دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہی نہیں سمجھنے

خود ہی ہو جاتا ہے قسمت سے کوئی غم پیدا ⁂ عشق کے ہاتھ میں تدبیر کہاں سے آئی

اس طرح صرف تجربہ کے ذکر سے آرٹ کی تخلیق کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اول تو تجربہ خود ایسی لامحدود سی چیز ہے کہ اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ دوسرے تجربے
کل آرٹ میں کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ تیسرے ان کانشس نفس میں کئی پشتوں کے تجربات کے نقوش ثبت ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تجربات میں ایک
ا نیا اور عجیب عنصر داخل ہو جاتا ہے۔ جو دراصل ساری تخلیقی کیمیا کی جان ہے۔

میں سائنس کی تخلیقی صلاحیت کا منکر نہیں ہوں۔ مگر سائنس کو اعتراف ہے کہ اس نے نفس انسانی کی ابھی صرف سطح کو چھوا ہے۔ میرے عقیدے میں
ں انسانی کا تخلیقی عمل ایک ایسی پراسرار حقیقت ہے جس کا فارمولا ناقابل دریافت ہے۔ جدید سائنس کا مشاہدہ ہے کہ کبھی کبھی مادی مظاہر میں بھی ایسے عمل
ع ہوتے ہیں (یعنی بعض ایٹمی برقپاروں کی جست) جس کی توجیہہ محال ہے۔ اسی جدید مشاہدے نے اس نئے عقیدے کو راہ دی ہے کہ قوانین فطرت دراصل
ے اٹل نہیں جتنے کہ سمجھے جاتے رہے۔ یہ ایک صوفیانہ سا خیال ہے مگر عجیب نہیں کہ آگے چل کر سائنس کو تحقیق کا پرچم روحانیت ہی کے حوالے کرنا پڑے
ہ چند حواس ظاہری سے شاید کل کائنات کا احاطہ ممکن نہ ہو۔ جن کی مقدرت سراسر محدود ہے۔
مستقبل میں روحانیت کی شکل کیا ہوگی؟ یہ کہنا مشکل ہے لیکن غالباً یہ اس روحانیت سے مختلف ہوگی جسے ہم اب تک روحانیت کا نام دیتے
ہے۔

میرے گمان میں اس کی جھلک دنیا کی شاعری میں موجود ہے —— شاعری [illegible] کے بغیر حقائق کو جانچ لیتی ہے اور اس تجربے
لو ایسی تشفی حاصل ہوتی ہے کہ دلیل و مشاہدہ سے بھی حاصل [illegible] —— لہٰذا ابھی شاعری [illegible] مستقبل سے مایوس نہیں۔
اس طرح شاید مذہب اور شاعری میں جزوے [illegible] مستقبل میں [illegible] طرح مذہب کے ساتھ بھی شاعری کا میل
ئی میں بہت گہرا رہا ہے۔ دیرپا نہیں ہو سکتا۔ روایتی مذہب کے لیے اٹل [illegible] اٹل ضابطہ، رسوم اور حق اور باطل کی اٹل
لازمی ہے۔ شاعری کے نزدیک حقیقت کا تصور اس سے مختلف ہے۔ وہ [illegible] مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالتی ہے کہ کبھی کبھی خود اپنے
ے کی تردید کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میں حقیقت کے اسی عجیب [illegible] کو اپنے لیے قابل قبول سمجھتا ہوں —— کل یہم
ے نشان —— آخر وہ کیا قدر مشترک ہے جو اتنے متنوع کلام کو ہمارے [illegible] پر اثر اور پرمعنی بنا دیتی ہے؟ اس کی تعریف محال ہے
س قدر مشترک میں حقیقت اصلی کی ایک خفیف جھلک پوشیدہ ہے۔ شاعری کا کام حقیقت کے اس متحرک، متنوع اور ناقابل تسخیر
ا مسلسل تعاقب کرنا ہے۔ اور اسی کوشش ناتمام میں اس کی لازوال تاثیر کا راز پوشیدہ ہے۔
خالص منطقی لحاظ سے مذکورۂ بالا عبارت تشفی بخش ہو یا نہ ہو لیکن آپ اس بحث میں یہ نہ بھولے ہوں گے کہ میں منطق کا تابعدار نہیں
ے نزدیک تو "بیگن" اچھے بھی ہیں اور برے بھی [illegible] رہا ہوں۔ شاعرانہ حقائق میں ظاہری
لی کے باوجود بڑے گہرے ربط کا پتہ ملتا ہے۔ اس [illegible] زور بیان سے پیدا ہوتی ہے نہ حسن تخیل سے۔
خارجی عنصر سے بلکہ کسی اور ہی بات سے جسے ایک بنیادی صداقت کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لطف یہ ہے کہ اب نظریۂ اضافیت کی رو سے بھی

اب ذرا اس قرارداد کی داد دیجئے جو پشاور کی ڈسٹرکٹ اور سٹی ریپبلکن پارٹی کے جلسے میں منظور کی گئی ہے۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ملک میں جب تک بے یقینی اور بے اطمینانی کی کیفیت ختم نہ ہو جائے اس وقت تک عام انتخابات نہیں ہونا چاہئیں۔ اور صدر مملکت کو چاہئے کہ وہ انقلابی کونسل قائم کر کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اس قرارداد کو سنئے اور سر دھنئے

کتنی عجیب بات ہے کہ جو بات اس امر کی دلیل ہے کہ انتخابات جلد سے جلد ہو جانا چاہئیں اسکو انتخابات کے خلاف بطور دلیل پیش کیا جا رہا ہے ایسے عالم میں اگر ہم سر دھنیں نہیں تو اور کیا کریں؟ سوال یہ ہے کہ موجودہ بے یقینی، سیاسی عدم استحکام اور ابتری کا سبب کیا ہے؟ اور جب یہ حالات ختم ہو جائیں گے تو پھر انتخابات کی ضرورت ہی کیا رہ جائے گی؟ یہ کوئی مذہبی فریضہ تو ہے نہیں جو محض حصول ثواب و مغفرت کیلئے ادا کیا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ انتخابات بذات خود کسی اہمیت اور تقدس کے حامل نہیں وہ تو ان مطالبات و مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہیں جو بدنصیبی سے ابتک حاصل نہ ہو سکے۔ اور بجا طور پر یہ توقع ہے کہ انتخابات کے بعد حاصل ہو جائیں گے

ایسی صورت میں یہ کہنا کہ موجودہ بے یقینی کے ہوتے ہوئے انتخابات نہیں ہونا چاہئیں اور انقلابی کونسل قائم ہو جانا چاہئے الٹی عقل کی بات ہے۔ ہمیں صدر مملکت جناب اسکندر مرزا کی معاملہ فہمی حالات شناسی۔ اور جمہوریت نوازی پر پوری طرح بھروسہ ہے اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس تجویز کو ہرگز پسند نہیں کرینگے۔ اس لئے کہ وہ خود عرصے سے اس بات کے لئے کوشش کر رہے ہیں کہ عام انتخابات ۱۹۵۸ء میں ضرور ہو جائیں۔
یقیناً انھیں اس امر کا پوری طرح احساس ہے کہ انتخابات کا جلد از جلد عمل میں لایا جانا موجودہ حالات میں کس درجہ ناگزیر ہے

یوم شیکسپیئر ۔ بین الکلیاتی بزم ادب کراچی کی جانب سے جولائی یوم شکسپیئر منایا جا رہا ہے اس سے قبل بھی بزم ادب کی جانب سے ادبی اور ثقافتی اجتماعات منعقد ہوتے رہے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بزم کے احباب زندگی اور مقصد زندگی کا کتنا صحت مند شعور رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کی سرگرمیاں بیحد قابل قدر ہیں۔ اور ہمیں امید ہے کہ وہ پاکستان کے دانش دوست حلقوں سے پوری پوری داد حاصل کریں گے۔

ہمیں اس موقع پر ایک خاص بات عرض کرنا ہے اس اعتماد کے ساتھ کہ اس پر خلوص کے ساتھ غور کیا جائے گا۔ وہ یہ کہ یوم شیکسپیئر منانا بلاشبہ ایک پسندیدہ اقدام ہے لیکن خود ایشیا کے کتنے ہی اکابر علم و ادب اور بزرگان دانش و فن شیکسپیئر کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہماری توجہ اور مرتبہ شناسی کے مستحق ہیں۔ شیکسپیئر کا عرس منانے کے لئے یورپ کے وہ وسیع ترین انگریزی علاقے ہی کیا کم ہیں جہاں کا ایک معمولی تعلیم یافتہ فرد بھی اپنے ادیبوں، شاعروں کا پوری طرح قدر شناس اور مرتبہ داں ہے بلکہ انھوں نے تو ہماری بیگانہ گریزی اور بیگانہ آشنائی کو دیکھ کر اپنے فن کاروں اور مفکروں کی یادگاریں منانے اور قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے خیام اور ہمارے بوعلی سینا و فردوسی کو بھی فراموش نہیں کیا ہے۔

اس سلسلے میں ہم بین الکلیاتی بزم ادب کے علاوہ بطور خاص اپنے ان اصحاب کو توجہ دلائیں گے جو مشرقی فکر، مشرقی ثقافت اور مشرقی علم و فکر کے امین اور وارث ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ایشیا کے اکابر علم و ادب کی یاد میں جلسے منعقد کر کے اپنی گذشتہ ادبی و تہذیبی تاریخ کا حریت پسندانہ جائزہ لیں۔ کیا ابوالعلا معری، ابن فارض، رومی، فردوسی، خیام، حافظ، عرفی یا کالیداس، تلسی داس، خسرو اور فیضی اس قابل نہیں ہیں کہ وہ اپنی نئی نسلوں سے خراج عقیدت و اعتراف حاصل کر سکیں؟ •

اس تحلیل اور تجزیئے کے دور میں تخلیقی عمل پر بھی بہت کچھ مشق جراحی ہوتی ہے اصول فطرت کی دریافت کے شوق میں انسانی ذہن اس جستجو میں بھی
ہے کہ شاید اس بنیادی اصول کا پتہ لگائے جو تخلیق کے حیرت ناک عمل میں کارفرما ہوتا ہے۔ اہل تحلیل بھی اس کوشش میں اہل تحقیق کا ساتھ دے رہے ہیں
ب اور آرٹ کی بعض نئی تحریکات کی محرک یہی جستجو ہے کہ لاشعور کو کس طرح حسب منشا کام پر لگایا جائے۔ گویا کہ فرشتہ غیبی کو تسخیر کیا جائے۔ میں ان تجربات
، ناموافق نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ان کے نتائج ابھی تک اطمینان بخش نہیں معلوم ہوتے۔ ان میں لاشعور کی جھلک تو ضروری ہوتی ہے۔ لیکن اس کی وہ حیرت ناک
اتی نہیں ہوتی جس کا کھوج لگانا مقصود ہے۔ سمندر سے سیپ نکال لاتے ہیں۔ مگر نہ گوہر جو یہ سمندر کبھی خود بخود اگل دیتا ہے۔ اسس کا نتیجہ یہی نہیں پہنچتے

خود ہی ہو جاتا ہے قسمت سے کوئی غم پیدا ✤ عشق کے ہاتھ میں تدبیر کہاں سے آئی

اس طرح صرف تجربہ کے ذکر سے آرٹ کی تحلیل کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اول تو تجربہ خود ایسی لامحدود سی چیز ہے کہ اس کا احاطہ پانا مشکل ہے۔ دوسرے تجربے
نکل آرٹ میں کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ تیسرے ان کا نشس نفس میں کئی پشتوں کے تجربات کے نقوش ثبت ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تجربات میں ایک
بالکل نیا اور عجیب عنصر داخل ہو جاتا ہے۔ جو در اصل ساری تخلیقی کیمیا کی جان ہے۔

میں سائنس کی تخلیقی صلاحیت کا منکر نہیں ہوں۔ مگر سائنس کو اعتراف ہے کہ اس نے نفس انسانی کی ابھی صرف سطح کو چھوا ہے۔ میرے عقیدے میں
ں انسانی کا تخلیقی عمل ایک ایسی پراسرار حقیقت ہے جس کا فارمولا نا قابل دریافت ہے۔ جدید سائنس کا مشاہدہ ہے کہ کبھی کبھی مادی مظاہر میں بھی ایسے عمل
قع ہوتے ہیں (یعنی بعض ایٹمی برقپاروں کی جست) جن کی توجیہہ محال ہے۔ اسی جدید مشاہدے نے اس نئے عقیدے کو راہ دی ہے کہ قوانین فطرت در اصل
نے اٹل نہیں جتنے کہ سمجھے جاتے رہے۔ یہ ایک صوفیانہ سا خیال ہے مگر عجیب نہیں کہ آگے چل کر سائنس کو تحقیق کا پرچم روحانیت ہی کے حوالے کرنا پڑے
، جہاز حواس ظاہری سے شاید کل کائنات کا احاطہ ممکن نہ ہو۔ جن کی مقدرت سراسر محدود ہے۔

مستقبل میں روحانیت کی شکل کیا ہوگی؟ یہ کہنا مشکل ہے لیکن غالباً یہ اس روحانیت سے مختلف ہوگی جسے ہم اب تک روحانیت کا نام دیتے
ہے۔

میرے گمان میں اس کی جھلک دنیا کی شاعری میں موجود ہے ——— شاعری [illegible] کے بغیر حقائق کو جانچ لیتی ہے اور اس تجربے
ہم کو ایسی تشفی حاصل ہوتی ہے کہ دلیل و مشاہدہ سے بھی حاصل [illegible] ——— [illegible] شاعری [illegible] مشکل سے مایوس نہیں۔

اس طرح شاید مذہب اور شاعری میں جز وتے [illegible] کی طرح مذہب کے ساتھ بھی شاعری کا میل
یہ ماضی میں بہت گہرا رہا ہے۔ دیرپا نہیں ہو سکتا۔ روایتی مذہب کے لئے [illegible] ضابطہ، رسوم اور حق اور باطل کی اٹل
ریق لازمی ہے۔ شاعری کے نزدیک حقیقت کا تصور اس سے مختلف ہے۔ وہ [illegible] مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالتی ہے کہ کبھی کبھی خود اپنے
ناہدے کی تردید کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میں حقیقت کے اسی عجیب [illegible] کو اپنے لئے قابل قبول سمجھتا ہوں ——— کل یوم
رفی شان ——— آخر وہ کیا قدر مشترک ہے جو اتنے متنوع کلام کو ہمارے [illegible] یکساں پر اثر اور پر معنی بنا دیتی ہے؟ اس کی تعریف محال ہے
ن اس قدر مشترک میں حقیقت اصلی کی ایک خفیف جھلک پوشیدہ ہے۔ شاعری کا کام حقیقت کے اس متحرک، متنوع اور ناقابل تسخیر
[illegible] کا مسلسل تعاقب کرنا ہے۔ اور اسی کوشش ناتمام میں اس کی لازوال تاثیر کا راز پوشیدہ ہے۔

خالص منطقی لحاظ سے مذکورۂ بالا عبارت تشفی بخش ہو یا نہ ہو لیکن آپ اس بحث میں یہ نہ بھولے ہوں گے کہ میں منطق کا تابعدار نہیں۔
ہے نزدیک تو "بیگن" اچھے بھی ہیں اور برے بھی [illegible] رہا ہوں۔ شاعرانہ حقائق میں ظاہری
ربطی کے باوجود بڑے گہرے ربط کا پتہ ملتا ہے۔ [illegible] ندرِ بیان سے پیدا ہوتی ہے نہ حسن تعلیل سے۔
ن خارجی عنصر سے بلکہ کسی اور ہی بات سے جسے ایک بنیادی صداقت کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لطف یہ ہے کہ اب نظریۂ اضافیت کی رو سے بھی

ئنات کو بیک وقت محدود اور لامحدود تصور کیا جاتا ہے۔ یعنی بعض مشاہدات ان دونوں قیاسات کو لازم کر دیتے ہیں۔ یہ وہ انکشافات ہیں جن پر اہل فلسفہ نے اپنا سر پیٹ لیا ہے۔ اور منطق کی اساس ہی متزلزل ہو گئی ہے۔

خرد بھی ہو گئی آخر جنوں کی ہمنوا شاید
دبستانوں سے آتی ہے سلاسل کی صدا کیسی۔

آخر یہ عرفا سوز و دیدہ ور خشکار شاعری جس کی میں نے اتنی ہوا باندھی کہاں پائی جاتی ہے جو بیک وقت مجازی سے بھی ہوتی ہے اور ماورائی بھی؟ یوں تو یہ تعریف بے شک مثالی و تصوراتی ہے۔ لیکن یہ تصور بے بنیاد نہیں۔ اتنا ہے کہ خدا جانے میں کس طرف اشارہ کروں اور آپ نے اسے ہاں کہاں دیکھ رکھا ہو لہٰذا اس بارے میں آپ کا اپنا تاثر ہی زیادہ معتبر ہوگا۔

اقبال اکیڈمی کے ایک جلسہ میں ایک فاضل بزرگ نے اقبال کے اس قول کو ناقابل فہم بتایا تھا کہ اسلامی ادب اور آرٹ ابھی پیدا نہیں ہوتے۔ مجھے یہاں اسلامی ادب اور آرٹ کے مفہوم سے بحث نہیں البتہ علامہ اقبال کی مراد بلاشبہ مثالی ادب اور آرٹ سے تھی یعنی جو ان کے نزدیک ادب اور آرٹ کا آئیڈیل تھا۔ اور اس حد تک میرا احساس بھی کچھ ایسا ہی ہے (دراصل یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ ایسی ہی ایک بات مارکس نے بھی کہی تھی کہ اشتراکیت کے قائم ہونے پر ما قبل تاریخ کا دور ختم اور اصل تاریخ کا آغاز ہوگا۔) فنی کاریگری سے قطع نظر اعلیٰ وجدانی شاعری اپنے مختلف روپ میں ایک آئیڈیل تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے جس کا واضح تصور محال ہے۔ اس لحاظ سے مجھے اچھی شاعری کا ہر وہ روپ عزیز ہے جس میں حیرت کا وہ عنصر موجود ہو جو اس کے وجدانی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو میں لفظی کاریگری کا بھی منکر نہیں۔

ہے یوں کہ مجھے دعوتِ جام بہت ہے

رئیس امروہوی

مشرق ــــ جو مر رہا ہے

جب ہم مغربی تہذیب کو نکتہ چینی اور تعریض کا ہدف بناتے ہیں تو ہمارا ہدفِ انتقاد وہ مغرب نہیں ہوتا جس نے جدید صنعتی عہد کو جنم دیا ہے جس نے فلسفے میں سائنسی تجربیت اور سائنس میں فلسفیانہ معروضیت کی بنیاد ڈالی جس نے توانائے فطرت کو مسخر کرکے انسان کے ذہن و دماغ کی نادر صلاحیتوں کو منکشف کیا ہے۔ جس نے نئے علوم نئے فنون اور نئے معارف ایجاد کئے ہیں۔ اور جس نے بلاشبہ پانچ ہزار سال کی معلوم تاریخ میں پہلی مرتبہ انسان کو ہر شعبے میں حیوان سے ممتاز۔ سربلند اور اشرف المخلوق ثابت کر دکھایا ہے ــــ یہ مغرب ہر قسم کی تعریف و تحسین سے ماوراء ہے ــــ لیکن جہاں مغربی قوموں اور ملکوں نے انسانی علوم و فنون میں ایسے حیرت انگیز اضافے کئے ہیں۔ وہاں مغربی تہذیب کا ایک رُخ اور بھی ہے اور آج کی صحبت میں افرنگ کے اسی رُخ کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔

مغرب کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز لوتھر کی تحریک احتجاج (پروٹسٹنٹ) سے ہوا ہو یا اسپین سسلی اور سلرنو کی ان علمی اور تہذیبی تحریکوں کے اثرات سے۔ جن کی رہنمائی مسلمان مفکرین و علماء اور مسلمان علماء کے تربیت کردہ یہودی احبار و اطباء کر رہے تھے ــــ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ یورپ خصوصیت کے ساتھ مغربی جنوبی یورپ کے احیائے جدید کا پہلا نتیجہ جاگیرداری نظام کی تنسیخ اور پاپائیت کے زوال کی شکل میں نمودار ہوا اور یورپ کے نقشے پر طاقتور قومی حکومتیں ابھریں۔ اسی زمانے میں سمندر کے راستے یورپی قسمت آزماؤں کے لئے کھل گئے۔ چھاپے کی ایجاد نے اشاعت علوم کی رفتار کو اور تیز کر دیا۔ اور اس طرح یورپ میں رفتہ رفتہ وہ ذہنی طبقہ وسطیٰ (مڈل کلاس) نمودار ہوا جس نے یورپ میں صنعت کی بنیاد ڈالی۔

اس موقع پر یورپ کی صنعتی تہذیب کی نشو و نما کے مختلف مراحل پر بحث مقصود نہیں۔ کہ یہ موضوع خود ایک مستقل بحث و نظر کا مقتضی اور مستحق ہے۔ گفتگو اس صنعتی تہذیب سے ہے جو آج ترقی پاکر ہولناک عجیب مصنوع یا بے روح صنعت گری بن کر رہ گئی ہے۔ مسلسل مادی کامرانیوں نے مغربی اقوام کے نقطۂ نظر کو اس درجہ مادی بنادیا ہے کہ زندگی سے وہ رومان غائب ہوگیا ہے جو انسانی زندگی کے گہرے مصائب کے غلیظ بادلوں کے کناروں پر قوس قزح بنکر جھلملاتا تھا اور اس طرح عملی زندگی کی تلخیوں اور نامرادیوں کو سہل و خوشگوار بنانے میں مدد دیتا تھا۔ آج کرۂ ارض کے دو برِاعظم ــــ یورپ اور امریکہ ــــ سخت ذہنی کشمکش اور روحانی ابتلاء کے دورے گزر رہے ہیں۔ اور یہ اس وقت جبکہ انہوں نے کرۂ ارض کے بالائی طبقے کو فتح کرکے ــــ کائنات کی انجان ــــ پُراسرار اور لامحدود پہنائیوں میں قدم رکھ دیا ہے۔ اس عظیم اور بے مثال فتح کے باوجود بھی ــــ جو انسانی ترقی کے ناقابل فہم اور ناقابل تصور امکانات سے لبریز ہے۔ یورپ بدستور روح کے کرب کا شکوہ طراز اور بے یقینی و اوہام کی ظلمات کا آوارہ گرد ہے۔

مشرق اور مغرب آج بھی دو انتہاؤں پر کھڑے ہیں۔ مشرق اندھی روحانیت ــــ بے عمل قسمت پرستی اور زود عقیدہ جہلیت کا اس ستم

اور مغرب بے سوز مادیت ـ بے مقصد عملیت اور غیر واضح علیت کے اس سرے پر ـــ ان دونوں کے درمیان فکر و عمل کی اتنی وسیع خلیجیں حائل ہیں کہ انھیں نہ ہم عبور کر سکتے ہیں نہ وہ ـــ مشرق کا اک طبقہ اپنی روحانیت سے بیزار ہے اور مغرب کا اک طبقہ اپنی مادیت سے ـــ لیکن یہ دونوں انتہا پسندی کے مریض ہیں ـ یورپ کے ذہنی اور روحانی اختلال کا سبب یہ ہے کہ اس نے کسی "قدر" کی تقدیس برقرار ہی نہیں رکھی اور مشرق کی پسماندگی اور رجعت پسندی کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی روایت کو توڑنے کی جرأت ہی نہیں رکھتا ـ

مادی آسائشوں کی فراوانی اور ظاہری تہذیب کی تمام جلوہ سامانی کے باوجود مغرب کی تہذیب [illegible] معاشرتی اعتبار سے تیزی کے ساتھ زوال و انحطاط کے راستے پر دوڑ رہی ہے ـ کیوں؟ انہوں نے اپنی "حیات چند روزہ" کے جو مقاصد طے کئے ہیں وہ بڑے ہی سطحی اور زوال آمادہ ہیں ـــ مثلاً بے قید نفس پرستی ـــ جنسی لاقانونی ـــ حد سے بڑھی ہوئی معاش طلبی ـــ اور بھونڈی انفرادی آزادی ـــ یورپ کے کروڑوں انسانوں کا مطمح نظر صرف ایک ہی ہے ـ یعنی زندگی کو مشین کے انداز سے بسر کرو ـ زیادہ سے زیادہ روپیہ کماکر زیادہ سے زیادہ لطف اٹھاؤ ـــ لطف کیا؟ روحانی بالیدگی اور ذہنی سکون کا لطف نہیں ـ جسم کو زیادہ سے زیادہ آرام پہونچانے اور لذت پرستی کو اس کی مکروہ ترین شکلوں تک پہونچا دینے کا لطف ـ مجنونانہ رقص کا لطف ـ فحش کتابوں ـ جرائم کی خبروں ـ جاسوسی کہانیوں ـ عریاں تصویروں ـ اور بے حجابی کے مظاہروں کا لطف ـــ مگر کیا یہ لطف ہے؟ اگر یہ لطف ہے تو یورپ کا دانشور طبقہ اس لطف سے بیزار ہو چکا ہے ـ خطرہ یہ ہے کہ اس کی یہ بیزاری اسے کہیں ہماری طرح مجہول نہ بنا دے ـ ہماری طرح کہ ہم لذات دنیا کو انسانی روحانیت کے لئے زہر قاتل سمجھتے ہیں ـ آہ ہم اور آہ یورپ!

پاکستان میں ہمیں امریکی طرز زندگی اختیار کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے ـ اگر امریکی طرز زندگی بین البراعظمی راکٹوں کی ایجاد ـ ایٹمی قوتوں کے انضمام اور جوہری طبیعات کے اعلیٰ ترین قوانین کے انکشاف کا نام ہے ـ تو ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم امریکی طرز زندگی اور مغربی شیوۂ حیات کے دلدادہ ہیں ـــ لیکن اگر ہمیں امریکی طرز زندگی (WAY OF LIFE) کے نتیجے میں صرف شراب ، صرف عورت ، صرف حسن پرستی ، صرف بے حجابی ، صرف عریاں رقص ، صرف لحم خنزیر ، صرف جنس پرستی ، یعنی صرف ہالی ووڈ اور صرف مانٹی کارلو ملیں ـ جہاں شراب ، عورت اور جوئے کے علاوہ کچھ نہیں ـ تو ہم ایسے امریکی و مغربی طرز حیات کو اپنانے سے معذور ہیں ـ

خیر یورپ اور امریکہ کو اس کی بے قیدیت یا بقول شخصے اس کی زندیقیت کے لئے معاف کیا جا سکتا ہے ـ کیونکہ یہ وہی یورپ ہے جس نے بھاپ کی قوت دریافت کی ـ جس نے چھاپے کے فن کو عام کیا ـ جس نے حرارت کے قوانین کا انکشاف کیا ـ جس نے بجلی کے عمل پر قابو پایا ـ جس نے زمان کی عظمت محسوس کی ـ جس نے ذرے کا جگر چاک کیا ـ جس نے ایٹم کی طاقت کو مسخر کیا ـ جس نے برقی مقناطیسی لہروں کو مغلوب کر کے وہ عظیم الشان کارنامے انجام دئے کہ ارسطو کی مشائیت اور افلاطون کی اشراقیت بھی اس کے سامنے ماند ہو کر رہ گئی ـ ہم اس یورپ کو قبول کرتے ہیں ـ مع اس کے تمام گناہوں ـ مع اس کی تمام ایکٹرسوں ـ مع اس کے تمام فسق و فجور کے ـــ یہ مغرب عظیم بھی ہے اور یہ مغرب لائق فخر بھی ـــ

لیکن ہم مشرقیوں کو کس بات پر ناز ہے ـــ اس بات پر کہ ہم نے یورپ کی تقلید میں اپنے قومی رسم الخط کو چھوڑ کر لاطینی رسم الخط قبول کر لیا ـــ اس بات پر کہ ہم نے اپنا لباس ترک کر کے ہیٹ ـ کوٹ اور پتلون اختیار کر لیا ـ اس بات پر کہ ہم اپنی موزوں غذاؤں کے بدلے سوپ ـ مٹن ـ چاپ ـ چکن کری ـ پڈنگ اور آئس کریم کھانے لگے ـ ہم نے کھانے میں انگلیوں کا فرض چھری کانٹے کے سپرد کر دیا ـ ہم صبح کو دودھ کے بجائے چائے اور شام کو فالودہ کے بدلے کافی پینے لگے ـ یا اس بات پر فخر ہے کہ ہماری عورتیں "میمیں" ـ ہمارے مرد "صاحب بہادر" ـ ہمارے بچے "بابا لوگ" اور ہمارے والد بزرگوار صرف "ڈیڈی" ہو کر رہ گئے ہیں ـ شاید متاع فخر صرف اسی حد تک ہے ـ یا پھر یہ ہو کہ ہماری عورتیں "ماڈرن ایٹی کیٹ" یعنی اختلاط سے واقف ہو گئی ہیں ـ ہم نے اپنے گھروں میں رقص کو انٹروڈیوس (متعارف) کرا دیا ہے ـ ہماری بچیاں تھرکنے لگی ہیں ـ ہم انگریزی زبان ـ مع اغلاط کے پورے التزام کے ساتھ بولنے لگے ہیں ـــ اگر یہ نہیں تو ہمارا سرمایہ فخر اور کیا رہ گیا ہے؟ ـــ ہم (ماڈرن) بننا چاہتے ہیں ـ لیکن اسپ

مترجم
سید محمد تقی

داس کیپٹال

جلد اول

سرمایہ داری طرز پیداوار

حصہ اول

اجناس ـ اور ـ زر

باب ـــ اوّل

اجناس

فصل اول :- جنس کے دو عناصر ـــــ استعمالی قیمت اور قیمت (قیمت کا جوہر اور مقدار)

جہاں معاشرہ میں سرمایہ داری طرز پیداوار رائج ہے ان کی دولت سے مراد ـــــ اجناس کا بہت بڑے پیمانہ پر جمع ہو جانا ـــ ہے ۔ ظاہر ہے اس مجموعہ کی اکائی ـــ جنس ـــ ہے اس لیے سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کا تنقیدی مطالعہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے ـــ جنس ـــ کا تجزیہ کیا جائے ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ واضح ہے کہ "جنس" اس چیز کا نام ہے جو ہم میں سے ہر ایک سے باہر پائی جاتی ہے ۔ دراصل "جنس" نام ہے اس چیز کا جو انسان کی کسی نہ کسی حاجت کو پورا کرتی ہے ۔ اور یہ امر کہ یہ حاجتیں کس قسم کی ہیں ۔ یہ وہ حاجتیں ہیں جو انسانی شکم سے تعلق رکھتی ہیں ۔ یا وہ جو وہم و خیال سے ہو یہ فرق موجودہ بحث پر کوئی اثر نہیں ڈالتا[1] ۔ نہ یہاں اس امر سے بھی کوئی بحث ہے کہ کوئی چیز کس طرح حاجتوں کو پورا کرتی ہے ۔ آیا براہ راست ذریعہ معاش بنکر یا بالواسطہ ذریعہ پیداوار بنکر۔

کار آمد چیز جیسے لوہا اور کاغذ وغیرہ پر دو حیثیتوں سے غور کیا جا سکتا ہے ۔ ایک کیفی ۔ دوسرے کمی ـــ ایک کار آمد چیز مجموعہ ہوتی ہے ۔ بہت سی خصوصیات کا اور اس لئے وہ کئی پہلوؤں سے قابل استعمال ہوتی ہے ۔ چیزوں کے طریقہ ہائے استعمال کے انکشاف کا کام تاریخ[2] سرانجام دیتی ہے ۔ اس طرح ان کا

---

[1] خواہش حاجت کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے ۔ خواہش دماغی بھوک کا نام ہے اور یہ بھی اس قدر فطری چیز ہے ۔ جیسے بھوک پیٹ کا فطری تقاضہ ہے ...... بہت سی چیزوں کی قیمت اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ وہ دماغی حاجتوں کو پورا کرتی ہیں" نکولس باربن" ـــ مسٹر لاک کے مباحث کے جواب میں ـــ ایک مذاکرہ ـــ نئی اصطلاحات سے متعلق ـــ وغیرہ لندن ـــ ۱۸۹۶ء صفحہ ۲-۳ ۔

[2] "چیزیں ایک ذاتی خوبی رکھتی ہیں ـــ" (ذاتی خوبی کی اصطلاح باربن کی خاص اصطلاح ہے جسے وہ ـــ قیمت استعمال ـــ کے بجائے استعمال کرتا ہے)۔ یہ ذاتی خوبی وہ خصوصیت ہے جو ایک چیز ہر حال میں برقرار رکھتی ہے جیسے مقناطیس ہمیشہ لوہے کو جذب کرتا ہے ۔ (مذکورہ کتاب کا پہلا باب صفحہ ۶) ۔ لوہے کو کشش کرنے کی یہ خصوصیت جو مقناطیس میں پائی جاتی ہے ۔ وہ اس وقت قابل استعمال ہو سکی جب اس خصوصیت کے مقناطیس میں ہونے کی وجہ سے اس کی قطبی ثنائی خصوصیت کا پہلے انکشاف ہو چکا تھا ۔

چیزوں کی مقداروں کے ناپنے کے رواجی طور پر طے شدہ پیمانوں کا تعین بھی تاریخ ہی کر سکتی ہے ـــــ ان پیمانوں کا مختلف حصوں میں انقسام کچھ تو اس لئے ہوا کہ
مختلف چیزوں کے اوزان مختلف تھے اور کچھ اس لئے کہ مختلف معاشروں کے لباس مختلف تھے ـــــ کسی چیز کی افادیت اسے ـــــ استعمالی قیمت[1] بنا دیتی ہے
لیکن اس کی افادیت کوئی خیالی چیز نہیں ہے۔ افادیت بہرحال ـــ چیز کی ـــ طبعی خصوصیات سے پیدا ہوتی ہے اور اس لئے افادیت "جنس" سے جداگانہ
کوئی وجود نہیں رکھتی ـــ اور صورت یہ ہے تو ایک جنس "جیسا لوہا ـــ اناج یا ہیرا۔ اس حیثیت سے کہ وہ ایک مادی چیز ہے ـــ استعمالی قیمت
ہے۔ یعنی ایک کارآمد چیز ہوتی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ کسی چیز کی یہ خصوصیت کہ وہ ـــــ استعمالی قیمت ـــــ ہے اس محنت کی محتاج نہیں ہوا کرتی جو
اس چیز کی خصوصیات سے فائدہ اٹھانے کے لئے صرف کی جاتی ہے۔ "استعمالی قیمت" پر ہم جب بھی بحث کرتے ہیں تو یہ فرض کئے رہتے ہیں کہ بحث متعین مقادیر
سے ہو رہی ہے۔ مثلاً "ماچسوں کے درجن۔ کپڑے کے گز اور لوہے کے بہت سے ٹن۔ اجناس کی استعمالی قیمتوں کی بحث ایک خاص مباحثہ یعنی اجناس
کی تجارتی معلومات کی بحث کا بھی بڑا اچھا مواد[2] مہیا کرتی ہے۔

تمام "استعمالی قیمتیں" اجناس کے استعمال یا ان سے پیدا ہوتی ہیں ویسے نہیں۔ اور یہ "استعمالی قیمتیں" ہر قسم کی دولت کا جوہر بھی ہوتی ہیں خواہ اس دولت
کی سماجی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ البتہ سماج کی اس شکل میں جس پر ہم بحث کرنے والے ہیں "استعمالی قیمتیں" مذکورہ خصوصیت کے علاوہ ایک یہ خصوصیت بھی
رکھتی ہیں کہ وہ "مبادلاتی قیمت" کی مادی زمین بھی بنتی ہیں۔

رہا مبادلاتی قیمت کا معاملہ سو جہاں تک اس کا تعلق ہے پہلی نظر میں وہ کمی رشتہ ظاہر کرتی ہے ـــ کمی رشتہ ـــ سے مطلب یہ ہے کہ وہ اس نسبت
کو ظاہر کرتی ہے۔ جس نسبت سے ایک قسم کی اشیاء کا دوسری قسم کی اشیاء سے تبادلہ کیا جاتا ہے یہ رشتہ وقت اور جگہ کے بدلنے کے ساتھ برابر بدلتا رہتا ہے۔
یہ وجہ ہے کہ ـــ مبادلاتی قیمت ـــ بعض اوقات بالکل اتفاقی ـــ محض اضافی ـــ معلوم ہوتی ہے۔ اور اس لئے ذاتی قیمت[3] ـــ یعنی وہ ـــ
مبادلاتی قیمت ـــ جو غیر منفک طور پر اور قطعی فطری انداز میں اجناس سے وابستہ ہوتی ہے۔ ایک متضاد سی بات معلوم ہوتی ہے۔
کوئی ایک ـــ جنس ـــ مثلاً ایک من گیہوں لے لیجئے۔ اس ایک من گیہوں سے یا تو ـــ الف ـــ مقدار میں جوتوں کا پالش یا ب ـ مقدار میں
ریشم یا ج ۔ مقدار میں سونا وغیرہ خریدا جا سکتا ہے۔ گویا مختصراً اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ ایک من گیہوں مختلف نسبتوں میں دوسری اجناس سے بدلا جا سکتا ہے
جس کا صاف نتیجہ نکلا کہ گیہوں کی مبادلاتی قیمت ایک نہیں ہے بلکہ بہت سی ہیں۔ اب جوتوں کا پالش بقدر الف ـ ریشم بقدر ب ـ اور سونا بقدر ج ـ
وغیرہ میں سے ہر ایک ایک من گیہوں کی مبادلاتی قیمت بتاتا ہے۔ گویا ان تینوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کی جگہ رکھا جا سکتا ہے یا اسے یوں کہئے کہ
ہر ایک دوسرے کے برابر ہے اور جب صورت یہ ہے تو اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی جنس کی صحیح مبادلاتی قیمت ایک ایسی چیز کی موجودگی کو ظاہر کرے گی جو
یکساں رہتی ہے بدلتی نہیں۔ اور دوسرا نتیجہ یہ کہ عام طور پر "مبادلاتی قیمت" نام ہوگا۔ ایک اس چیز کے طریقہ انحصار یا مظہراتی شکل کا جو جنس میں
پائی جاتی ہے گو اس سے ممتاز بھی ہے۔ اس مطلب کی وضاحت کے لئے دو جنسوں اناج یا لوہے کو لیجئے۔ یہ دونوں جن نسبتوں سے ایک دوسرے
سے بدلی جا سکتی ہیں۔ خواہ وہ نسبتیں کچھ بھی کیوں نہ ہوں انھیں ایک ایسی ـــ مساوات ـــ کے ذریعہ ظاہر کیا جا سکتا ہے جس میں اناج کی ایک مقدار
مقدار لوہے کی کسی مقررہ مقدار کے مساوی ہو۔ مثلاً ایک من اناج ـــ ایک ٹن لوہے کے ـــ اس مساوات سے ہمیں کس بات کا علم ہوتا ہے ؟
یہ مساوات ہمیں بتاتی ہے کہ دو مختلف چیزوں ـــ یعنی ایک من اناج اور ایک ٹن لوہے ـــ میں کوئی چیز مساوی مقدار میں ایسی پائی جاتی ہے

---

[1] کسی چیز کی قیمت عبارت ہے اس کی صلاحیت سے کہ وہ انسانی حاجتوں کو پورا کر سکتی ہے۔ یا حیات انسانی میں آسانیاں پیدا کرتی ہے (جان لاک سنہ ۱۶۹۱ء میں
کے گرنے کے نتائج پر چند بحثیں ـ ورکس ایڈیشن ـ لندن ۱۷۷۷ء جلد دوم صفحہ ۲۸)

[2] بورژوا معاشرہ میں یہ عجیب غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ہر شخص بہ حیثیت گاہک کے اجناس سے متعلق ہمہ گیر معلومات رکھتا ہے۔

[3] کوئی چیز ذاتی قیمت نہیں رکھتی (این باربن باب اول صفحہ ۶) یا جیسے بلک کہتا ہے کہ کسی چیز کی ذاتی قیمت اس قدر ہے جتنی وہ خرید سکتی ہے۔

جو دونوں میں جزو مشترک ہو۔ اور جب یہ ہے تو پھر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں کسی ایک تیسری چیز کے مساوی ہوں۔ کسی ایسی تیسری چیز کے جو ان دونوں میں سے کوئی نہ ہو۔ اس طرح ان دونوں میں سے ہر ایک اس حیثیت سے کہ وہ مبادلاتی قیمت ہے — اس تیسری چیز میں تحلیل پذیر ہو سکتا ہے۔

ایک آسان سی ہندسیاتی مثال اس مطلب کو واضح کر دے گی۔ ہم مستطیل اشکال کے رقبوں کا موازنہ کرنے اور ناپنے کے لئے جو کچھ کرتے ہیں وہ یہی کچھ تو ہوتا ہے کہ اشکال کو مثلثوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ مگر خود مثلث کا رقبہ ایک ایسی چیز سے ظاہر کیا جاتا ہے جو اس مثلث کی ظاہری شکل سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔ یہ چیز جو مثلث کا رقبہ ظاہر کرتی ہے اس مقدار کا نصف حصہ ہوتا ہے جو مثلث کے قاعدہ کو اس کے خط عمودی میں ضرب دینے سے حاصل ہوتی ہے[1]۔ اس طرح اجناس کی — مبادلاتی قیمتوں — کا بھی ایسا ہونا بالکل ضروری ہے۔ کہ انھیں ایک ایسی چیز کی نسبت سے ظاہر کیا جا سکے جو تمام اجناس میں مشترک ہو اور ایک ہو۔ اور جس کی کم یا زیادہ مقدار کی نمائندگی اجناس کی یہ — مبادلاتی قیمتیں کریں۔

لیکن یہ مشترک چیز جو تمام اجناس میں پائی جاتی ہے۔ ان اجناس کی ہندسیاتی کیمیائی یا کوئی طبعی خصوصیت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اجناس کی اس نوع کی خصوصیت تو صرف اسی وقت ہماری توجہات اپنی طرف منعطف کراتی ہیں۔ جب یہ ان اجناس کی افادیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یعنی جب یہ انھیں — استعمالی قیمتیں[2] — بناتی ہیں۔

اور ظاہر ہے اجناس کا مبادلہ۔ ایک ایسا عمل ہے جو اس وقت ہوتا ہے۔ جب — جنس — کی استعمالی قیمت سے مکمل صرف نظر کر لیا جائے ایک استعمالی قیمت تو اتنی ہی اچھی یا بری ہوتی ہے۔ جیسے دوسری استعمالی قیمت۔ بس شرط یہ ہے کہ استعمالی قیمت قابل ذکر مقدار میں موجود ہو یا جیسا بوڑھے باربن نے کہا ہے کہ اگر قیمتیں یکساں ہوں تو ایک قسم کا سامان اس قدر اچھا ہوتا ہے جتنے دوسرے قسم کا — یکساں قیمتوں کی چیزوں میں کوئی فرق کوئی امتیاز نہیں ہوا کرتا۔ سو روپیہ کا سیسہ یا لوہا اس قدر قیمت رکھتا ہے۔ جو سو روپیے کی چاندی اور سونے کی قیمت ہے[3]۔

اس سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ استعمالی قیمتیں ہونے کی حیثیت سے اجناس کی مختلف خصوصیات کی اہمیت حاصل کر جاتی ہیں جو کہ مبادلاتی قیمتیں ہونے کی حیثیت میں ان کی مختلف مقداروں کی اہمیت ہوتی ہے۔ اور اس لئے ان میں استعمالی قیمت کا کوئی جزو بھی موجود نہیں ہوتا[4]۔

---

* مارکس کہنا یہ چاہتے ہیں کہ مبادلاتی قیمت ہونے کی حیثیت میں دو مساوی چیزوں میں مساوات کا ہونا یہ بتاتا ہے کہ ایک ایسی قدر ہے جس کی یہ دونوں چیزیں برابر ہیں۔ یہی وہ قدر ہے جسے وہ تیسری چیز کہتے ہیں۔ یہی وہ قدر ہے جس پر دونوں چیزیں تحلیل پذیر ہو سکتی ہیں یعنی یہ پیمانہ ہے جس پر ان کو ناپا جا سکتا ہے (مترجم)

[1] یعنی مطلب یہ ہے کہ جس طرح کسی مثلث کا رقبہ جس کے ذریعہ مستطیل اشکال کو ناپا جا سکتا ہے ایک ایسی چیز سے ظاہر کیا جاتا ہے جو خود مثلث سے مختلف اور مشترک دونوں ہوتی ہے اس طرح اجناس کی مبادلاتی قیمتیں ایک ایسی قدر سے ظاہر کی جا سکتی ہیں جو ان میں مشترک ہونے کے ساتھ ہی الگ بھی ہو۔ مارکس یہاں تمام اجناس کی مبادلاتی قیمتوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ تمام مبادلاتی قیمتیں ایک بیرونی یا خارجی قدر رکھتی ہیں جو ثابت اور مسلسل قدر ہے۔ بعض اجناس کی مبادلاتی قیمت اس قدر کے کم حصہ اور بعض کی زیادہ حصہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارکس کے ذہن میں مبادلاتی قیمت کا بھی کچھ ایسا ہی آئیڈیل یا مثالیہ تھا جیسے مثالئے افلاطون نے پیش کئے تھے۔ صرف اتنے فرق کیساتھ کہ افلاطون مثالیوں کو عالم امثال میں رکھتے ہیں اور مارکس عالم خارج میں۔ مبادلاتی قیمت کی مذکورہ بیرونی قدر بھی ایک مثالیہ جیسی ہے جو غیر مبدل اور یکساں ہے (مترجم)

[2] لہٰذا ان کا تعلق استعمالی قیمت سے ہوتا ہے۔ مبادلاتی قیمت سے نہیں۔ (مترجم)

[3] اور جب مبادلہ میں یہ صرف نظر شرط ہے تو پھر ظاہر ہے کہ ہندسیاتی اور طبعی خصوصیات مبادلاتی قیمت سے متعلق نہیں ہو سکتیں کہ ان کا تعلق استعمالی قیمت سے ہے۔ جس سے صرف نظر کر لیا گیا ہے۔ (مترجم)

[4] اس طرح نتیجہ یہ نکلا کہ ہندسیاتی اور طبعی خصوصیات کا تعلق مبادلاتی قیمت سے نہیں ہے۔ (مترجم)

[5] کہ مبادلاتی قیمت میں استعمالی قیمت کا کوئی عنصر نہیں ہوتا۔ (مترجم)

نقی اختر

عظیم سائنسداں نیل بوہر کے ساتھ چند لمحے!

ڈاکٹر نیل بوہر جدید سائنسی ارتقا میں آئن اسٹائن سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ بیسویں صدی کے آغاز سے پندرہ سال قبل پیدا ہوئے اور بیسویں صدی کے ربع اول میں اس کے سائنسی شعور کی تقدیر بن گئے۔ خود آئن اسٹائن نے ان کی اس اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے علمی حلقے ان کی عظمت سے ابھی پوری طرح واقف نہیں ہوئے ہیں۔ زیر نظر مضمون سے قارئین کو ان کی عظیم شخصیت، علمی عظمت اور سائنسی خدمات کا اندازہ ہو سکے گا۔ ج۔ الف

۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کو امریکہ کی نیشنل اکیڈمی برائے سائنس میں ایک ماہتابی چہرے والا معمر انسان اپنی ذہنیت و ذہانت کا سب سے بڑا صلہ لینے اپنی کرسی سے اٹھا۔ "ایٹم برائے امن" کا پہلا انعام ۷۵۰۰۰ ڈالر ڈنمارک کے مایۂ ناز سائنس داں نیل بوہر کو پیش کیا گیا۔ نیل بوہر دنیائے سائنس میں قطب نما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی کی ترقی میں ان کا اتنا ہی دخل ہے جتنا آئن اسٹائن کا۔

چالیس سال قبل بوہر نے اپنی ایک تصنیف on the constitution of Atoms molecules میں ایٹم کی بناوٹ کے اہم راز کا انکشاف کیا تھا۔ ان کی اس معرکتہ الآرا ریسرچ اور پروٹان والیکٹران کے گہرے مطالعے نے ان کے لئے ۱۹۲۲ء میں نوبل پرائز جیت لیا۔ نیل بوہر کو جائز طور پر ایٹمی توانائی کا سرپرست کہا جا سکتا ہے۔ خود دیوزاد سائنس داں آئن اسٹائن نے اپنی موت سے چند روز قبل بوہر کے متعلق یہ کہا تھا: "کون کہہ سکتا ہے کہ بوہر کے بغیر ایٹمی سائنس کا کیا حشر ہوتا!"

ڈنمارک میں بوہر کی عزت و مقبولیت شاہی خاندان اور ہنس کرسچین انڈرسن سے کچھ ہی کم ہے۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس عجیب واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ کوپن ہیگن کے ایک امریکی سائنسداں کی بیوی نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے شخص سے کہا کہ میرا شوہر نیل بوہر کی نگرانی میں ریسرچ کر رہا ہے۔ یہ سن کر وہ شخص فوراً کھڑا ہو گیا اور نہایت تعظیم و ادب کے ساتھ اس خاتون کے سامنے جھک گیا۔

کوپن ہیگن یونیورسٹی کے Bohr's Institute for Theoretical Physics کو ماہران طبیعیات کا روحانی مرکز کہا جاتا ہے۔ بوہر کے طریق کار کا بنیادی اصول خیال پرستی سے دشمنی ہے۔ وہ اپنے طلبہ سے کہا کرتے ہیں کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اسے حرف آخر نہ سمجھئے بلکہ اسے ایک سوال تصور کیجئے۔ بوہر نے حقیقت کی یہ تعریف کی ہے: حقیقت وہ ہے جس پر شبہ کرنے کی ہم کوشش کر سکتے ہیں۔ اور پھر کافی تگ و دو کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شبہ کا کچھ حصہ صحیح نہیں ہے۔ ایک مرتبہ جب ایک تجربے سے بالکل غیر متوقع نتائج برآمد ہوئے تو بوہر نے طلبہ سے کہا: "کتنا اچھا ہوا کہ ہم اس تضاد

سے دو چار ہو گئے۔ اب کہیں ترقی کی امید ہو سکتی ہے۔ بوہر کے ساتھ ہمیشہ چالیس پچاس طلبہ کا گروپ رہتا ہے جو ایک درجن یا اس سے زیادہ قوموں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک بار اپنے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

" ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ وجود کے اس ڈرامے میں ہم تماشائی بھی ہیں اور فنکار بھی"۔ ان کا کہنا ہے کہ سائنس دان کو کائنات میں اتصال دریافت کرنا چاہئے نیز یہ کہ اگر ہمیں کہیں ایک مشکل درپیش ہو تو حقیقت معلوم ہونے کی کچھ امید ہوتی ہے۔ اگر دو ہوں تو ہم ایک کو دوسرے کے خلاف استعمال کر کے دونوں کو ختم کر سکتے ہیں۔ بوہر کا نظریہ ہے کہ اس کائنات میں نظم و ہم آہنگی دراصل بظاہر مخالف طاقتوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے۔

وہ عموماً اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے رہتے ہیں ایسے عالم میں وہ ہمیشہ پائپ پیتے ہوئے ملیں گے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی نشست میں عجیب و غریب انداز سے چلے آتے ہیں، پائینچے اوپر کو اٹھے ہوئے۔ بال بکھرے ہوئے۔

بوہر ۷ اکتوبر ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے ان کے والد۔ کرسچین بوہر کوپن ہیگن یونیورسٹی میں فزیالوجی کے پروفیسر تھے۔ نیل بوہر نے اپنے والد کی نگرانی میں پرورش پائی۔

۲۲ سال کی عمر میں انھیں پانی کے سطحی تناؤ پر لیسرچ کے صلے میں ڈنیش سائنٹیفک سوسائٹی کی طرف سے ایک گولڈ میڈل ملا۔ اسی زمانے میں وہ اور ان کے بھائی ہیرالڈ اپنے ملک میں فٹ بال کے کھلاڑی کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ اپنے ملک میں ایم۔ ایس سی اور پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد وہ "رودر فورڈ" کے ساتھ کام کرنے انگلینڈ چلے گئے۔ لارڈ رودر فورڈ یہ ثابت کر چکے تھے کہ ایٹم کے مرکز میں ایک بھاری Nucleus ہوتا ہے۔ جس میں مثبت برق ہوتی ہے اور چاروں طرف منفی برق رکھنے والے الیکٹران ہوتے ہیں Nucleus کی مثبت برق الیکٹران کی منفی برق سے توازن قائم رکھتی ہے۔ دوسرے سائنس دان ثابت کر چکے تھے کہ ایٹم سے توانائی روشنی کی صورت میں خارج ہوتی ہے۔

۱۹۱۳ء میں بوہر نے اپنی تصنیفات کے ذریعے روشنی کی صورت میں توانائی کے خارج ہونے کو اس طرح ثابت کیا کہ الیکٹران مرکز کے گرد اپنے مخصوص محور پر گھومتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے کہ نظام شمسی میں سیارے۔

ایٹم کے اس تصور نے Spectroscopy کی نظریاتی بنیاد ڈالدی کچھ دن بعد بوہر نے Quantum Theory کے بنیادی نظریات کی بھی توضیح کر دی۔ ۱۹۲۰ء میں ایٹمی طبیعات نے بڑی ترقی کی ایک سائنسداں یوں لکھتا ہے "یہ بڑا شاندار کارنامہ تھا" یہ کارکردگی کسی ایک سائنسداں کی نہیں تھی بلکہ اس میں مختلف ممالک کے درجنوں سائنسداں شامل تھے۔ لیکن شروع سے آخر تک نیل بوہر کی تخلیقی ذہانت اور تنقیدی نظر نے رہنمائی کی۔

۱۹۱۲ء میں شادی کے۔ بعد بوہر کی زندگی میں خاندان اور کھیل کا کافی اثر رہا۔ ۵۴ سال کی عمر میں انھوں نے Skiing میں ایک انعام جیتا۔ لیکن ان کی زندگی میں غم بھی کھیل ہی کے راستے سے داخل ہوا جب ان کا بڑا لڑکا کشتی رانی کے ایک مقابلہ میں ڈوب گیا اگر ان کے دوست انھیں روک نہ لیتے تو بوہر دریا کی طوفانی موجوں میں ڈوب کر جان دے دیتے۔

۱۹۳۹ء میں وہ امریکہ میں یہ اہم اطلاع دینے گئے کہ جرمنی میں یورینیم کا ایٹم توڑ لیا گیا ہے۔ امریکی سائنسداں ڈاکٹر وہیلر جو پہلے امریکن تھے جنھوں نے جرمنی میں ایٹم کو توڑنے کی خبر پہلی بار بوہر سے سنی۔ پرنسٹن میں مزید نظریاتی کام دونوں نے مل کر کیا۔ اور اس کے بعد کولمبیا یونیورسٹی میں ایٹم کو توڑنے کے اصل تجربات کئے گئے۔ بوہر کے قریب ترین دوست آئن اسٹائن نے ان تجربات کی ترقی کے بارے میں صدر روزویلٹ کو مطلع کیا۔ اور اس طرح Manhattan project کی بنیاد پڑی۔ بوہر ڈنمارک واپس چلے گئے۔ چار سال بعد انھیں دوسری جنگ عظیم کے دوران ڈرامائی انداز میں ملک سے فرار ہونا پڑا۔ چند سال تک نازیوں نے بغیر کسی رکاوٹ کے انھیں کام کرنے دیا۔ مگر ستمبر ۱۹۴۳ء میں جب معلوم ہوا کہ بوہر اتحادیوں سے ملے ہوئے ہیں تو انکی گرفتاری یقینی ہو گئی۔ ڈاکٹر بوہر نے ڈنمارک چھوڑ دیا۔ اور سویڈن چلے گئے۔ وزیر اعظم چرچل نے ان کے لئے ایک بمبار طیارہ روانہ کیا اور اس طرح بوہر لندن پہونچے پھر انھیں امریکہ روانہ کر دیا گیا۔

۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء کا ایٹم بم کا تجربہ بوہر نہ دیکھ سکے۔ کیوں کہ وہ اس سے پہلے ہی ...

اہم حصہ لیا کہ اس توانائی پر کوئی بین الاقوامی کنٹرول فوراً قائم کیا جائے وہ انسان میں نئے ایٹمی توانائی کی ترقی کیلئے اس قدر کام کیا ... نے آج تک

دیکھا نہیں۔ سن ۱۹۵۵ء میں جنیوا میں جو ایٹم برائے امن کانفرنس ہوئی تھی اس کے روح رواں بوہر ہی تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے بوہر ہر ممکن

کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ایٹمی توانائی ترقیاتی منصوبوں میں صرف ہونی چاہئے۔ انھوں نے یورپ کے بارہ ممالک کو ملاکر CERN قائم کی

تاکہ یہ ممالک ایٹمی توانائی کے متعلق ایک دوسرے سے تعاون کرسکیں۔

تھکا دینے والی مصروفیات سے فراغت پاکر بوہر اپنے بارہ کمروں والے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ جس کے ساتھ ایک خوبصورت اور وسیع باغیچہ لگا ہوا ہے

یہیں ان کے بارہ پوتی پوتے ان سے ملنے آتے ہیں۔ اور وہ ان کے ساتھ کھیل کود میں لگ جاتے ہیں۔ بنگلے کے پورٹیکو میں دنیا کے بڑے بڑے فلسفیوں اور

مفکروں کے مجسمے نصب ہیں۔ بوہر اور ان کی بیوی کو خوبصورت اور رومانی مناظر کی تصویریں بہت ہی پسند ہیں۔ وہ اس قسم کی تصویریں بڑے شوق سے جمع کرتے

ہیں۔ ان تصویروں میں ایک ایسی تصویر بھی ہے جو نہ رومانی ہے اور نہ خوش منظر۔ بوہر کا کہنا ہے کہ وہ اس تصویر کو محض اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ ریاضی کے کسی

اصول کی پابند نہیں۔

بوہر سوچتے ہیں تو ٹہلنے لگتے ہیں۔ ان کے استغراق کے بارے میں آپ سن ہی چکے ہیں ایک بار جب وہ امریکہ جارہے تھے تو پاسپورٹ گھر ہی بھول گئے

اسی استغراق کی بنا پر انھوں نے ایک مرتبہ پائپ سے اپنے کپڑوں کو جلا لیا تھا۔

بوہر سچ مچ بہت عظیم انسان ہیں وہ کسی کے دریافت کرنے پر بھی اپنے کارناموں کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ اپنے ابھرتے ہوئے طلبا اور رفقا کو سراہتے رہتے

ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سائنس ہمیشہ نئی رہتی ہے اسی لئے نئے خون ہی کو اس میں ابھرنا چاہئے۔ (ترجمہ)

برٹرینڈ رسل
ممتاز سعید

آئیے ایک سائنسی سماج بنائیں

دنیائے جدید کے عظیم فلسفی رسل فکرِ جدید پر جس طرح اثر انداز ہوئے ہیں، اسے ایک انقلاب انگیز اور عہد آفریں حیثیت حاصل ہے۔ یہ مضمون ان کی جلیل القدر تصنیف 'Impact of Science on Society' کے آخری باب کے نصف اوّل کا ترجمہ ہے۔

ع - ۱

مجھے ایک خالص سائنسی موضوع پر بحث کرنا مقصود ہے۔ کیا ایک معاشرہ جس میں سائنسی فکر و تخیل موجود ہوں، ایک عرصہ تک اس طرح باقی رہ سکتا ہے جس طرح، مثال کے طور پر قدیم مصر باقی رہا۔ یا ایسا ہے کہ وہ معاشرہ لازمی طور پر کچھ ایسی قوتوں کا حامل ہوگا جو بالآخر اس کے زوال کا باعث بن جائیں؟

میں اس سوال کی وضاحت سے بحث کا آغاز کروں گا جو میرے پیشِ نظر ہے۔ میرے خیال میں کوئی معاشرہ اس حد تک ہی سائنسی ہوتا ہے جس حد تک سائنسی معلومات اور اس معلومات پر مبنی تکنیک اس معاشرہ کی روزمرہ کی زندگی، اس کے معاشی حالات اور اس کے سیاسی تنظیم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مختلف معاشرے مختلف درجوں میں سائنسی ہوتے ہیں۔ سائنس کے ادوارِ اولین میں معاشرہ پر اس کے اثرات برائے نام تھے۔ سوائے اس کے کہ علماء کی ایک قلیل تعداد اس سے متاثر تھی۔ لیکن موجودہ دور میں سائنس روزمرہ کی زندگی کو بڑی تیزی سے تبدیل کر رہی ہے۔

لفظ "مستحکم" میں نے ان معنی میں استعمال کیا ہے جن میں یہ طبیعیات میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک لٹو اس وقت تک ہی مستحکم رہے گا جب تک اس کے گھومنے کی رفتار ایک خاص رفتار سے زیادہ ہوگی۔ اگر اس کی رفتار اس مقررہ رفتار سے گر جائے تو لٹو غیر مستحکم ہو کر گر جائے گا۔ ایک ایٹم جب تک نہ ہو مستحکم رہے گا تا آنکہ کوئی ایٹمی سائنسدان اسے گرفت میں لے لے۔ ایک ستارہ لاکھوں سال تک مستحکم رہتا ہے لیکن ایک دن ایسا آتا ہے کہ وہ بھک سے اڑ جاتا ہے۔ استحکام کے کچھ اس طرح کے معنی پیشِ نظر رکھ کر میں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا وہ معاشرہ جس کی داغ بیل ہم ڈال رہے ہیں مستحکم رہے گا۔

میں اس نکتہ پر خاص طور پر زور دینا چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ خالصتاً حقیقت پسندانہ ہے۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ مستحکم ہونا بہتر ہے یا غیر مستحکم ہونا۔ اس بات کا تعلق اقدار سے ہے جو سائنسی بحث کے دائرے سے باہر ہیں۔ میں کوشش یہ جاننے کی کر رہا ہوں کہ کیا یہ حقیقتاً ممکن ہے یا نہیں کہ معاشرہ سائنسی حالت میں برقرار رہے۔ اگر ایسا ہے تو معاشرہ لازمی طور پر آہستہ آہستہ زیادہ سے زیادہ سائنسی ہوتا چلا جائے گا چونکہ ساتھ ساتھ سائنسی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو یا تو بتدریج تنزل ہوتا رہے گا، اسی طرح جیسے شعاعِ حرارت کے اشعاع (شعاع اندازی) کی بنا پر آہستہ

آہستہ سرد ہو رہا ہے۔ یا پھر ایک شدید تغیر ظہور پذیر ہوگا۔ ان تغیرات کی طرح جن کے سبب ہیولا کے ستارے پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا امکان خود کو ستارے کے انحطاط کی صورت میں ظاہر کرے گا۔ اور دوسرا امکان انقلاب یا غیر فیصلہ کن جنگ کی صورت میں سامنے آئے گا۔

اگر ہم وقت کے پیمانے پر اسے پرکھیں تو یہ مسئلہ بے حد تخیلی بن جاتا ہے۔ ہیئت دان ہمیں بتاتے ہیں کہ اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ کرۂ ارض لاکھوں سال تک انسانی آبادی کے لئے مناسب رہے۔ نسلِ آدم کی عمر تقریباً دس لاکھ سال ہے۔ لہٰذا اگر مستقبل میں حالات استوار رہے تو انسان کا مستقبل اس کے ماضی سے کہیں زیادہ طویل ہونا چاہیئے۔

حقیقتاً ہم انسان کی صلاحیتوں اور اس کی حماقتوں کے درمیان ایک مستقل کشمکش میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ صلاحیتیں ذریعہ اور حماقتیں مقصد بن گئی ہیں۔ نسلِ آدم اپنی جہالت اور نااہلی ہی کی بنا پر اب تک باقی ہے۔ لیکن ایسی صورت میں جب علم واہلیت، نادانی کے ساتھ آملیں تو بقا غیر یقینی ہو جاتی ہے۔ علم ایک قوت ضرور ہے۔ لیکن یہ قوت بدی کے لئے بھی اسی قدر استعمال ہو سکتی ہے جتنی بہتری کے لئے۔ چنانچہ جب تک انسان کی دانشمندی میں اس کے علم کے بقدر اضافہ نہ ہو، علم میں ہر اضافہ انسانی آلام میں اضافے کے مترادف ہوگا۔

عدمِ استحکام کے اسباب

عدمِ استحکام کے ممکن اسباب پر تین پہلوؤں سے غور کیا جا سکتا ہے۔ یعنی طبیعاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی۔ میں طبیعاتی اسباب سے آغاز کروں گا۔

طبیعاتی اسباب

صنعت اور زراعت دونوں کے طریق ہائے کار کچھ ایسے ہیں کہ کرۂ ارض کے قدرتی وسائل بڑھتی ہوئی تعداد میں روز بروز ضائع ہو رہے ہیں۔ زراعت کے سلسلے میں تو ہمیشہ ہی سے کچھ ایسے حالات رہے ہیں۔ یہ حالات اس وقت سے موجود ہیں جب انسان نے پہلے پہل ہل جوتنا شروع کیا تھا۔ ماسوا ان علاقوں کے جہاں غیر معمولی طور پر اچھے حالات موجود رہیں۔ مثلاً وادیٔ نیل میں۔ جب تک آبادی قلیل تھی، انسانوں کے گروہ نئی آراضی کی تلاش میں اس وقت نکلتے تھے جب انہیں اپنے کھیتوں سے خاطر خواہ فصل حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس وقت یہ بات دریافت ہوئی کہ انسانی لاشیں کھاد کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہیں چنانچہ انسانی قربانی عام ہو گئی۔ اس طریقہ میں دو فوائد تھے، نہ صرف یہ کہ پیداوار میں اضافہ ہوتا تھا بلکہ کھانے والوں کی تعداد بھی کم ہو جاتی تھی۔ باوجود ان فوائد کے یہ طریقہ جلد ہی نفرت انگیز بن گیا۔ اور اس کی جگہ جنگ نے لے لی۔ لیکن جنگ بھی اس حد تک تباہ کن اور انسان کش ثابت نہ ہوئی کہ باقی ماندہ افراد کی اکامیت میں کوئی کمی ہوتی۔ اس طرح زمینیں شروع سے اب تک انحطاط پذیر ہوتی رہیں۔ اب ہمیں ان تدابیر کی پوری واقفیت ہے جن کے ذریعے دنیا کی غذائی پیداوار کو تباہی کی حد تک کم ہونے سے روکا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات غیر یقینی ہے کہ وہ سب کچھ کیا جائے گا جو ضروری ہے۔ غذا کی ضرورت اتنی شدید اور غذا کی تجارت میں فوری نفع اتنا کثیر ہے کہ صرف ایک طاقتور اور ذہین حکومت ہی ان ضروری تدابیر کو عمل میں لا سکتی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ دنیا کے بیشتر حصوں میں حکومتیں نہ تو طاقتور ہیں اور نہ ذہین۔

خام اشیاء بھی آگے چل کر اتنے ہی سنجیدہ مسائل پیدا کرتی ہیں جتنے زراعت کی بنا پر پیش آئیں گے۔ کارنوال کا علاقہ فونیشین زمانے سے لے کر کچھ عرصہ قبل تک ٹین پیدا کرتا رہا۔ اب یہ رسد ختم ہو گئی ہے۔ ہم اسی خیال سے مطمئن ہیں کہ ابھی تو ملایا میں ٹین موجود ہے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی کبھی نہ کبھی ختم ہو جائے گا۔ بہر حال جلدی یا دیر سے، آسانی سے مہیا ہونے والا ٹین ناپید ہو جائے گا۔ اور یہی حال دوسری خام اشیاء کا ہے۔ اس وقت سب سے زیادہ پریشان کن حالات تیل کے ہیں۔ موجودہ سائنسی تکنیک کے پیش نظر، کوئی قوم تیل کے بغیر نہ تو صنعتی ترقی کر سکتی ہے اور نہ ہی مؤثر طور سے اپنا دفاع کر سکتی ہے۔ لیکن تیل کے ذخائر بڑی تیزی سے کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان باقی ماندہ ذخائر کی ملکیت کے لئے جنگیں ہوئیں تو یہ اور بھی جلد ختم ہو جائیں گے۔ میری یہ بات سن کر بعض لوگ ضرور یہ کہیں گے کہ عنقریب جوہری توانائی تیل کی جگہ لے لے گی۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب یورینیم اور تھوریم کے موجودہ ذخائر بھی انسانوں اور مچھلیوں کو تباہ کرتے ہوئے ختم ہو جائیں گے تو کیا ہوگا۔

یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ صنعت کا دار و مدار ایسی اشیاء اور ذرائعِ توانائی پر ہے جن کو دوبارہ مہیا کرنا ناممکن ہے۔ زراعت بھی اسی زمرے میں شامل ہے۔ چونکہ اس میں مصنوعی کھاد استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس ضرورت کے مطابق نئے ذرائع دریافت کرتی رہے گی۔ لیکن ساتھ ہی آراضی اور محنت کی مقررہ مقدار کی مناسبت سے پیداوار بھی کم ہوتی جائے گی۔ ہر حالت میں نئے ذرائع کی دریافت ایک عارضی تدبیر ہوگی۔ دنیا سرمایہ کے دم سے قائم ہے۔ اور اگر صنعت کو معاشرہ میں کوئی مقام حاصل رہا تو یہی صورت رہے گی۔ سائنسی معاشرہ میں عدم استحکام کی یہ وجہ بھی ہوگی اور اس سے فرار ممکن نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مستقبلِ بعید میں ظہور پذیر ہوگی۔

حیاتیاتی اسباب

اب ہمیں مسئلہ کے حیاتیاتی پہلو پر غور کرنا ہے۔ اگر کسی نوع کی حیاتیاتی کامیابی کا پیمانہ تعداد ہے تو ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ انسان بعد کامیاب رہا ہے۔ شروع میں انسان یقیناً نادرالوجود رہا ہوگا۔ انسان کی دو صلاحیتیں —— یعنی اوزار چلانے میں ہاتھوں کا استعمال اور دریافت و تجربہ کو زبان کے ذریعہ منتقل کرنے کی صلاحیت —— ایسی ہیں جو بتدریج ترقی کرتی ہیں شروع میں نہ تو اوزار ہی کچھ زیادہ تھے اور نہ ہی کچھ زیادہ معلومات و تجربہ تھا جسے منتقل کیا جاتا۔ پھر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ زبان ارتقاء کے کس دور میں پیدا ہوئی۔ بہرحال انسانی آبادی میں اضافہ تین منزلوں میں ہوا ہے۔ سب سے پہلے تو انسان کا جانوروں کو گھریلو بنانا۔ دوسرے زراعت کا استعمال اور تیسرے صنعتی انقلاب۔ ان تین منازل سے گذرنے کے بعد انسانوں کی آبادی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ جنگلی جانوروں کی کوئی ایک قسم بھی اتنی کثیر التعداد نہ ہوگی بھیڑیں، گائیں اور بھینسیں اپنی تعداد کے سلسلے میں انسان ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ تعداد کے سلسلے میں دودھ پلانے والے جانوروں کی کوئی نوع بھی انسان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ بڑے بھینسے کی نسل کا تقریباً ختم ہوجانا اس بات کا ثبوت ہے۔

اس خوف کے ساتھ میں اپنا دوسرا کلیہ پیش کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ دواؤں کا استعمال ماسوائے تھوڑے عرصے کے انسانی آبادی میں اضافہ نہیں کرسکتا اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر چودھویں صدی کے دوسرے نصف میں علمِ طب "کالاآزار" کا علاج کرسکتا تو یورپ کی آبادی اس وقت کہیں زیادہ ہوتی۔ لیکن اس کمی کا ازالہ بہت جلد قدرتی طور پر ہوگیا۔ چین میں یورپ اور امریکہ کے طبی مشن بچوں میں اموات کے روک تھام کے سلسلے میں کافی مصروف ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کی زیادہ تعداد پانچ یا چھ سال کی عمر میں بھوک کی اذیت ناک موت مر جاتی ہے۔ اس طرح انسانیت کو فائدہ پہنچنا خاصہ مشکوک نظر آتا ہے۔ سوائے ان علاقوں کے جہاں شرحِ پیدائش کم ہے، آبادی بالآخر غذائی رسد اور صرف غذائی رسد پر منحصر ہوتی ہے۔ مغرب میں شرحِ پیدائش میں کمی واقع ہوئی ہے اور مالتھس کا نظریۂ آبادی غلط ثابت ہوگیا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ قبل تک اس کا اطلاق پوری دنیا پر ہوتا تھا۔ اور مشرق کے گنجان آباد ممالک میں تو یہ نظریہ اب بھی بالکل صحیح ہے۔

آبادی کو بڑھانے کے سلسلے میں سائنس نے کیا کیا ہے؟ پہلی بات تو یہ کہ سائنس نے مشینوں، کھادوں اور جانوروں کی بہتر نسلوں کے ذریعہ فی ایکڑ پیداوار اور انسانی محنت کے اکائی پیداوار میں اضافہ کیا ہے۔ یہ عمل براہِ راست ہے۔ لیکن فی الحال اس سے زیادہ اہم ایک اور عمل ہے۔ نقل و حمل میں آسانیاں مہیا ہوجانے کی بنا پر یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ایک علاقہ اپنی ضروریات سے زیادہ غذا پیدا کرکے کسی دوسرے علاقے سے جو اپنی ضرورت سے زیادہ صنعتی اشیاء بناتا ہے، غذا کا تبادلہ صنعتی اشیاء کے عوض کرلے۔ اسی لئے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کوئی علاقہ اپنے غذائی وسائل سے زیادہ آبادی کا حامل ہوسکے۔ اشخاص اور اشیاء کے آزادانہ نقل و حمل کو فرض کرلینے کے بعد ضروری صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اتنی ہی غذا پیدا کرے جتنی پوری دنیا کی آبادی کے لئے ضروری ہے۔ بشرطیکہ کم غذائی پیداوار کے علاقوں کے پاس غذا کے عوض مہیا کرنے کے لئے ایسی اشیاء ہوں جو زیادہ غذائی پیداوار کے علاقوں کے لئے قابلِ قبول ہوں۔ لیکن یہ شرط بڑے وقتوں میں ناکام ہوجائے گی۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد روس میں کسانوں کے پاس اتنی ہی غذا تھی جتنی انھیں ضرورت تھی۔ وہ شہری مصنوعات کے عوض اس غذا کی کوئی مقدار بیچنے کو تیار نہ تھے۔ اس وقت اور ۱۹۳۲ء، ۱۹۳۱ء کے قحط کے دوران شہری آبادی کو فوجی طریقہ کار ہی کے بل بوتے پر زندہ رکھا گیا۔ حکومت کے اقدامات کی بنیاد پر اس قحط میں لاکھوں کسان بھوک سے مرگئے۔ اور اگر حکومت غیر جانبدار رہتی تو شہروں کے رہنے والے بھی بھوک سے مرجاتے۔

یہ تمام حقائق ہمیں ایک ایسے نتیجے پر پہنچاتے ہیں جو میرے خیال میں اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ وہ یہ کہ صنعت جب تک زراعت کی ضروریات
ء اور است پیدا کرتی ہے، محض ایک عیاشی ہے۔ برے وقتوں میں اس کی مصنوعات ناقابل فروخت ہو جائیں گی۔ مزدور اس صورت ہی میں زندہ رہ
تے ہیں کہ غذا پیدا کرنے والوں کو طاقت کے ذریعہ قابو میں رکھا جائے۔ اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ منفرد غذا پیدا کرنے والوں کو مرنے دیا جائے۔۔ اگر
ب حالات عام ہو جائیں تو صنعت انحطاط پذیر ہو جائے گی اور پچھلے ڈیڑھ سو سال سے جو صنعتی ترقی کی رفتار بن گئی ہے وہ بے حد کمزور پڑ جائے گی۔
بن آپ کہیں گے کہ خراب حالات غیر معمولی حالات ہوتے ہیں اور ان کی روک تھام غیر معمولی طریقوں سے کی جا سکتی ہے۔ یہ بات صنعت کے عروج کے دور پر کسی حد
صادق آتی ہے۔ لیکن اگر آبادی میں اضافے کی شرح کی حد کم نہ کی گئی تو یہ بات صحیح نہ رہے گی۔ آج کل دنیا کی آبادی تقریباً اٹھاون ہزار افراد فی دن کے
ساب سے بڑھ رہی ہے۔ اس اضافے میں جنگ کی بنا پر کوئی بڑی کمی واقع نہیں ہوئی۔ دونوں عالمی جنگوں کے دوران یہ اضافہ برابر ہوتا رہا ہے۔ انیسویں
دی کے آخری پچیس سال تک یہ اضافہ غیر ترقی یافتہ ممالک کی نسبت ترقی یافتہ ممالک میں زیادہ تیزی سے ہو رہا تھا۔ لیکن اب یہ اضافہ تقریباً مکمل طور
ر بے حد غریب اقوام میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ان اقوام میں چین اور ہندوستان تعداد کے اعتبار سے اور روس سیاسی طور پر اہم ترین ہیں۔
لیکن میں فی الحال عالمی سیاست کو چھوڑ کر بحث کو صرف حیاتیاتی پہلو تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔

اگر آبادی میں اس خطرناک اضافے کی روک تھام نہ کی گئی تو لازمی طور پر کیا نتائج برآمد ہوں گے؟ اس وقت جو ممالک خوشحال ہیں، ان کے معیار
زندگی میں کمی واقع ہوگی۔ معیارِ زندگی میں تنزل کے ساتھ ہی صنعتی اشیاء کی مانگ بے حد کم ہو جائے گی۔ ڈیٹرائیٹ کے کارخانے موٹریں بنانا چھوڑ کر صرف
لاریاں بنانا شروع کر دیں گے۔ کتابیں، آلاتِ موسیقی اور گھڑیاں وغیرہ چند غیر معمولی طور پر طاقتور اشخاص کے عیش کا سامان بن کر رہ جائیں گی۔ خاص
طور پر ایسے اشخاص جو فوج اور پولیس میں اعلیٰ عہدوں پر ہوں۔ آخر کار معاشرے میں نکبت و فلاکت کی یکسانیت پیدا ہو جائے گی اور مالتھس کا نظریہ آبادی ایک
بار پھر زندہ ہو جائے گا۔ جب دنیا میں تکنیکی اعتبار سے یکسانیت پیدا ہو جائے گی تو اچھی فصلوں کے ساتھ آبادی میں اضافہ ہوگا اور بری فصلوں کے ساتھ
جو قحط آئیں گے ان سے آبادی کم ہو جایا کرے گی۔ صنعتی اور شہری زندگی کے موجودہ مراکز میں سے زیادہ تر سنسان ہو جائیں گے اور ان کے باشندے
اگر زندہ رہے تو اپنے آبا و اجداد کی طرح کسانوں کی سخت زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یقیناً اس وقت دنیا نے ایک نیا استحکام پا لیا ہوگا لیکن
ان تمام چیزوں کے عوض جو انسانی زندگی کو قابلِ قدر اور خوبصورت بناتی ہیں۔

کیا تعداد اور صرف تعداد اس قدر اہم ہے کہ اس کی خاطر ہم ایسے حالات پیش آنے دیں؟ یقیناً نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہمیں کیا کرنا چاہیئے
اگر چند مخصوص اور گہرے تعصبات کو چھوڑ دیا جائے تو اس سوال کا جواب واضح طور پر نظر آ جاتا ہے۔ اُن اقوام میں جو آج بڑی تیزی سے اپنی آبادی میں اضا
کر رہی ہیں، ان طریقوں کو مقبول کیا جائے جن کے ذریعہ مغرب کے بیشتر ممالک نے اپنے یہاں آبادی کے اضافے کی روک تھام کی۔ اگر حکومت کے تعاون
کے ساتھ تعلیمی پروپیگنڈا جاری رکھا جائے تو ایک پشت میں یقیناً خاطر خواہ نتائج برآمد کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن دو عظیم طاقتیں اس طرح کی کسی بھی پالیسی
کی سخت مخالف ہیں۔ یعنی مذہب اور وطن پرستی۔ میرے خیال میں ان تمام لوگوں کو جو حقیقتوں کا سامنا کرنا چاہتے ہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیئے
کہ اگر ضبطِ تولید کی مخالف تحریکیں کامیاب ہو گئیں تو پچاس سال کے اندر اندر انسانیت کو فلاکت اور تذلیل کی موت آ جائے گی۔ میں ہرگز یہ کہنا نہیں چاہتا کہ
صرف ضبطِ تولید ہی ایسا ذریعہ ہے جس سے آبادی کو بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ اور بھی طریقے ہیں جو شاید ضبطِ تولید کے مخالفین کو پسند آئیں۔ جیسا
میں نے اوپر عرض کیا ہے، جنگ بطور ایک ذریعہ کے اس سلسلے میں ناکام رہی ہے۔ لیکن شاید جراثیمی جنگ بہتر ثابت ہو۔ اگر ہر پشت میں ایک بار دنیا
میں طاعون یا ہیضہ جیسی کوئی سی وبا پھیلائی جا سکے تو باقی ماندہ افراد بے خوف و خطر ہو کر اطمینان سے اضافۂ نسل میں مصروف رہ سکتے ہیں۔ اس طریقے
میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر مذہبی لوگوں کے ضمیر انہیں ملامت کریں، یا جس سے وطن پرستوں کی خواہشات کی تکمیل میں حرج واقع ہو۔ یہ
حالات کچھ ناخوشگوار ضرور ہوں گے۔ لیکن ہمیں اس سے کیا۔ صحیح طور پر بلند نظر لوگ مسرتوں کو نظر انداز کر ہی دیتے ہیں۔ اور خاص طور پر دوسر

کی مسرتوں کو۔ لیکن میں یہاں استحکام کے مسئلے سے منحرف ہو رہا ہوں۔ اور مجھے وہیں واپس آجانا چاہیئے۔ آبادی کے اعتبار سے ایک مستحکم معاشرہ کو وجود میں لانے کے تین طریقے ہوسکتے ہیں (۱) ضبطِ تولید (۲) طفل کشی یا بے حد ہلاکت خیز جنگیں اور (۳) ایک ایسی صورت جس میں ایک طاقتور اقلیت کو چھوڑ کر فاقہ کشی ہو۔ یہ تمام طریقے مختلف معاشروں میں آزمائے جاچکے ہیں۔ مثال کے طور پر پہلا طریقہ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں نے آزمایا ہے۔ دوسرا طریقہ یعنی طفل کشی آریائی قبائل، اسپارٹا کے باشندے اور افلاطون کی ریاست کے حکمراں آزما چکے ہیں۔ تیسرا طریقہ سویٹ روس میں اور اس دنیا میں آزمایا جاچکا ہے جس کو مغرب کے بین الاقوامی پیدا کرنے کی امید رکھتے ہیں۔ (یہ خیال کرنا غلط ہے کہ ہندوستانیوں اور چینیوں کو بھوکا مرنا پسند ہے۔ انہیں یہ سب کچھ اس لئے برداشت کرنا پڑتا ہے کہ مغرب آلاتِ جنگ ان کے لئے بے حد طاقتور رہیں۔)

ان تینوں طریقوں میں ضبطِ تولید ہی ایک ایسا طریقہ ہے جو انسانوں کی اکثریت کو تکلیف پہنچائے بغیر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جب تک عالمی حکومت قائم نہ ہوتی مختلف قوموں کے درمیان اقتدار کی کشمکش جاری رہے گی۔ اور جیسے جیسے آبادی میں اضافہ خطرناک حد تک کی طرف بڑھے گا قومی اقتدار ہی صرف ایک ایسا ذریعہ بنا جائے گا جس کے ذریعہ قحط کی روک تھام کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ایسے بلاک بن جائیں گے جن میں بھوکی اقوام خوشحال اقوام کے خلاف متحد ہوجائیں گی۔ چین میں کمیونزم کی فتح کا یہی سبب تھا۔

یہ تمام باتیں ثابت کرتی ہیں کہ ایک عالمی سائنسی معاشرہ اس وقت تک مستحکم نہیں ہوسکتا جب تک ایک عالمی حکومت وجود نہ ہو۔ اس نتیجہ کو جلد بازی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ جو کچھ باتیں اب تک کہی گئی ہیں ان سے براہِ راست نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب تک ایک ایسی عالمی حکومت نہ ہو جو ضبطِ تولید کو عالمی طور پر نافذ کرے ایسی جنگیں ناگزیر ہوجائیں گی جن میں شکست کے جرم کی سزا قحط کی موت ہوگی۔ بالکل یہی صورت موجودہ دنیا کی ہے اور ایسے لوگ موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ یہ حالت صدیوں تک برقرار رہے گی۔ میں خود یہ خیال نہیں کرتا کہ یہ ممکن ہے۔ عالمی جنگوں نے دنیا کے بہت سے حصوں کے معیارِ زندگی کو گرا دیا ہے آئندہ جنگ اس سلسلے میں یقیناً اور بہت کچھ کرے گی۔ جب تک کسی دور میں کوئی ایک طاقت یا طاقتوں کا گروہ فاتح کی حیثیت سے پوری دنیا میں فوجی طاقت سے حکومت قائم نہ کرے، معیارِ زندگی برابر گرتا جائے گا۔ حتیٰ کہ سائنسی جنگ ناممکن ہوجائے گی۔ یعنی سائنس مفقود ہوجائے گی اور تیر کمان کے دور میں واپس آکر زندگی کے نشے میں سرشار اشرف المخلوقات شاید ایک بار پھر اس تنگ و تاریک رہ گذر پر چل کھڑا ہو جو ایک ایسے ہی بے مقصد انجام پر ختم ہوتی

اگر آبادی کا مسئلہ کسی انسانی طریقے سے حل کیا جاتا ہے تو ڈارون (Darwin) کے اصولوں کے تحت ایک عالمی حکومت ناگزیر ہوجاتی ہے۔ اگر دو ایسے گروہ موجود ہوں جن میں سے ایک کی آبادی بڑھ رہی ہو اور دوسرے کی مستقل ہو اور بقیہ تمام چیزیں مساوی رہیں تو بڑھتی ہوئی آبادی والا گروہ کسی وقت ضرور زیادہ طاقتور ہوجائے گا۔ فتح کے بعد یہ گروہ شکست خوردہ گروہ کی غذائی رسد بند کردے گا۔ اور اس گروہ کے اکثر افراد مرجائیں گے۔ چنانچہ جو اقوام عالمی نقطۂ نگاہ سے ضرورت سے زیادہ مردم خیز ہیں ان کو مستقلاً فتوحات حاصل ہوتی رہیں گی۔ درحقیقت یہ صورت جہد للبقا کی ایک جدید شکل ہے۔ اور اگر تباہی اور بربادی کے سائنسی آلات موجود ہوں تو ایک ایسا معاشرہ جس میں یہ جد وجہد فروغ پائے، مستحکم نہیں رہ سکتا

ہم کہ ہر غم کو طرحدار بنا دیتے ہیں
مرگ آساں کو بھی دشوار بنا دیتے ہیں

کشتگانِ غمِ دوراں کی عجب فطرت ہے
آہ و فریاد کو للکار بنا دیتے ہیں

ایک دنیا جسے ساغر کی کھنک کہتی ہے
ہم اسے تیغ کی جھنکار بنا دیتے ہیں

مقتلِ زیست میں ہنگامۂ آلام کو ہم
رونق کوچۂ دلدار بنا دیتے ہیں

فتنۂ شام و سحر کو بصد آہنگ نیاز
نغمۂ کاکل و رخسار بنا دیتے ہیں

گردشِ وقت کو ہم روز ہی میخانے میں،
کسی محبوب کی رفتار بنا دیتے ہیں

داستانِ دل خوں گشتہ بہت سادہ ہے
لوگ ناقابل اظہار بنا دیتے ہیں

اس کو مشکل سے سمجھتے ہیں نظرؔ اہل خرد
ہم سے دیوانے بھی ہشیار بنا دیتے ہیں

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

وہ انتظار

تھکی تھکی سی یہ شامیں سوادِ مغرب کی
میں رو رہا ہوں ——
کہ ان کی سحر نہیں معلوم
ہجومِ لالہ و گل
و داغہائے دل کہ نہ پوچھ
لبوں پہ چھڑکا ہوا ہر طرف یہ خونِ گلاب
شباب۔ آتشِ لب، چشم نیلگوں کا فسوں،
یہ بوسہائے دراز
وہ حسنِ رفتہ کہ سو سو جتن سے رنگِ قیام
یہ بے قرار نگاہیں، یہ جاگتے سائے
وفا بھی شرما جائے

انہیں غرض ترے مشرق کی سرزمینوں میں
وہ سر پہ برسوں سے آنچل کو اپنے ڈالے ہوئے
ہے انتظار میں کس کے؟ کوئی نہیں آتا
وہ انتظار جو مغرب میں فن نے پیدا کیا
کبھی کبھی بت سنگیں میں بالکیوں میں
وہ انتظار جو آنکھوں لبوں نے باہوں نے
کہا تھا آئیں گے —— لیکن کوئی نہیں آتا
وہ انتظار جو [illegible] نہ ہوا —!
کھلی ہوئی ہیں وہ آنکھیں
کہ تھک گئی ہے نظر
گروہ شام و سحر مشعلیں جلائے ہوئے
تکا کریں یونہی محرابِ روز و شب کے پار
کہ وقت شرما جائے

ہے غم کمال خوشی انتہائے عیش و سرور
جو غم نہیں تو مجھے زندگی نہیں منظور

کبھی کبھی تو ضروری ہے روٹھ جانا بھی
فقط وفا ہی نہیں اہل عشق کا دستور

ملال کیوں ہو جو ملتی نہیں مجھے منزل
یہی بہت ہے کہ حاصل ہے جستجو کا شعور

جہاں میں دعوئ اعلان حق ہے عام مگر
کہاں ہر ایک کو ملتا ہے منصب منصور

عجیب چیز ہے نازش غم محبت بھی!
تمام درد و اذیت تمام لطف و سرور

غزل!

عجب ہے وہ مقامِ جستجو بھی
جہاں میں بھی نہیں ہوں اور تو بھی

نگاہیں جھک گئیں پاسِ ادب سے
انھیں دیکھا نہ اُن کے رُوبرُو بھی

یہ کیا معلوم اہلِ میکدہ کو!
کہ ہم پیتے ہیں بے جام و سبو بھی

تلاشِ منزلِ جاناں ہے سب کو
کسی میں ہے شعورِ جستجو بھی

مثالِ سبزۂ بیگانہ ہیں ہم
ہمیں سے ہے چمن کی آبرو بھی

کلی اس راز سے نا آشنا ہے
ٹپکتا ہے رگِ گل سے لہو بھی

نظر کو جستجوئے رنگ و بو ہے
نظر ہے ماورائے رنگ و بو بھی

○

سحر انصاری

خرد مند سیاست کے نقیب!

(بھارت میں عصمت فروشی پر پابندی کا اعلان سن کر!)

یہ سنا ہے کہ اندھیروں کو مٹانے والے
صبحِ فردا کی امیدوں پہ جئے جاتے ہیں
نہ چراغوں کی لگن ہے نہ تلاشِ مہ و مہر
اور پیغامِ اجالوں کے دیئے جاتے ہیں

•

یہ سنا ہے کہ خرد مند سیاست کے نقیب
شہرِ حسن کو ممنوع کئے دیتے ہیں!
یعنی پیرایۂ عشرت کو روا رکھیں گے
نہ کوئی اذنِ خرامِ بطِ مے دیتے ہیں
اب نہ بازارِ ہوس کی کوئی زینت ہوگی
اب جوانی نہ کہیں جنسِ تجارت ہوگی
اب کوئی کامنی پائی نہ ستارہ بیگم
اور نہ کوٹھوں پہ کسی سیلِ ہوس کا رِکا ہُم

•

سوچتا ہوں کہ دساتیرِ سیاست میں کہیں
ذکرِ یارانِ مے و جامِ ہوس ہے کہ نہیں
جن کی کمزوری لگا ہوں نے چمن سے پوچھا
گل نورستہ میں امید وفا کا رس ہے کہ نہیں

پاسبانانِ جمال و طرب و ناز و غضب!
کس قدر فخر ہے اس طرزِ سیاست پہ تمہیں
تم ہمیشہ روشِ حسن سے مغلوب رہے
پھر بھی اصرار ہے اپنی ہی سیاست پہ تمہیں

حسن بازار بھی خلوت کو سجا سکتا ہے
اس کے احساس کی تلخی تو مٹاؤ پہلے
شبِ مہتاب کو پُر نور بنانے والو!
چاند کے رخ سے اندھیرے تو ہٹاؤ پہلے

کیا کہے تم سے کوئی کیا تمہیں سمجھائے کوئی
تم تو خود اہلِ خرد اہلِ سیاست ٹھہرے
تم کو بھونروں کی ہوسناک تمناؤں سے کیا
تم تو کلیوں کی لطافت پہ لگا دو پہرے

•

وسیم فاضلی

آؤ اے قیدیو کچھ ذکرِ گلستاں ہی سہی
ایک دو لمحے کو تسکین کا ساماں ہی سہی

میرے اشکوں نے بہر طور اماں تو پائی
گوشۂ دل نہ سہی گوشۂ داماں ہی سہی

نام لیکر ترا پی جاتے ہیں میخوار ترے
تلخئ مے نہ سہی تلخئ دوراں ہی سہی

امتحاں اہلِ خرد لیں نہ جنوں کا ورنہ
اپنا دامن نہ سہی ان کا گریباں ہی سہی

مطمئن کیجئے اک بار تو نظروں کو مری
آپ ہر چند کہ نزدیک رگِ جاں ہی سہی

اُن کی خاطر میں انھیں بھول ہی جاؤنگا وسیم
یاد اب ان کی مری زیست کا عنواں ہی سہی

اکرام ملت پوری

وہ مسکرا دیں تو پھول گلشن کے منہ چھپا لیں حیا کے مارے
اگر وہ رخ سے نقاب الٹ دیں تو ماند پڑ جائیں چاند تارے

ہزار ہو ناخدا نگہباں مگر ہیں غرقابیاں یقینی
کہاں شکستہ سا اک سفینہ کہاں یہ طوفاں کے تیز دھارے

کبھی تو آئیں گے ظلمتِ شب میں وہ نئے روشنی کی شمع لے کر
اسی بھروسے پہ جینے والوں نے ہجر کے روز و شب گذارے

بچھڑ کے جانِ بہار تم سے میں ایسا محسوس کر رہا ہوں
کہ جیسے رہ رہ کے کوئی دل پر چلا رہا ہو ستم کے آرے

کبھی جو سینے سے آہ نکلی تو ایک آتشکدہ سا بھڑکا
تری محبت میں ہر نفس میں کچھ اس طرح ہم نے بھی شرارے

چمن سے دورِ خزاں بھی گذرا کھلے شگوفے بہار آئی
مگر نہ اکرام آہ جاگے نصیب سوئے ہوئے ہمارے

شوکت پرویز مسیحی

منزل

قصور وار تو میں ہی تھا۔ میں نے ہی اس سرطی دیوتا کا آپ سے تعارف کرایا تھا۔ اور پھر آپا اسے چاہنے لگی۔ اُجڑے ہوئے شاعر کو۔ مقبول دیولتے کو۔ بے حد بے انتہا۔ اور مقبول کو اس ٹوٹے ہوئے ساز کو نفرت تھی۔ ساز ندوں سے اس اجڑے ہوئے گلشن میں بہار آہی نہ سکتی تھی۔ اسے نفرت تھی عورت ذات سے۔ وہ کسی کو بھی چاہنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ کسی کو چاہ بھی نہیں سکتا تھا چاہے وہ میری آپا ہو یا اس کی اپنی۔ میں تو اس کا مدت سے ہمراز تھا۔ مجھے تو اس کی ذرا ذرا سی بات کا پتہ تھا۔ اس کی تو منزل ہی کچھ اور تھی۔ معیارِ محبت ہی دُنیا والوں سے جدا تھا۔ وہ تو سراپا فرشتہ تھا۔ اس ہنمی دُنیا کے مرطے گُٹے اور مطلبی کا حل سے عاجز آگیا تھا۔ اس نے بھی کسی کو چاہا تھا۔ جولیس کو اور اس سے محبت کرتا تھا۔ لیکن اس کی منزل ہی کچھ اور تھی۔ وہ ان لوگوں سے سخت نفرت کرتا تھا جو شادی کو محبت کی منزل سمجھتے ہیں۔ جو اپنی محبوبہ سے شادی نہ ہو سکنے پر اپنی زندگی سے اکتا جاتے ہیں۔ اور پھر یہی محبت مایوسی، دبی گھٹی آہوں، گرم گرم آنسوؤں اور پھر انتقام کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے نزدیک یہ بوالہوسی تھی۔ ہوس اور تشنگی تھی۔ جولیس کا مقصد اس سے شادی کرنا تھا مقبول کا تو اس میں ذرا برابر بھی قصور نہ تھا۔ اس نے تو لاکھ جولیس کا دل رکھنا چاہا۔ مگر سونے چاندی کی جھنکار، دیو زروں اور اُن پر بیٹھے ہوئے بیوپاریوں کے ملتے اس کی ایک نہ چلی۔ آخر جولیس کی شادی کہیں اور ہو گئی۔ کسی دولت مند بیوپاری سے۔ اور جب وہ اس تقریب پر اُسے مبارکباد دینے گیا تب جولیس نے اس سے بات تک نہ کی۔ پہچانا تک نہیں۔ جیسے جانتی ہی نہیں اسے۔ اپنے محبوب کی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسو دیکھ کر بھی ظالم جولیس کا دل نہ پسیجا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر مجمع میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ دس پانچ لگاہوں نے اسے غنڈہ سمجھ کر گھورا۔ پانچ سات پھبتیاں اڑائیں۔ کئی زیر لب مسکرائے۔ ۔ ۔ ۔ وہ تاب نہ لاسکا اس کا نازک دل محبوبہ کی بے التفاتی سے چکنا چور ہو گیا۔ اسے دھچکا لگا اور وہ متنفر سا رہنے لگا۔ عورت ذات سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپا کا اسے ذرا بھی دھیان نہ تھا۔ اور ادھر وہ ہلکان ہو رہی تھی۔ جان وار رہی تھی۔ اس اُجڑے آرٹسٹ پر۔ اس خزاں رسیدہ درخت پر جسے نہ جفا کی عادت نہ وفا سے مطلب ایک دبی ہوئی چنگاری۔ وہ دیوانہ تھا۔ پاگل۔ جس کی تمنائیں روندی جا چکی ہوں۔ اور ان کی جگہ ارمانوں کی سسکتی۔ دم توڑتی چنگاریاں اسے خاکستر کر رہی ہوں۔ جب کوئی سانحہ اس اُجڑے ہوئے ساز کو جھنجھوڑتا۔ اس کے جذبات کی دبی ہوئی چنگاریوں کو کریدتا۔ تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا بوالہوس جولیس کی یاد میں۔ اس کی بے رونق آنکھیں آنسوؤں کی وہ جھڑی لگاتیں کہ سمندر بھی پانی پانی ہو جائے۔ وہی آہیں۔ اور آنسو ایک سوز بن جاتا اور وہ سُلگتے ہوئے۔ جذبات سے متاثر ہو کر جھومتے۔ خراج تحسین پیش کرتے ــــــــــ اور پھر وہی دیوانگی، جنون اور ویرانی۔ خاموشی اور اُپنا۔ اور آپا اسے چاہتی تھی۔ کتنا عجیب اتفاق تھا یہ۔

یہ سب میری ہی وجہ سے تو ہوا تھا۔ میں نے ہی اس کا تعارف آپا سے کرایا تھا۔ اس کی تعریفیں کی تھیں۔ بیکار کی ڈینگیں ماری تھیں اس۔

متعلق ۔ اور آپا۔ وہ تو میری باتوں کا مذاق اُڑا رہی تھی ۔ اس کی سہیلی پولینا اور اس نے بھی مل کر ہمارا مضحکہ شروع کر دیا ۔ آخر میں بھی تو انسان ہی طیش آگیا ۔ "اچھا تو دیکھ لینا ۔" اگر اب کے مشاعرے میں اس کی نظم اول نہ آئے تو میرا نام بدل دینا ۔ آپا نے چٹکی لی ۔ "بھئی روپے پیسے کی شرط لگاؤ تو بات ہے ۔ نام وام کیا بدل دینا ۔ اگر ایلن سے جوزف بھی ہو گئے تو کیا بگڑے گا تمہارا ۔" پولینا بھی چہک اٹھی ۔ پوتی مجھے معلوم ہے کتنے پانی میں ہیں ۔ بھائی جان اور ان کے دوست گپتی کہیں کے ۔ باتیں تو ایسی کرتے ہیں جیسے آسمان سے ستارے توڑ لائیں گے ۔ مان کا دوست ۔ اور یہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں ۔ میں بوکھلا سا گیا ۔ فرط اضطراب سے پاؤں پٹختا کمرے سے باہر نکل آیا اور سائکل اُٹھا کر بھاگا ۔ میں نے مقبول سے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے دھڑ کی بازی لگی ہوئی ہے ۔ نام رکھ لینا ہمارا ۔ وہ ہلکے سے مسکرایا حسب عادت ۔ "تم بھی نرے چغد ہی ہو ۔ ارے میں کون سا غالب کا جانشین ہوں جو تم شرطیں لگاتے پھرتے ہو ۔ اور پھر بانسی بھی ناگنوں سے ۔" "بھئی میں کچھ نہیں جانتا ۔ یہ نظمیں کہ ناہی ہو گا ۔ بس لکھ ڈالو پھڑکتی ہوئی سی ۔"

مشاعرے میں صرف دو تین روز باقی تھے ۔ لیکن وہ بالکل پُرسکون تھا ۔ بے حس و بے حرکت ۔ غزل تو اس نے شروع تک نہ کی تھی ۔ جیسے میری شرط کوئی چیز ہی نہ تھی ۔ میں دن میں کئی مرتبہ اُس کے پاس جاتا ۔ اپنے دماغ سے نت نئے خیالات سجھاتا ۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوتا ۔ جیسے میری شرط کچھ مطلب ہی نہیں رکھتی ۔ میرے ذہن میں ان شریر لڑکیوں کے طعنے کلبلاتے ۔ قہقہے گونجتے اور نگاہوں میں طنز بھری مسکراہٹ چمکتی ۔ مجھے کامل یقین ہو چلا تھا کہ یہ خشکی تو مجھ لکھنے کا نہیں سب کا خفت اٹھانی پڑی ۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ تو کچھ لکھتا ہی نہیں تو میں نے دماغ پر کئی گھنٹے زور ڈال کر دس پانچ اشعار لکھے اور تنبیہی بگھارنے کے لئے آپا کے پاس لے گیا ۔ آپا دیکھو یہ نظم جو ہمارے دوست پڑھیں گے ۔ سناؤ ۔ اس نے حاکمانہ لہجے میں کہا ۔ میں نے ایک ہی شعر پڑھا تھا کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں ۔ "کیا تُک بندی ہے ۔ ایک مصرع بانجھ ہے تو دوسرا کبوتر ۔ ۔ ۔ ۔ واہ واہ ! کیا کہنے ہیں تمہارے دوست کے ۔ ضرور انعام حاصل کرے گا ۔" "ارے تمہارے دماغ میں تو بھس بھرا ہے ۔ یہ بلینک ورس ہے ۔ بلینک ورس ۔ کبھی شاعری کی ہو تو جانو ۔" "جی ہاں ۔ بلینک ورس ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا چلو مانا ۔ لیکن یہ گھٹا ٹوپ بادل میں غریب چاند اور تارے کہاں سے آ گئے ۔ بھئی واہ یہ اچھی رہی تمہاری بلینک ورس ۔" اور میں کٹ ہی تو گیا ۔ میں نے بھی مقابلہ کرنا چاہا مقبول کا ۔ مجھ سے کہتے ہی بنا کہ یہ نظم تو میری لکھی ہوئی ہے ۔ اس کی نظم دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی ۔ اور آپا ہنس پڑی جیسے مجھے دانت چڑا رہی ہو ۔ کہ دونوں ہی اُلّو ہو ۔ کاغذ کے ہوائی جہاز ۔ ـــــــــــــ

مشاعرے کے دن ہم سب اگلی نشست میں ساتھ ساتھ بیٹھے ۔ وہ چلبلی پولینا اور آپا اب بھی مذاق اُڑا رہی تھیں ۔ اس برباد فن کار کا ۔ اور اسے ہاں ۔ شاید اسے ہم میں سے کسی کی بھی پرواہ نہیں تھی ۔ صاحب صدر نے آخر مقبول کا نام پکارا ۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا ۔ آنکھیں اسٹیج پر گڑ گئیں ۔ اور وہی دیوانہ شاعر آن کی آن میں لاؤڈ اسپیکر کے سامنے کھڑا ہوا ۔ اور اس نے نظم تیار کر لی تھی ۔ کب ۔ کس وقت ۔ ۔ ۔ ؟ وفور مسرت سے میرے دونوں ہاتھ آپ ہی آپ تالیاں بجانے لگے ۔ آپا اور پولینا میری اس حرکت پر سخت نادم ہوئیں ۔ مگر کیونکہ کئی ایک بھیڑ چال حاضرین نے ان تالیوں کا ساتھ دیا اس لئے معاملہ رفع دفع ہو گیا ۔ جیسے جیسے وہ اشعار پڑھتا جاتا تھا ۔ ویسے آپا کا چلبلا پن ابدی نیند سونے لگا ۔ ان کا سانس تیزی سے چل رہا تھا ۔ اس کے ایک ایک شعر میں وہ بے کلی ؛ وہ تڑپ تھی کہ سننے والے جھوم جھوم گئے ۔ الفاظ تو سب کے ایک سے ہی ہوتے ہیں ۔ یہ تو شاعر کی اپنی روح ہوتی ہے جو ان میں جان ڈال دیتی ہے ۔ بغیر سازندے کے ساز کس کام کا ۔ بغیر مصور کے رنگوں کی ترتیب ہی کیا ۔ میں جانتا تھا کہ ان اشعار میں وہ چوٹیں تھیں جو جولیس کی بے وفائی نے اس کے دل پر لگائی تھیں ۔ اور اس کا آشیانہ مسرت جیسے تنکے تنکے ہو کر زمین پر آ رہا تھا ۔ اس نے آج اپنی ٹوٹتے ہوئے دل کی کرچوں کو کچھ اس طرح حاضرین کے سامنے پیش کیا تھا ۔ کچھ اس ادا سے کہ آرٹ کی داد دینی ہی پڑے ۔ خیر ۔ مجھے تو اس وقت اپنی فتح سے زیادہ سروکار تھا ۔ مجھے انجام کی کیا فکر ۔ مجھے کیا علم کہ میری یہ فتح آپا کی زندگی میں تلخیاں گھول دے گی ۔

مقبول ایک ٹوٹا ہوا ساز ۔ اُجڑا ہوا نشیمن ۔ وہ اس کے تڑپا دینے والے اشعار طوفان سے زیادہ پُرخروش اور دیپک راگ سے زیادہ پُرسوز ۔ جو دل چھین لیتے تھے ۔ افسوس ۔ کہ آپا کا دل بھی چھین لیا تھا ۔ کچھ اس طرح قوت و اعتماد کے ساتھ کہ اس سے انکار بھی نہ بن پڑا ۔ اور آپا اُسے

چاہنے لگی بے حد، بے انتہا۔ ایک روز اس کی ہستی کو یکسر تقیہ بنا دیا تھا۔ اب اسے چاہنے لگی۔ پھر جب کبھی دوران گفتگو میں اس کا نام زبان پر آجاتا
زرد وہم الجھی۔ لرز جاتی۔ کپکپی سی چڑھ جاتی سارے بدن میں۔ چہرہ زرد پڑ جاتا۔ جیسے کوئی چھین لے، برباد کر دے۔ اس امتداد نے ہوتے پریم
کو۔ اس الجھی ہوئی چاہ کو۔ پھر بھلا کیا ممکن تھا کہ وہ پریم چھپا سکے۔ آپا نہ جانے گھبرائی گھبرائی سی رہتی۔ بوجھل، نیند سے جنگ کرتی ہوئی آنکھیں
یونہی کسی کے کھوج میں مبتلا رہتیں۔ اور وہ دیوانہ شاعر کئی ہفتے ہمارے گھر نہ آیا۔ ایک دن آپا پوچھ ہی بیٹھی۔ "وہ تمہارا دوست نہیں آیا بھائی؟"
انعام اور شہرت انسان میں غرور پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھو۔ ایک بار بھی تو نہیں آیا تم سے ملنے۔" "اسے بھی یوں کیوں نہیں کہتیں کہ تمہارا دل اس سے ایک
غزل سننے کو بیتاب ہے۔" میں نے حسب عادت چٹکی لی۔ "اے ہے بڑا ہے نادہ جو میں اس کی غزل کو ترسوں۔" زبان سے تو کہہ گئی مگر دل نے ساتھ
نہ دیا۔ مبادا میں مقبول سے کہہ دوں اور وہ ناراض ہو جائے۔ ایک روز کسی بہانے سے اسے بلا ہی لایا۔ حسب دستور خاموش اور اداس تھا۔
یہی اس کی دلکشی تھی۔ آپا نے خود چائے بنائی اور ناشتہ تیار کیا۔ چائے پی جا چکی تو ہم سب گپ شپ میں مشغول ہو گئے۔ ہر لحظہ آپا میری جانب دیکھتی کہ
میں اس سے غزل کی فرمائش کروں اور میں ہر مرتبہ ٹال جاتا۔ چٹکیاں لیتا۔ آخر جب حد ہو گئی تو میں نے مقبول سے فرمائش کی۔ اس نے حسب
عادت مسکرا کر، دو ایک مرتبہ کھانس کر غزل سنانی شروع کر دی۔

پھر کئی ہفتے گزر گئے۔ آپا ہر وقت کچھ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ جب کبھی میں اسے بلاتا۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتا تو گھبرا سی جاتی جیسے میں
نے اسے چوری کرتے پکڑا ہو۔ کانپ سی جاتی۔ جیسے مجھ سے کوئی اندیشہ ہو۔ اگر میں نے کہیں کتاب یا کاپی مانگ لی تو عجیب بدحواسی سی طاری ہو جاتی۔
جس میں گھبراہٹ، بہانہ سازی پر غالب آتی نظر آتی۔ کتابوں۔ کاپیوں پر جگہ جگہ رنگ برنگی پنسلوں سے "ایم" (M) لکھا ہوتا۔ ایک دن تو میں نے
چادروں، تکیے کے غلافوں اور یہاں تک کہ اس کے بلاؤز پر بھی 'ایم' لکھا ہوا دیکھ لیا۔

ایک دن جب میں اور مقبول سیر و تفریح کے بعد گھر واپس آ رہے تھے، تو اس نے مجھ سے کہا۔ "بھیا برا نہ مانو تو کہوں۔ مجھے تمہاری آپا بہت اچھی
لگتی ہیں۔ بہت نیک اور سادہ دل ہیں وہ۔ میرا عورتوں کے متعلق نظریہ بدل رہا ہے۔ جولیس اور ان میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔ جب وہ گفتگو
کرتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شمع لئے آگے آگے چل رہا ہو۔ اور میں غم کے اندھیرے سے خوشی کے اجالے میں آ رہا ہوں۔ کتنی بے لوث اور
وفا آشنا ہے ان کی محبت۔" وہ کتنا سادہ دوست تھا۔ کتنا سچا اور صاف گو انسان جو ایک ہندوستانی بھائی کے سامنے اس کی بہن کے متعلق یوں،
بے دریغ گوہر فشانی کر رہا ہے۔ مجھے اس کے خلوص اور سادگی سے عشق تھا۔ میں نے کہا۔ "مقبول مجھے تمہارے جذبات کا احترام ہے۔ اور دوست کی
حیثیت سے تمہیں خوش و خرم بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپا کی مدد سے تم اس اداسی کے لبادے کو اتار پھینک سکتے ہو تو تمہیں اس سے ملنے میں کوئی
بندش نہیں۔"

پھر ایک روز جب کہ سورج غروب ہو رہا تھا میں کمپنی باغ میں ایک بنچ پر بیٹھ کر سستانے لگا۔ سامنے گلاب کے پودے میں سرسراہٹ
سی ہوئی اور پھر دو سائے نظر پڑے۔ "ڈیزی"، اول تو تمہیں مجھے خط بھیجنے کی ہی کیا ضرورت ہے۔ جب میں تم سے روز ہی مل لیتا ہوں۔ اور پھر
کل والا خط تو ضرور قابل اعتراض تھا۔ آخر تم چاہتی کیا ہو۔؟" یہ مقبول تھا۔ کچھ دیر پھر خاموشی رہی۔ پھر مقبول بولا۔ "تمہاری آنکھوں میں چھلکتے
آنسو اور جذبات کی طغیانی مجھے مجبور نہیں کر سکتیں کہ میں اس آگ میں کود پڑوں جسے دنیا شادی کے نام سے پکارتی ہے۔ جہاں محبت سسک سسک
کر دم توڑ دیتی ہے اور برائی بھی اپنا دامن پھیلاتی ہے۔ شادی کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے جسم ایک دوسرے کے ہر وقت نزدیک رہیں۔ اور ہماری محبت
میں بیزاری کی سی نفسیات داخل ہو جائیں۔ تمہارے حسن کی تجارت میری جانی سے ہو۔ کیا محبت کا معیار جسمانی خواہشات ہی پر مبنی ہے؟
"دنیا میں رہ کر دنیاداری کی سی باتیں کرو۔ مقبول!" آپا نے رک رک کر کہا۔
"ڈیزی! کاش تم محبت کے رتبے کو سمجھتیں۔ اس منزل کی بابت خیال آرائی کرتیں جسے پیار کی منزل کہا جاتا ہے۔ کیا تم نے اپنی کتابوں

ی نہیں پڑھی جس نے اپنی محبوبہ کو شکلی دیکھنے کی خاطر اس کے خاوند ڈاکی جان اپنی جان دے کر بچائی تھی ۔
اُف . . . . . . اتنے سنگ دل نہ بنو مقبول ! میری طرف دیکھو ۔ میرا خیال کرو !" آپا کی آواز بھرائی . . . . تم . . . تم . . . . دنیاداری
دی . . . . محبت کا جنازہ ۔ تم میں بھی جولیس کا عکس ہے ۔ تمہیں بھی اصلیت کے بجائے سراب سے عشق ہے ۔ تمہاری محبت بھی انتقام میں تبدیل
ہے کیونکہ تم عورت ہو . . . . ناگن . . . ناگن جسے چاہتی ہے ڈس . . . .
مقبول ـــــ ! آپا روندے ہوئے گلے سے چلائی ۔ وہ آخری لفظ کسی قیمت پر بھی سننا نہ چاہتی تھی ۔

جونؔ ایلیا کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ

واعظو! مرگِ زندگی کا عذاب
زِندگی کے عذاب سے کم ہے

زندگی کا عذاب جونؔ ایلیا کی شاعری کا
موضوع ہے ـــــــ

(زیرِ طبع)

"زندگی کا عذاب" جو زندگی سے کم
نہیں ـــــــ

ادارۂ ذہنِ جدید کراچی

طنزیہ

احمد جمال پاشا

ہدایت نامہ طلبہ بے تصویر

یہ چنداں سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ امتحان میں سوائے اس کے اور کسی خاص چیز کی ضرورت نہیں ہوتی کہ بس اس کو پاس کر لیا جائے - اور اس
کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ طالب علم اور ممتحن دونوں ایک دوسرے کی نالائقی سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں - اصل میں امتحان کی
دو بار کرنی پڑتی ہے - یعنی امتحان سے قبل نمبر لانے کے لئے، پہلی تیاری کچھ ان ڈور قسم کی ہوتی ہے - مگر دوسری خالص آؤٹ ڈور ہوا کرتی ہے - جس
تیاری سے زیادہ بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے --- اور بڑی زحمتوں کے بعد چند رحمتیں ہاتھ آتی ہیں - اسی سبب سے امتحان پاس کرنا ایک مستقل فن قرار
گیا ہے - اس فن کے بارے میں ہم چند انکشافات کرنا چاہتے ہیں -

یعنی جب آپ امتحان دینے کی نیت سے بخیر و خوبی موقع امتحان پر پہنچ جائیں اور پرچہ بلا ترکیب استعمال آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے
کوشش کیجیے کہ بغور پڑھ لیا جائے - اگر ممکن ہو تو مستقل تین گھنٹے تک غور کیا جائے - کیونکہ ہماری زندگی میں غور و فکر کا مقام بہت بلند مانا گیا
سماج مفکرین کو بڑے رشک کی نگاہ سے دیکھتی ہے - کتنے اس غور و فکر کے بل پر پیر روشن ضمیر ہو گئے - عرفان حاصل کرنے کے لئے آپ کو یہ بھی طے کرنا
کہ آخر آپ کون کون سے سوالات کریں - سوالات کا انتخاب کرنا ایک ضروری عمل تسلیم کیا گیا ہے - اگر اس جانب داری پر آپ کا ذہن راغب نہ ہو تو
کہ آپ فارن ایڈ حاصل کیجیے - یعنی اپنے برابر یا آگے پیچھے والے کسی بھی شریک کار کی طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالئے کہ اس وقت وہ کون سے
میں مصروف جواب ہیں - واضح ہو کہ اس موقع پر نروس ہوتے، پرچہ کے سامنے تھر تھر کانپنے، بار بار پسینہ پونچھنے، کھنکارنے، گلا صاف کرنے -
نیچے سروں میں سیٹی بجانے سے حتی الامکان پرہیز کیا جائے - ایسا کرنے سے نقصان ہو سکتا ہو جائے گا - اور آپ کو جواب دینے میں بجائے "اپنا
کے جو آپ اپنے ہمراہ مصلحے سے لے آئے ہوں اور اپنے ماحول سے پوچھ کچھ تاک جھانک سے جو کچھ آپ حاصل کرنے کے حق دار ہوں گے
سے بھی آپ کو یک لخت محروم ہونا پڑے گا - سوال کرنے سے قبل پرچہ کا پرنٹ دیکھئے - اگر جواب دینے کا آپ بالکل تہیہ کر چکے ہوں تو
کو اس طرح ترتیب دیجیے کہ پہلے بے ڈھنگے جوابات، پھر غلط جوابات اور بالکل آخر میں وہ جوابات جن کو آپ کا ارادہ لکھ کر کاٹ دینے
کرتے وقت اس بات کی احتیاط رکھیے کہ سوال لکھ لکھ کر کاٹے نہ جائیں - ورنہ اس سے بہتر ہے کہ صرف وہی سوال کیجیے جو آپ کو بعد
یا جن کے بعد میں کٹ جانے کا خطرہ نہ ہو - یا سرے سے لکھیے ہی مت جو کاٹ پیٹ تک نوبت پہنچے - اگر آپ کو صرف چھ سوال کرنا
طرف چھ سوال ہرگز مت کیجیے کیونکہ یہ صرف بڑا خطرناک ہوتا ہے - اسے ہرگز مت کیجیے -

اگر سوال کچھ اس قسم کا ہو کہ .

(الف ۱۱ کراچی)

"سرور اور مجنوں کی تنقید میں نظریاتی آہنگ سے بحث کیجئے۔"

تو اس کو اس انداز سے شروع کیجئے۔

"دُنیائے فسانہ و فسوں۔ نقد و اُدھار کی ہنگامہ ہائے ہاؤ ہو کی بوقلمونی شعر و ادب کے اوجِ ثریا پر قسامِ ازل نے بقائے دوام کی دو آرام کرسی ہائے زرنگار ٹکیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔"

بڑے گُر کی بات ہے یاد رکھئے کہ انشا پردازی اور لفاظی کا جتنا رعب ممتحن پر پڑتا ہے بعد میں سفارش پہنچانے کا اس سے آدھا اثر بھی مرتب نہیں ہو پاتا۔ بلاشبہ اگر با ترتیب نتائج نکالے جائیں اور ان کا اوسط بھی نکال لیا جائے۔ تب بھی ہرگز اطمینان بخش نہ ثابت ہو سکے گا۔

چونکہ ممتحن نہایت کاہل ہوتا ہے اس لئے اگر آپ اس کا ذرا سا وقت بھی ضائع کر دیں تو وہ فوراً مغلوب الغضب ہو جائے گا اور جتنا جلد آپ اس کو بات دے دیں گے اسی قدر وہ آپ پر مہربان ہوگا۔

لیکن اگر آپ نے اس سے گھر بیٹھے مفت کی خاک چھنوائی اور مجبور کیا کہ وہ آپ کی کاپی کے سلسلے میں کسی کچہری کے منشی "جو خطِ شکستہ کے پڑھنے میں ید طولیٰ رکھتا ہو" کی خدمات حاصل کرے۔ یا آپ نے اس جارحانہ طریقے سے اپنی معلومات کا مظاہرہ کر دیا ہے کہ اس کو ڈھونڈنے سے انسائکلوپیڈیا میں بھی پناہ نہ ملے اور وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جائے تو پھر آپ کی خدمت کی گنجائش بہت کم رہ جائے گی۔

اگر کوئی لفظ یا محاورہ اتفاق سے آپ کو یاد نہیں آ رہا ہے تو فوراً بیٹھے بیٹھے ایجاد کیجئے۔ اس تازہ ترین انکشاف سے نہ صرف آپ کے نمبر دے دیے جائیں گے بلکہ خود زبان میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو جائے گی۔ اگر آپ سے آبِ زمزم کے بارے میں پوچھا جائے تو لکھئے کہ "بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ میری ان سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تھی آج کل یورپ کے دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ شاہ سعود سے ان کے تعلقات بڑے خوشگوار رہیں۔ آبِ زمزم کو پرانے سکے اور چھتریاں جمع کرنے کا شوق ہے۔ خدا سر دے تو سودا۔۔۔۔۔۔"

ساتھ ہی اگر آپ سے لگے ہاتھوں یہ بھی پوچھ لیا جائے کہ اس کو جملوں میں استعمال کرو تو لکھئے۔ "آبِ زمزم سے میں بڑی دیر تک بے تکلف باتیں کرتا رہا۔ وہ باتیں راز کی ہیں جن کے انکشاف کا محل نہیں۔" غرض اس خوبصورتی اور لیاقت سے لکھئے کہ پتہ ہی نہ چلے کہ آپ کون سی غلط بات کس موقع پر اور کہاں لکھ گئے۔

خوش خطی کا ضرور خیال رکھیئے۔ اگر کاپی گندی ہو جانے کا زیادہ خطرہ ہو تو بہتر ہے آپ بالکل کوری چھوڑ آئیے۔ کیوں کہ یہ طے ہے کہ ایسا کرنے پر بھی صفائی کے نمبر تو کہیں گئے نہیں۔ ورنہ ممتحن کوشش کرے گا کہ آپ پاس نہ ہوں۔

اگر آپ کو پانچ سوالات کرنے کو دیئے جائیں تو آپ آنکھ بند کر کے ان کو چھ سوال تسلیم کر لیجئے۔ کیوں کہ آخر میں ایک مزید سوال کرنا اشد ضروری سمجھا جاتا ہے۔ دراصل اس میں خود ہی سوال اٹھایا جاتا ہے اور خود ہی جواب بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں ممتحن سے درخواست کرنی پڑتی ہے کہ امتحان تو اب ہم دے چکے۔ ہمارا کام ختم اور آپ کا فرض شروع ہوا۔ یعنی اے ممتحن اب جب کہ ہم امتحان دے چکے ہیں، اب تو خدا کے واسطے اور رسول کے صدقے میں پاس کر دے۔ ع

اگر پاس کر دے تو کیا بات ہے

گھر کی مالی حالت کا دلسوز نقشہ مصنف 'غمِ زندگی' کے پُر درد انداز میں۔ پھر یہ کہ "زندگی کا یہ آخری امتحان ہے۔ پورے خاندان کے مستقبل کا انحصا[ر]
نی" کاپی پر ہے۔ گھر سے نکال دیا جاؤں گا۔ خودکشی کر لوں گا، سرسام کی حالت میں امتحان دے رہا ہوں۔ دل، دماغ، ہاتھ، پیر و جملہ اعضا
باغی ہو چکے ہیں۔ چکر پر چکر آ رہے ہیں۔ نظروں کے آگے اندھیرا چھا رہا ہے۔" وغیرہ کی تفصیل نہایت ڈرامائی انداز سے پیش کیجئے۔ یاد رکھئے اس
بے حد متاثر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیجئے کہ آپ بہت بڑا تیر مارنے جا رہے تھے مگر افسوس صد افسوس کہ وقت عین وق

ختم ہوگیا۔ کاپی آپ سے دیدہ و دانستہ چھینی جا رہی ہے۔ ثبوت کے طور پر آخری لفظ کسی بھی اونٹ یا کنگارو سے ملتا جلتا جہازی سائز کا، اس طرح صفحے پر بنا دیجئے جس سے نہ صرف ممتحن کو یقین آجائے کہ واقعی وقت ختم ہوگیا ہوگا اور اس کی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہوجائیں گی بلکہ آپ کی کاپی ایک اور صفحہ بھر جائے گا۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ممتحن نہایت مصروف انسان ہوتا ہے جو عبارت نہیں پڑھتا بلکہ نکتے تلاش کرتا ہے۔ بس شروع میں دل کڑا کر کے ایک آدھ بات قاعدے کی لکھ دیجئے۔ اس کے بعد مال گاڑی کی طرح گذرتے چلے جائیے۔ جو دل میں آئے لکھئے۔ صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالئے۔ کچھ پرواہ مت کیجئے کیونکہ ممتحن آپ سے زیادہ اس بات کو جانتا ہے کہ آپ سے صرف وہی باتیں پوچھی جاتی ہیں جو آپ نہیں جانتے۔ اور بس آخر میں تھوڑی بہت باتیں قاعدے کی لکھ دیجئے۔ کیونکہ ممتحن پہلا پیراگراف دیکھتا ہے پھر صفحے گنتا ہے۔ اور آخری پیراگراف دیکھنے کے بہانے نمبر دے دیتا ہے۔

مثلاً اگر سوال ہے :-

ع ۔ یہ مجبور بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا۔

(الف) پھر وہ کون سی دنیا ہے؟ صاف صاف بتاؤ۔ اس میں چنداں فرمانے کی ضرورت نہیں

(ب) قاعدے کے اعتبار سے بتاؤ۔ یہ دنیا اچھی ہے یا وہ دنیا؟

(ج) صوتی اور لسانی نقطۂ نظر سے بحث کرو کہ اس میں کتنے عربی، فارسی، برج بھاشا اور اردو کے الفاظ ہیں۔ ان کے مخرج کا پتہ لگاؤ، نیز ان میں کتنے حروفِ علت و حروفِ صحیح ہیں۔؟

(د) تقطیع کے ذریعہ ثابت کرو کہ یہ مصرع بحرِ زخار میں ہے۔

(س) اس مصرع سے بحث کرتے ہوئے اقبالؔ کی شاعری پر روشنی ڈالو اور بتاؤ کہ یہ کس کا شعر ہے؟

عموماً اس قسم کے دل آزار سوالات بڑے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ مگر ممتحن کو اس میں مزا آتا ہے کہ ہم الٹے سیدھے جواب لکھ آئیں اور پھر فیل ہوجائیں۔ شعر پوچھنا بڑی اچھی بات ہے۔ مگر گڑبڑ یہ ہے کہ ان کے معنی بھی پوچھ لئے جاتے ہیں۔ اور سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے۔

اگر پرچہ تنقید کا ہے تو اپنے جواب میں زور پیدا کرنے کے لئے کسی نہ کسی نقاد کے قول یا خیالات کا ضرور تذکرہ کیجئے۔ مثلاً سرورؔ یا احتشام کے اقتباس سے بات شروع کیجئے۔ اگر آپ کچھ بھی ان حضرات سے منسوب کر کے لکھ دیجئے گا تب بھی غلطی نہیں پکڑی جا سکتی کیونکہ ان حضرات نے ہر موقع پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ آپ کسی جماعت سے کسی جماعت میں بھی پہنچ جائیے۔ مگر پھر بھی ان حضرات سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ مگر اس کا فارمولا نہایت آسان ہے۔ اگر آپ احتشام صاحب کا حوالہ دے رہے ہیں تو بات طبقاتی کشمکش سے شروع کیجئے اور سماجی و مارکسی نقطۂ نظر پر زور دیجئے۔ اور گھما پھرا کر جدلیاتی مادیت، شعور اور وجدان کی بات ضرور لائیے۔ اگر سرورؔ صاحب کا حوالہ تیار کرنا ہے تو بات جبتِ ہزار شیوہ کے رنگ محل سے شروع کیجئے۔ اس پر خاصہ اصرار کیجئے کہ ہم پسی ہوئی کلیوں سے آئینہ نہیں بنا سکتے جس کے لئے فی الحال بے مد فرد سی ہیں۔ مگر "درد و داغ و جستجو" کے لئے بہ حیثیتِ مجموعی اس کاروانِ کیف و مستی کو ذرا آہستہ لے چلئے۔ اس نئے تہذیبی آئینہ بندی کی پیوندکاری بھی کرتے چلئے۔ خانقاہ، دربار اور بازار کے سرے نہ چھوڑیئے۔ پھر غمی سے کی شبنمی نگاہ . . . . جلوۂ صد رنگ کے گیت برابر تبدیل کرتے رہیئے۔ ممتحن بھی سوچے گا۔ یعنی ضرور کہا ہوگا۔ ممتحن کا آپ کے حق میں اتنا سوچ لینا آپ کے پاس ہونے کے لئے بہت کافی ہے۔

اگر شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے تو یہ ہرگز مت لکھئے کہ معشوق کہتا ہے ورنہ ممتحن سمجھے گا کہ آج کل آپ بجائے پڑھنے لکھنے کے عشق فرماتے ہیں۔

انگریزی کے پرچے میں زیادہ پاپڑ بیلنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس میں غلطی ہونا فطری بات ہے۔ انگریزی آپ کی مادری زبان نہیں۔ اگر غلطی نہ کرنے پر مُصر ہوں تو ممتحن کو آپ کی جانب سے سخت مایوسی ہوگی۔ بس یونہی سیدھے سادھے طریقے سے اس پرچے کو انجام دیجئے۔ جیسے اگر غریب (POOR) کی

پارزنگ کرنے کو آجائے تو اس سلسلے میں ہمیشہ یہ یاد رکھیے کہ اس کا [illegible] ہمیشہ [illegible] ہوتا ہے۔

الجبرا کو ہمیشہ اچھی نظر سے دیکھیے۔ کیونکہ یہ جھگڑے سے نکلا ہے۔ اس میں جبر کم اور جھگڑا زیادہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے شک ہوتا ہے کہ یہ لکا بلکہ نکالا گیا ہے۔ اگر الجبرا نہ ہو تو دنیا کے سارے جھگڑے یکشت ختم ہو جائیں۔ بس اس میں خیال رکھیے کہ شیر و بکری کو ایک ہی گھاٹ پر پانی پلا کر ایک لاٹھی سے ہنکا دیا جاتا ہے۔ اور زید، عمر، بکر جیسی گمنام ہستیاں اس کے ذریعہ بہت جلد آپ کے پیچھے اور چپکے پڑ جاتی ہیں۔

جغرافیہ میں ہمیشہ اِدھر اُدھر کے مہمل سوالات خواہ مخواہ دریافت کر کے طبیعت کو منغّض کر دیا جاتا ہے۔ جہاں ہمارے دشمن بھی نہ کبھی گئے اور نہ کبھی خدا لے جائے۔ مثلاً خطِ استوا۔ قطب شمالی۔ قطب جنوبی، قطب مینار، قطب ابدال، قطب تارہ اور قطب مشتری وغیرہ۔ یا مثلاً :۔

اپنے شہر کی آب و ہوا، جغرافیہ، پیداوار اور درجۂ حرارت اور رہن سہن بتاؤ :۔

خیر یہ تو آسان سوال ہوا۔ اس قسم کے سوالات سے صحیح قسم کے جوابات کی خاطر خواہ ہمت افزائی کی جا سکتی ہے۔ مگر زیادہ مناسب ہو کہ اس قسم کے سوال پوچھے جایا کریں۔ ” تمہاری نظر میں اگر کسی مقام کا جغرافیہ ہو تو بیان کرو۔ “

اگر تاریخ کا پرچہ ہے تو اس میں چند باتیں قابلِ غور ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اگر بادشاہ ہے تو بادشاہت ضرور کرے گا۔ اگر خراب بادشاہ ہے تو ناپچہ رنگ پڑا رہتا تھا۔ وزیر نہایت نالائق تھا۔ ہر طرف لڑائی مار پیٹ ہوتی رہتی تھی۔ مگر اچھا ہے تو یاد رکھیے اس کا وزیر نہایت عقلمند تھا۔ بادشاہ کا انتظام شاندار رعیت چین سے تھی۔ بادشاہ ہر وقت عمارتیں اور سڑکیں بنوا تا رہتا تھا۔ مجرموں کو معاف کرنا اس کی ہابی تھی۔ جہاں تک دن تاریخ کا تعلق ہے قبل مسیح کی تاریخوں میں اس قدر اختلافات ہیں کہ ہر تاریخ ٹھیک ہوگی۔ مگر بہتر ہوگا کہ بعد از مسیح کی تاریخوں کو خوبصورتی سے گول کر دیا جائے۔

اتنی ہدایات کافی ہیں۔ بقیہ پھر کبھی۔ اگر اس مضمون کو پڑھ کر یا اس پر عمل کر کے ایک لڑکا بھی فیل ہو گیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت سوارت اد قیمتی ملے ٹھکانے لگی۔ ہوا نشانی !

ژالمیر سودربرگ

سلیم عاصمی

آوارہ

"انھیں اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ بادشاہی اور بادشاہوں کی پیام بری۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اپنے لئے منتخب کریں —— اندبچوں کی طرح اُنھوں نے پیام بر بننے کو ترجیح دی۔ چنانچہ اب صرف پیغام بر ہی رہ گئے ہیں جو دنیا میں ایک دوسرے پر بیہودہ سوالوں کی بوچھاڑ کرتے پھرتے ہیں۔ پیغام۔۔ —— جو بادشاہوں کی عدم موجودگی میں یکسر بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ اپنی اس غم انگیز اذیت ناک زندگی کا خاتمہ کرنے کے حد درجہ خواہش مند ہیں۔ لیکن وہ کام کرتے رہنے کی قسم کھا چکے تھے اس لئے اب ایسا کرنے کی جرات نہیں کرسکتے۔"

فرانز کافکا کی یہ چند سطریں میں نے اس لئے نقل کی ہیں کہ ژالمیر سودربرگ کی کہانی "آوارہ" (The Masterless Po) کا مطالعہ کرتے ہوئے میرا ذہن غیر ارادی طور پر ان کی طرف منتقل ہوا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سودربرگ کی یہ کہانی محض ایک ایسے کتے کی داستان نہیں ہے جو اپنے مالک کے مرنے کے بعد اس دنیا میں اکیلا رہ گیا ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ وہ کچھ اور بھی ہے۔

سودربرگ سویڈن کے جدید دور کا عظیم ترین افسانہ نگار ہے۔ وہ زندگی کی غیر اہم باتوں کو اپنے افسانوں کی اساس بناتا ہے۔ اس کا طرزِ نگارش بے حد سادہ بلکہ کسی حد تک غیر دلچسپ ہوتا ہے۔ لیکن اپنے ہر افسانے میں غیر اہم اور معمولی باتوں کی بے رنگ چادر کے نیچے ہمیشہ زندگی کی اعلیٰ اور دائمی اقدار سے متعلق بے انتہا اہم اور غیر معمولی باتیں چھپانے کا اہتمام کرتا ہے۔" آوارہ" محض ایک کتے کی کہانی نہیں ہے۔ وہ زندگی کی بے معنویت کو بڑے پرتپاک اور گرم جوشانہ انداز سے اجاگر کرتی ہے۔ اور یہی قدرِ مشترک ہے کافکا کی مندرجہ بالا سطور اور سودربرگ کے افسانے میں۔ جس کی بنا پر میرا ذہن اس طرف چلا گیا تھا۔ نیز یہ کہ کتے کی یہ کہانی ہم میں سے کسی کی بھی داستان ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس کتے کا کوئی نام نہیں۔ اس کہانی میں کسی کا بھی کوئی نام نہیں ہے —— یہ کتا اس کہانی میں محض ایک کتا ہے۔ مگر وہ ایک انسان بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی انسان۔ سودربرگ ایک ایسے معاشرے پر انگلی اٹھا رہا ہے جو بڑے بڑے شہروں میں لاکھوں انسانوں کو جانوروں کی طرح گھیر کر چھوڑ دیتا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کو تنہائی کے اندھیرے غار میں دھکیل دیتا ہے۔ جہاں کوئی ایک دوسرے کو نہیں جانتا۔ تنہائی کے اس جہنم کی تپش آپ کو اس افسانے میں ملے گی۔ اور یہ حقیقت نظر آئے گی کہ آپ کے ان گنت پڑوسیوں، عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی بھی آپ کے دل کرب سے واقف نہیں —— کون ہے جس کا ذہن اس کہانی کی آخری سطر پڑھ کر کیٹس کی اس لائن کی طرف منتقل نہیں ہوگا:۔

"Where men sit and hear each other groan ——

ایک آدمی مر گیا، اور اس کے مرنے کے بعد کوئی اس کے کالے کتے کی دیکھ بھال کرنے والا نہ رہا۔ کتا بہت دن تک اس شخص کا سوگ مناتا رہا۔ لیکن وہ اپنے مالک کی قبر پر ڈیرے ڈال کر نہیں پڑ رہا۔ شاید اس لئے کہ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ قبر ہے کہاں؟ یا شاید اس لئے کہ وہ اب تک ایک موجی قسم کا خوش و خرم رہنے والا نوجوان کتا تھا۔ اور اسے اس بات کا احساس تھا کہ ابھی زندگی میں اس کے لئے بہت کچھ باقی ہے۔

کتے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کے مالک موجود ہیں اور ایک وہ جن کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ بظاہر تو ان دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ کیونکہ ایک آوارہ کتا پالتو کتوں جیسا تندرست ہو سکتا ہے۔ بلکہ نسبتاً زیادہ بھی۔ فرق تو کہیں اور ہی ہے۔ انسان کتوں کا ازلی رزاق ہے۔ مالک کے حکم کی تعمیل کرنا، اس کے پیچھے پیچھے پھرنا، اس پر بھروسہ کرنا ——— یوں کہنا چاہیئے کہ کتوں کے وجود کا مقصد یہی ہے۔ یہ تو درست ہے کہ مالک ہمیشہ کتے کے ذہن پر سوار نہیں رہتا، اور نہ ہی وہ ہر وقت اپنے مالک کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ بلکہ وہ اکثر ادھر ادھر خود مختاری کے ساتھ کاروبارانہ انداز میں گھومتا رہتا ہے۔ گھروں کے کونوں کھدروں کو سونگھتا پھرتا ہے، اپنے ہم نسلوں میں کلیلیں کرتا ہے۔ اگر کہیں کوئی ہڈی مل جائے تو اسے لے اڑتا ہے اور اسے چوسنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ مگر پھر بھی جیسے ہی اس کا مالک سیٹی بجاتا ہے، اسے بلاتا ہے، اس کے چھوٹے سے دماغ میں سے یہ سب خیالات ایسے بھاگ جاتے ہیں جیسے مندروں میں سے تر دہ فروشوں کو ہنٹروں کے زور سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے سامنے صرف یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف ایک چیز ہے جس کی طرف اسے توجہ دینی ہے۔ اس لئے گھروں کے کونوں کھدروں کو، اپنے ساتھیوں کو، اپنی ہڈی کو بھول کر وہ تیزی سے اپنے مالک کی طرف بھاگ جاتا ہے۔

وہ کتا مدتوں اپنے مالک کے خیال میں رہا۔ اسے اس کے مرنے کا علم نہیں تھا۔ نہ اسے یہ خبر تھی کہ وہ کہاں دفنایا گیا ہے۔ لیکن جیسے جیسے دن گذرتے گئے اور کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا جو اسے مالک کی یاد دلاتا تو وہ اسے بالکل بھول گیا۔ اب وہ اس سڑک پر جہاں وہ رہا کرتا تھا، اپنے مالک کے قدموں کی بو قطعی محسوس نہ کر پاتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب وہ گھاس کے کسی قطعہ پر اپنے ہم نسلوں کے ساتھ کھیل رہا ہوتا تو یکایک کسی سیٹی کی آواز ہوا کو چیرتی ہوئی آتی۔ اور دیکھتے دیکھتے اس کا ساتھی کہیں غائب ہو جاتا۔ پھر وہ اپنے کان کھڑے کر کے غور سے سنتا، لیکن کوئی آواز اس کے مالک کی سیٹی کی سی نہ ہوتی۔ اس لئے وہ اسے بھولتا ہی چلا گیا۔ وہ اور بھی بہت کچھ بھول گیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ کبھی اس کا بھی کوئی مالک تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ ایک وہ بھی وقت تھا کہ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی کتا مالک کے بغیر زندہ بھی رہ سکتا ہے۔ وہ اب ایک ایسا کتا بن گیا تھا کہ جسے دیکھ کر سوائے اس کے کہ یہ اچھے دن دیکھ چکا ہے، اور کیا کہا جا سکتا تھا؟ حالانکہ ظاہر میں وہ اب بھی بھلی چنگی زندگی گذار رہا تھا۔ وہ بالکل ویسی ہی زندگی گذار رہا تھا جیسی کہ کوئی کتا گذار سکتا ہے۔ وقتاً فوقتاً کوئی چیز چرا کر کھا لیتا، اور پھر پٹتا؛ دو مار لڑتا۔ اور جب تھک جاتا تو آرام سے سو جاتا۔ اس نے بہت سے دوست بنائے اور بہتیرے دشمن۔ کبھی، اگر وہ اپنے سے کمزور کتے کی بری طرح مرمت کر ڈالتا تو کسی دن کسی اپنے سے زیادہ طاقتور کتے سے خوب پٹ لیتا ——— ہر روز علی الصباح وہ اس گلی میں نظر آ سکتا تھا جہاں کبھی وہ اپنے مالک کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اور جہاں عادت سے مجبور ہو کر وہ اب بھی رہ رہا تھا۔ کبھی وہ اس طرح سیدھا بھاگنے لگتا جیسے کسی بہت ضروری کام سے جا رہا ہو۔ قریب سے گذرتے ہوئے کسی کتے کو یونہی سونگھ لیتا، اگرچہ اسے اس وقت کسی ساتھی کے ساتھ آوارگی کرنے کی قطعی کوئی خواہش نہ ہوتی۔ پھر یکایک وہ بیٹھ جاتا اور اپنے کانوں کی پشت پوری قوت سے کھجانے لگتا اور دوسرے ہی لمحہ اٹھ کھڑا ہوتا اور کسی بلی کا تعاقب کرتے ہوئے کمرہ کی کھڑکی تک جا پہنچتا۔ اور اس کے بعد وہ اپنا کاروباری انداز دوبارہ اختیار کر لیتا اور سڑک پر ایک طرف کو چلتا ہوا موڑ پر غائب ہو جاتا۔

اسی طرح اس کے دن بسر ہوتے گئے۔ ایک سال، دوسرے کا قدم بہ قدم پیچھا کرتا ہوا گذرتا رہا۔ اور وہ بغیر محسوس کئے بوڑھا ہو گیا۔

اور پھر ایک اداس شام آئی، وہ شام خنک اور نم آلود تھی۔ وقتاً فوقتاً بارش کا ایک آدھ چھینٹا پڑ جاتا۔ بڈھا کتا دن بھر پورے شہر کی سیاحت میں سرگرداں رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سڑک پر کچھ لنگڑاتے ہوئے چلنے لگا۔ ایک آدھ جگہ پر وہ ٹھہرا اور اپنی سیاہ کھال کو جھنجھوڑا، جو عمر کے ساتھ سر اور گردن پر سے کچھ کچھ بھوری ہو گئی تھی۔ اپنی مرضی کے مطابق وہ سونگھتا سانگھتا چلتا رہا، کبھی دائیں کو، کبھی بائیں کو۔ پھر وہ تقریباً ایک پھاٹک میں گھس گیا

اور جب وہاں سے واپس نکلا تو اس کے ہمراہ ایک اور کتا تھا۔ چند لمحوں بعد ایک تیسرا کتا بھی وہاں آ پہنچا۔ یہ دونوں کتے نوجوان تھے اور بے انتہا کھلنڈرے — وہ بڈھے کتے کو بھی اپنے ساتھ کھیلنے کودنے پر آمادہ کر رہے تھے۔ لیکن بڈھے کتے کا موڈ کچھ خراب تھا اور پھر بوندا باندی بھی ہونے لگی تھی۔ اس وقت ایک سیٹی کی آواز آئی، تیز اور طویل۔ بڈھے کتے نے دونوں نوجوانوں کی طرف دیکھا۔ لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ یہ سیٹی ان میں سے کسی کے مالک کی نہ تھی۔ تب بوڑھے، آوارہ کتے نے اپنے کان کھڑے کئے۔ اسے یکایک ایک عجیب سا احساس ہونے لگا — سیٹی کی آواز پھر آئی۔ بوڑھا کتا، بغیر کوئی فیصلہ کئے ہوئے، غیر یقینی طور پر، پہلے ایک سمت کو بھاگا اور پھر دوسری کو۔ یہ سیٹی اس کے مالک کی تھی۔ یہ اسی کی آواز تھی۔ اور اسے ہر حال میں اس کی تعمیل کرنا تھی۔ تیسری مرتبہ پھر کسی نے سیٹی بجائی، پہلے ہی کی طرح تیز اور طویل۔ مالک کہاں ہے؟ کس سمت میں؟ میں اپنے مالک سے کس طرح جدا ہو گیا؟ اور ایسا کب ہوا؟ کل یا پرسوں، یا صرف کچھ دیر پہلے؟ میرا مالک کس شکل کا ہے؟ اس کی بو کس طرح کی ہے؟ اور وہ کہاں ہے؟ بڈھے کتے نے تیزی سے ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ کبھی اس راہ گیر کو سونگھتا، کبھی اس کو۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کا مالک نہ تھا۔ اور نہ ہی کوئی بننا چاہتا تھا۔ پھر وہ ایک سمت کو مڑ گیا اور سڑک پر تیزی سے بھاگنے لگا۔ ایک موڑ پر وہ کھڑا ہو گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کا مالک وہاں نہیں تھا۔ پھر وہ اسی طرح تیزی سے بھاگتا ہوا واپس پلٹا۔ اس کے اطراف کیچڑ اچھل رہی تھی۔ اور اس کے بالوں میں سے پانی رس رس کر بہہ رہا تھا۔ وہ ہر موڑ پر ٹھہرا، لیکن اس کا مالک کہیں بھی نہیں تھا۔ تب وہ چوراہے پر اپنے کولھوں کے بل بیٹھ گیا، اپنا جھریوں بھرا سر آسمان کی طرف اٹھایا، اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔

آپ نے کبھی ایسے آوارہ، بسرائے ہوئے کتے کو اپنا سر آسمان کی طرف اٹھائے چیخ چیخ کر روتے دیکھا ہے، یا سنا ہے؟ دوسرے کتے اپنی دمیں، دونوں ٹانگوں کے بیچ دبائے، اس کے پاس سے چپ چاپ کھسک لیتے ہیں، کیونکہ وہ اسے دلاسہ نہیں دے سکتے۔ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

گذارش

حقیقت کی مختصر تعبیر ادب عالی کی بہترین علامت ہے۔ اختصار فن و ادب کو ایک سوال انگیز پہنائی بخشتا ہے — سوال انگیز پہنائی — جس کی عظمت ابدی ہے اور ابدیت عظیم۔ لیکن عظمت و ابدیت کا کوئی مفہوم ہے یا نہیں؟ میں نہیں جانتا۔ کوئی بھی نہیں جانتا۔
بہر حال ہماری گذارش ہے کہ افسانہ نگار حضرات ہمیں مختصر افسانے [illegible] ترجیحاً — ہمیں وقت [illegible] دامن ہے

(ادارہ)

جونؔ ایلیا

ڈاکٹر عبدالحق کے ساتھ ایک شام

ہلو ـــــ

جی، کون صاحب

سلام علیکم ! کہئے حضرت مزاج بخیر۔

ادہو نجمی صاحب ـ سرکار کی دعائیں ہیں۔ اور فرمائیے کیا حکم ہے؟

کیا کر رہے ہیں آپ اس وقت ؟

بس وہی کائنات کی باتیں۔ ایک شعر سن لیجئے

ایک شئے ہے تجلی و آواز ان کو دیکھا کہ گفتگو کرلی

سبحان اللہ۔ آواز کے ساتھ ساتھ آپ کو تجلی کی زحمت بھی دے رہا ہوں۔

تشریف لارہے ہیں کیا ؟

جی ہاں اسوقت ڈاکٹر عبدالحق کے یہاں چلنا ہے مولانا تنزیل بھی تشریف رکھتے ہیں، ہم آپکی خدمت میں پہنچ رہے ہیں آپ کو بھی چلنا ہے۔

کتنی دیر میں ۔ ؟

بس دس پندرہ منٹ میں

بہت اچھا میں حاضر ہوں ۔ سلام علیکم

رئیس صاحب نے مجھے حکم دیا کہ تیار ہو جاؤ تھوڑی دیر میں مولانا تنزیل الرحمٰن صاحب اور نجمی صاحب تشریف لے آئے ۔ اور یہ کاروان مستی و قلندری

ن ترقی اردو پاکستان کی سمت روانہ ہو گیا۔ بہتر ہے کہ ان دونوں حضرات کے بارے میں تبرکاً کچھ عرض کر دیا جائے ۔ بطور خاص مولانا تنزیل صاحب

یت و ہیئت کا یہی اقتضا ہے کہ تبرکاً کی شرط ضرور لگادی جائے۔ رہے نجمی صاحب میری تو ان کو دیکھتے ہوئے " احتیاطاً" کہنا زیادہ مناسب ہوگا نجمی صاحب

ا عالمین اور عمیق شخصیت کو خوش اخلاقی ۔ مروت، سادہ کاری، ادب پروری اور علم دوستی کی ایک ضخیم کتاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ [illegible]

بیر کا نفیس گرد پوش قیمت صرف خلوص مرن انسانیت [illegible]

سگی لبقل است زلبال ـــ لیکن حقیقت یہ ہے کہ [illegible]

ایک نکتہ رس صاحب نظر ادیب بر شستہ شاعر بھی ہیں۔ ان کا ایک شعر سنتے چلئے۔

جنوں کے خوف سے ہم نے پناہ عقل ڈھونڈی تھی ۔ مگر پھر عقل ہی نے ہم کو دیوانہ بنا ڈالا!

ہو رہی بات یہ ہے کہ ان کو دیوانہ بنانے کا فرض عقل ہی نے بڑے ہی خلوص تپاک اور مرتبہ شناسی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اب جناب مولانا تنزیل الرحمٰن صاحب کو ملاحظہ کیجئے۔ موصوف مہیب فارسی زبان و ادب کے سلسلے میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں، غالباً اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک فارسی کو خالص ایرانی لہجہ میں ادا نہ کر دیں۔ کبھی کبھی اردو بھی فارسی ہی میں بولتے ہیں پہلے ایک بہت ہی کامیاب اور قانون داں ادیب ——— تھے اور اب ——— ایک قادر الکلام اور نادرہ کار وکیل ——— ہیں ان کی خالص ادبی فطرت شاید اب تک یہ شعر گنگناتی ہوگی۔

گرگئی نالم بہ "قانون" بر شکنم نغمۂ بیگانہ بر تار آمدہ!

ہیئت و صورت بلکہ صرف صورت کے اعتبار سے موصوف کو کسی تبلیغی جماعت کا سرگرم اور باعمل کارکن کہا جا سکتا ہے ———

لیجئے انجمن ترقی اردو کا دفتر آ گیا۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب دفتر کی چوتھی منزل میں رہتے ہیں۔ ہم لوگ آخری سیڑھی پر تھے، دیکھا کہ سامنے کمرے میں مولوی صاحب کھانا کھا رہے ہیں۔ واضح رہے کہ ہم لوگ کھانے میں شریک نہیں ہوئے۔ صحن میں کرسیاں پڑی ہوئی تھیں چنانچہ وہیں بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب صبح کے ناشتے کے بعد بس شام ہی کو ۶، بجے کے درمیان کھانا کھاتے ہیں۔ اگر ہم سرکاری محکمے کے کسی افسر یا عبدالغنی عبدالسلام بمبئی والا قسم کے کسی صاحب خیر بزرگ سے ملنے جاتے تو نجانے کتنے واسطوں اور وسیلوں سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے، چپراسی کو ملاقاتی کارڈ پیش کیا جاتا۔ اور پھر نجانے کتنی دیر تک چچا غالب کی اس غزل کے لطیف اور باریک نکتوں کی داد دینا پڑتی۔

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

لیکن اردو کے اس سب سے بڑے سرپرست کی خدمت میں پہنچنے کیلئے نہ کسی سکریٹری کی خوشامد کرنا پڑی اور نہ کسی چپراسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ معلوم نہیں کہ اس بات پر خوش ہونا چاہئے یا غمگین۔

مختصر سے انتظار کے بعد مولوی صاحب کھانے سے فارغ ہو کر تشریف لے آئے اسی یا پچاسی سال کے مولوی عبدالحق ایک عہد، ایک مکتبۂ فکر کا ایک تاریخ ہیں۔ انیسویں صدی کی پیرانہ سالی نے انھیں پایا تھا اور بیسویں صدی کا آخری نصف دور دھڑکتے ہوئے دل اور پریشان نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہا ہے ——— کہیں نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ سفید براق بال۔ میانہ قد۔ آنکھوں میں حالات شناسی کی متوجہ کر لینے والی چمک۔ اکہرا بدن۔ تن زیب کا کرتہ، علی گڈھ تراش کا پاجامہ۔ وہ بیٹھے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ زمانہ بیکراں اور لامحدود زمانہ صرف لمحوں اور دقیقوں ہی سے تو عبارت ہے ———

مولوی صاحب گراں گوش ہیں۔ ہو گئے ہیں ——— جب کوئی سنتا ہی نہیں تو وہ بھی آخر کیا کریں ——— شہر کی رسم یہی ہے تو پھر اب یوں ہی سہی ———

لیکن اب بھی دوسروں کی بات وہ مکرر کہے بغیر ہی سن لیتے ہیں اور دونا التفات نہیں چاہتے۔ لیکن لوگوں کے یک گونہ التفات ہی نے ان کی سماعت میں زہر گھول دیا ہے۔ اس زمانہ میں ان کو جن لہجوں سے نوازا گیا ہے ان کی داد دینے کیلئے جگر چاہئے۔ بعض لوگ اس حقیقت کو بالکل فراموش کر چکے ہیں کہ یہ عبدالحق ہی تھے جنھوں نے اردو کو ایک زندہ اور توانا تحریک بنا دیا۔ مگر آج اردو کی زندہ و توانا تحریک کا یہ عظیم بانی فقط "ملامت ہائے بیبد داں" سننے کے لئے رہ گیا ہے۔ تاریخ کا یہ عجیب و غریب المیہ ہے کہ تحریک کے بانی آخر میں اپنی تحریکوں ہی کے شکار ہو جاتے ہیں۔

ذہین صاحب نے کہا "آپ اس قوم کے سقراط ہیں۔ سقراط کو جام زہر پیش کیا گیا تھا اور آپکو زہر ملامت۔ مگر کل کا تاریخ آپ ہی

کے حق میں فیصلہ صادر کریگی۔ مولوی صاحب ایک اداس تبسم کے ساتھ خاموش ہوگئے اور پھر داغ کا یہ شعر پڑھنے لگے۔

ملاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے ۔۔۔ مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

اب ہمارے لئے چائے اور پان کے لئے کافی آگئی تھی۔ دوران گفتگو یہ لمحات بھی کتنے برگزیدہ اور متبرک ہوتے ہیں جب ہاتھ میں چائے کی پیالی ہو اور منہ میں سگریٹ۔ چائے اور مولانا ابوالکلام آزاد میں "صنعت ایہام تناسب" ہے چنانچہ بغیر کسی تمہید کے ان کا ذکر شروع ہوگیا۔

بیاد آر حریفان بادہ پیما را !

سوال کیا گیا کہ مولانا آزاد کی انشاء پردازی کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟ انھوں نے کہا کہ آزاد کی نثر میں وہ متانت، خلوص اور انشائی مقصدیت نہیں پائی جاتی جو حالی کا خاصہ ہے۔ پھر علامہ شبلی کے بارے میں معلوم کیا گیا لیکن وہ علامہ شبلی کو بھی حالی کے پائے کا نثر نگار ماننے کیلئے تیار نہیں وہ حالی اسکول کے راسخ العقیدہ نمائندہ ہیں اسلئے وہ مولانا آزاد کی "حسنہ فرمائش" اور "بطور خاص ملاحظہ ہو" قسم کی عبارت پسند کر بھی نہیں سکتے خصوصاً وہ عبارت جو سید احمد المکی ابی الکلام آزاد نے لکھی ہو۔ مولانا آزاد کے ذکر میں انھوں نے کہا کہ تقسیم ہند کے دوران میری رائے یہ تھی کہ اردو کیلئے ہندوستان ہی میں رہ کر کام کیا جائے۔ کیوں کہ پاکستان میں اردو کے لئے زیادہ جد وجہد درکار نہیں ہے۔ اس ارادے کا ذکر مولانا آزاد سے بھی کیا گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر آپ ہندوستان میں رہ کر اردو کے لئے کوئی تحریک چلائیں گے تو آپکے مکان میں افیون لاکے چرس رکھواکر آپکو گرفتار کرلیا جائے گا۔

گفتگو اردو اور انجمن ترقی اردو کے موضوع پر ہی ہوتی رہی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ حالات سے بالکل بددل اور مایوس نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا بھی کہ جو کام بعض موانع کی بنا پر پچھلے دس سال میں نہیں ہوسکا وہ ایک سال میں ہوسکتا ہے اور یہ بات میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ رہا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ لوگ فرض شناسی، بےغرضی اور ہمت افزائی سے کام لیں۔ ان کی رائے ہے کہ اردو کے مترجمین اور مصنفین کو ادبیات کے بجائے سائنس اور دوسرے علوم پر زیادہ توجہ دینا چاہئے۔

آج کل مولوی صاحب گداختہ اور خوں شدہ قسم کے شعر بہت پسند کرتے ہیں۔ رئیس صاحب کا ایک شعر پڑھنے لگے۔

جو ہماری برائیاں ہیں آج ۔۔۔ کل ہماری بھلائیاں ہوں گی

وہ خود بھی اس شعر کے صحیح مصداق ہیں۔ یہ کتنی حسرت ناک صورت حال ہے کہ ہمارے معاشرے میں بھلائیوں اور خوبیوں کے اعتراف کو "کل" پر اٹھا رکھا گیا ہے۔ آج کیا ہے ؟ صرف طعنے، ملامتیں اور مخالفتیں ــــ دیر یا بعد ــــ جب تقدیر ایام پوری ہو جائے گی تو انہی عبدالحق کے یوم منائے جائیں گے یادگاریں قائم ہوں گی اور یہی لوگ جو آج ان کے ساتھ کوئی رعایت روا رکھنا نہیں چاہتے کل ان کے سجادہ نشین بن جائیں گے۔ غرض ہم لوگ بھی خوب ہیں ہم سے مجاوری اور سجادہ نشینی کا فن تو خوب آتا ہے لیکن ایک معقول ایثار پیشہ اور مرتبہ شناس ہمعصر اور رفیق کار ثابت ہونے کی ہمارے اندر ذراسی بھی صلاحیت نہیں۔ اور یہ بڑی افسوناک بات ہے۔ بہرحال

یہ تھا اس شام کا تاثر یا تذکرہ جو انکے ساتھ بسر کی گئی۔

زبیر رشید صدیقی

تبدیلیاں

آج مجھے پھر عذرا آپا یاد آنے لگیں۔ ان کی زندگی میں کیسے کیسے تغیرات آئے۔ کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بیچاری آخری دنوں میں ان کی زندگی کتنی ہو کر رہ گئی تھی۔ اور شروع شروع میں میں نے ان میں کیسی کیسی تبدیلیاں دیکھی تھیں۔ اور وہ بھائی جان! ان کو نہ جانے کیا جنون تھا کہ ساری چھٹیاں گھومنے میں ہی میں گذارا کرتے تھے۔ بس جہاں ان کا امتحان ہوا اور وہ گھر سے نکلے۔ کشمیر، نینی تال تو ہر سال جانا ضروری تھا۔ نہ جانے ان کو پہاڑوں سے اتنی دلچسپی کیوں تھی۔ اور وہاں سے آکر وہ ہم لوگوں سے ایسے ایسے قصے بیان کرتے تھے کہ ہم لوگ کڑھنے لگتے تھے اور اپنی قسمت پر افسوس ہوتا کہ بھائی جان ہی کو خوب گھومنے کو ملتا ہے

ایک مرتبہ بھائی جان کے امتحان کے دنوں میں یکایک ہماری ایک دور کی رشتہ دار کا خط آیا۔ انھوں نے بھائی جان کو چھٹیوں میں بلایا تھا۔ بھائی جان کا کیا تھا فوراً تیار ہو گئے۔ وجہ یہ تھی کہ جہاں وہ رشتہ دار رہا کرتے تھے وہ ایک پہاڑی مقام تھا۔ بھائی جان تو بس ایسے مقام کے کیڑے تھے۔ فوراً ہی بے صبری سے امتحان کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ اس بار میں نے بہت کوشش کی کہ بھائی جان کے ساتھ جاؤں۔ امی کے بہت سر ہوا۔ خود بھائی جان کی خوشامدیں کیں۔ مگر بھائی جان کہاں ہاتھ آنے والے تھے۔ بس امتحان دیتے ہی ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اور میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں نے ساری چھٹیاں ہر سال کی طرح اس سال بھی گھر ہی پر گذار دینے کا ارادہ کر لیا۔ اور واقعی میں نے ساری چھٹیاں گھر ہی پر گذاریں۔ بیچ میں برابر بھائی جان کے خط آتے رہتے۔ اپنے خطوں میں اس جگہ کی خوب تعریفیں لکھتے۔ وہاں کے پہاڑوں اور آبشاروں کا ذکر کرتے اور خط کو پڑھتے پڑھتے میرے منہ میں پانی بھر آتا۔ لیکن ان کے خطوط میں ایک چیز میں نے محسوس کی۔ وہ تھیں شبی آپا۔ ہر خط میں ان کا ذکر کیا کرتے تھے ان کی خوب تعریفیں لکھتے۔ ان کے ساتھ گھومنے کا حال لکھتے۔ اور آخر میں لکھتے کہ تم کو تمھاری شبی آپا بہت یاد کرتی ہیں۔ میں اکثر ان شبی آپا کے بارے میں سوچا کرتا۔ شاید ان کا نام شبینہ یا شبنم ہوگا۔ تب ہی تو بھائی جان ان کو شبی پکارا کرتے تھے۔ کبھی وہ لکھتے کہ میں شبی کے ساتھ پہاڑوں پر گیا۔ پکنک پر گیا تھا۔ شبی بھی ساتھ تھی۔ رات ہم لوگ دیر تک تاش کھیلتے رہتے۔ شبی ہی میری پارٹنر رہتی ہیں۔

پھر میں محسوس کرنے لگا کہ گھر میں عذرا آپا اور امی وغیرہ میں شبی کی باتیں چلنے لگی تھیں۔ ساتھ ساتھ بھائی جان کا ذکر رہتا۔ باتیں میری سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ ایک دن میں نے گھبرا کر پوچھ ہی لیا۔ اور وہ بھی عذرا آپا سے جو میری دور کے رشتہ کی بہن لگتی تھیں کہ آخر یہ شبی آپا میری کون لگتی ہیں جو بھائی جان کی کون؟ - عذرا آپا بے چاری فوراً سنجیدہ ہو گئیں۔ اور ان کا چہرہ فق ہو گیا۔ شاید یہ نام سن کر ان [illegible] ہوا تھا۔ یا یہ پوچھنا برا لگا تھا۔ پھر وہ مجھے لیے ہوئے باہر باغ میں آ گئیں۔ ان کا چہرہ اب بھی اداس تھا۔ مجھے ان کے اوپر ترس آنے لگا۔ آخر وہ اداس کیوں ہو گئیں؟

میں نے اُن سے پھر پوچھا۔ "عذرا آپا آخر یہ شبی کون ہیں"؟ آپ نے کچھ بتایا نہیں؟" ۔ اس وقت انھوں نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک ہیں۔ ان کے ساتھ تمھارے بھائی جان کی شادی ہو رہی ہے۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا جس کو وہ ہاتھ سے مسلے ڈال رہی تھیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ وہ ہم لوگوں کو تو منع کرتی تھیں کہ خبردار پھولوں کو مت خراب کیا کرو۔ اور آج انھوں نے خود ہی پھول کو مسل ڈالا۔

میں نے ان سے پھر پوچھا۔ " بھائی جان کی شادی ہوگی"؟

"ہاں۔ بھائی جان ان کو بہت چاہتے ہیں۔ ان کی شادی ان ہی کے ساتھ ہوگی۔"

میں نے دیکھا کہ عذرا آپا کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ میں پریشان ہو گیا۔ آخر یہ عذرا آپا کی آنکھوں میں آنسو کیوں آگئے۔ میں نے اتنی سی بات تو پوچھی تھی کہ شبی کون ہیں؟ اور وہ رو پڑیں۔ مجھے رہ رہ کر خود پر کوفت ہو رہی تھی۔

ساری چھٹیاں گذر گئیں۔ بھائی جان کے خطوط برابر آتے رہے۔ مگر چھٹیاں ختم ہونے پر بھی وہ نہ آئے۔ لیکن جب مسلسل امی اور آپا کے خطوط ان کے نام پہنچے تو مجبوراً واپس آگئے۔ میں تو ان کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ کس قدر موٹے ہو گئے تھے۔ بالکل گول مٹول۔ اور وہ بدل بھی تو بہت گئے تھے۔ باتوں میں نفاست اور حُسن پیدا ہو گیا تھا۔ مجھ سے بھی کچھ زیادہ باتیں کرنے لگے تھے۔ گھنٹوں مجھے الگ بٹھا کر وہاں کی باتیں کیا کرتے۔ کئی مرتبہ مجھے سینما لے گئے۔ مگر میں برابر محسوس کرتا رہا کہ وہ کسی نامعلوم خلش میں مبتلا ہو رہے تھے۔ اور راس کے چھلے بنا بنا کر ہوا میں اڑایا کرتے۔ اور اب میں نے ان میں خاص تبدیلیاں محسوس کی۔ وہ یہ کہ عذرا آپا سے انھیں الجھن ہونے لگی تھی۔ بس جہاں عذرا آپا ہیں وہاں بھائی جان بھٹکتے بھی نہ تھے۔ سب لوگ سمجھا رہے ہیں۔ عذرا آپا بھی کہ بھائی جان کی خوشامدیں کر رہی ہیں۔ مجھ سے سفارش کرا رہی ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ صاف انکار کئے جا رہے ہیں بے چاری آپا بہت رنجیدہ رہنے لگیں۔ اور ہر وقت کچھ سوچتی رہتیں۔ کسی خیال میں گم رہتیں۔ بس جہاں دیکھو کھڑی ہیں مگر بالکل گم صُم۔ کھوئی ہوئی سی۔

انھیں دنوں عذرا آپا کی شادی طے ہو گئی۔ اور وہ بے چاری اور بھی خاموش ہو گئیں۔ مگر بھائی جان تھے کہ ان کو احساس ہی نہ تھا۔ پھر عذرا آپا کی شادی کے دن آگئے۔ سارے گھر میں دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ بچوں نے سارے گھر کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ عذرا آپا ایک کمرے میں زرد کپڑے پہنے گٹھری بنی بیٹھی تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ اتفاق سے میں اُن کے کمرے کی طرف نکل گیا۔ اس وقت ان کے پاس کوئی اور نہ تھا۔ عذرا آپا نے مجھے بلایا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ ان کا چہرہ ان کے کپڑوں سے زیادہ زرد ہو رہا تھا۔ میں جا کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

انھوں نے پوچھا "تمھارے بھائی جان کہاں ہیں۔"؟ "باہر ہوں گے۔" میں نے یونہی جواب دے دیا۔ "میرا ایک کام کرو گے تم"؟

"جی بتائیے کیا کام ہے؟"

یہ سوال انھوں نے ڈرتے ڈرتے کیا تھا۔ پھر کہا کسی سے کہو گے تو نہیں؟ "نہیں میں نہیں کہوں گا۔"

وہ مجھ سے بہت دبی زبان میں کہنے لگیں۔

"اپنے بھائی جان سے کہدو کہ تم کو عذرا آپا اپنے کمرے میں دو منٹ کے لئے بلا رہی ہیں۔"

"اچھا۔"

اور میں وہاں سے بھاگتا ہوا بھائی جان کو تلاش کرنے لگا۔ ہمارے گھر میں شادی کے مہمان بھرے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے مجھے ملے۔ بالکل بے فکر کھڑے اپنے دوستوں سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان کو الگ بلا کر کہا تو وہ یکایک فکر مند سے ہو گئے۔ مگر پھر فوراً سنبھلے اور اچھا کہہ کر پھر دوستوں سے باتیں کرنے لگے۔ میں کچھ دیر تک تو وہاں کھڑا رہا۔ مگر جلد ہی اکتا کر چلا آیا۔ مجھے بھائی جان پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔

انھوں نے بے چاری عذرا آپا کو کتنا پریشان کر رکھا تھا - آ فی اچھی سی عذرا آپا ———— ! وہ کتنا چاہتی تھیں بھائی جان کو : - اور وہ تھے کہ اِترائے جاتے نہ جانے کون تھیں شبی نبی - بس ہر وقت انھیں کی باتیں اور انھیں کی تعریفیں - مجھے تو نفرت ہو گئی تھی اُن کے نام سے - مجھے برابر عذرا آپا کا خیال ستائے جا رہا تھا - میں دوبارہ بھائی جان کے پاس گیا - اور جیسے ہی ان سے کہا - وہ بگڑ کر بولے - دیکھ رہے ہو نا باتیں کر رہا ہوں - مل لوں گا - جل کر کہا - کیا ضروری ہے کہ اسی وقت ملوں - اور مجھے بھائی جان بالکل زہر معلوم ہونے لگے - بے چاری عذرا آپا کو نہ جانے کیا کہنا تھا - ابھی تو وہ چلی جائیں گی - تھوڑی دیر میں برات آ جائے گی اور ان کو لے کر چلی جائے گی - آخر بھائی جان اتنی جلدی کیوں بدل گئے - کہاں تو عذرا آپا کے بغیر ایک منٹ بھی سکون نہ ملتا تھا - کالج ختم ہونے سے پہلے ہی گھر آجایا کرتے تھے - روزانہ پروگرام بنا کرتے - کبھی پکنک ، کبھی سنیما - کبھی تاریخی عمارتوں کی سیر - اور ہمیشہ عذرا آپا کا ہونا ضروری ہوتا - چاندنی راتوں میں نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتے - جہاں بیڈمنٹن شروع ہوا تو بس بھائی جان اور عذرا آپا پارٹنر - ان دنوں عذرا آپا کتنی خوش رہا کرتی تھیں - ہر وقت کھلا ہوا پھول معلوم ہوتیں - ان کے پتلے پتلے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلا کرتی تھی اور آنکھیں کسی نامعلوم خوشی میں رقص کیا کرتیں - مگر اب ! پہلے کی تو کوئی چیز ہی باقی نہ رہی - نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور نہ آنکھوں میں وہ خوشیوں کی نمائش - نہ تو عذرا آپا ہی ویسی رہی تھیں - اور نہ بھائی جان ! اب تو زیادہ تر اُن کی آنکھوں میں نمی دیکھتا - راتیں گھنٹوں جاگا کرتیں اور باغ سے تو انھیں نفرت ہو گئی تھی - شاید ہی کبھی باغ میں جاتی ہوں - اور پھول - وہ تو شاید انھیں کانٹے ہی نظر آنے لگے تھے - جہاں انھوں نے کوئی خوبصورت سا پھول دیکھا بس مسل ڈالا ، چاندنی راتوں میں وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہا کرتی تھیں - اکثر دریچے سے چاند کی ٹھنڈی کرنیں آ جاتیں تو وہ حسرت سے باہر پھیلی ہوئی اور پیلی چاندنی کو دیکھا کرتیں - شاید ان کو گذرے ہوئے سارے واقعات یاد آ جاتے - اور آخر میں جب ان کی آنکھیں نم ہو جاتیں تو وہ فوراً دریچے بند کر کے پلنگ پر گر پڑتیں - نہ جانے انھیں کیا خبط ہو گیا تھا - مجھے خود تعجب تھا کہ ان کی آنکھوں میں اس قدر جلدی آنسو کیوں آ جاتے تھے - جب دیکھو کھوئی کھوئی سی کھڑی ہیں - جہاں کسی نے ٹوکا - بس ان کی آنکھیں نم ہو گئیں - بھائی جان کو دیکھا اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے - چپ چاپ اپنے کمرے میں آئیں اور بہت دیر تک تکیہ میں مُنہ چھپائے سسکیاں لیتی رہیں -

اس وقت بھی مجھے ان کے آنسو یاد آ رہے تھے - سارے گھر میں شادی کے ہنگامے مچے ہوئے تھے - اور میں باغ میں فوارے پر کھڑا ہوا عذرا آپا کے بارے میں نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا - یکایک شور مچا کہ برات آ گئی - باجوں کے شور سے سارا گھر گونج اٹھا - اب کیا ہو گا ! عذرا آپا بھائی جان کا انتظار کر رہی ہیں - میرے بارے میں انھوں نے کیا خیال کیا ہو گا - ان کا میں ایک کام بھی نہ کر سکا - میں دوبارہ بھائی جان کے پاس گیا - مگر ان کی صورت دیکھ کر کہنے کی ہمت نہ ہوئی - بس ان کے قریب سے گذر گیا - لیکن دل نہ مانا اور ان کے پاس گیا - اس وقت وہ اکیلے بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے -

"بھائی جان برات آ گئی اور آپ اب تک نہیں گئے ؟" میں نے کہا -

"ہاں ہاں چلتا ہوں تم چلو - میں آیا " بھائی جان نے جواب دیا - اور میں خوش ہو کر بھاگا - مگر پھر بھائی جان برات کی گڑبڑی میں نہ جانے کہاں گم ہو گئے - میں ڈھونڈھ رہا تھا - اتنے میں ایک چھوٹی سی لڑکی نے مجھے آ کر پکڑ لیا - "سنو تم کو عذرا آپا بلا رہی ہیں" وہ بولی -

"مجھے ؟"

اور میں بغیر لڑکی سے کچھ پوچھے ہوئے عذرا آپا کے کمرے کی طرف بھاگا - اُن کے پاس چند لڑکیاں تھیں - وہ اس وقت دلہن بنی بیٹھی تھیں - عروسی کپڑوں میں تو انھیں دیکھتا ہی رہ گیا - آج وہ کتنی اچھی لگ رہی تھیں - مگر بجائے مسرت کے ان کی آنکھوں میں غم کے آنسو مچل رہے تھے - - - - - -

انھوں نے پوچھا اور میں نے سر جھکا لیا - بس میرے مُنہ سے اتنا جملہ نکل سکا - " میں نے بھائی جان سے کئی بار کہا مگر وہ "

"اچھا میں سمجھ گئی" - ان کی آواز گلوگیر ہو گئی تھی - "دیکھو ان کو یہ دے دینا - مگر جلدی ہی اس کا جواب چاہیئے - دیکھو دیر نہ کرنا -"

انھوں نے یہ کہہ کر محبت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا - اور اس وقت میرے ہاتھ پر ایک گرم چیز آ کر گری - اُف - وہ رو رہی تھیں !

"دیکھو نجم !" اور وہ میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں - اور میں وہ کاغذ کا ٹکڑا لے کر بھاگا -

اب میں ہوں کہ بھائی جان کو تلاش کر رہا ہوں - سارا گھر چھان مارا - ہر کمرے میں ان کی تلاش کی - سب سے پوچھا - مگر کہیں پتہ نہ ملا - باغ میں پہر کاٹا - ان کو آوازیں دیں - مگر وہ ہوں تو ملیں - آخر میں تھک کر باغ میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا - سوچتا رہا اب کیا کروں - بھائی جان کو کہاں تلاش کروں - ایسی بھی کیا نفرت - میرا جی چاہ رہا تھا کہ بھائی جان کو خوب کوسوں جو میری اچھی عذرا آپا کا دل دکھا رہے تھے - اتنی نازک تو وہ خود تھیں اور اس پر یہ دل شکنی - میں بھائی جان کو تلاش کرتا رہا اور اندر نکاح بھی ہوگیا - رُونمائی بھی ہوگئی - مگر میں مسلسل بھائی جان کی تلاش میں اِدھر اُدھر چکر کاٹ رہا تھا - رہ رہ کر کوفت ہو رہی تھی - آخر عذرا آپا میرے بارے میں کیا سوچتی ہوں گی - ان کا ننھا سا دل کس قدر کُڑھ رہا ہوگا - وہ کسی دوسرے کی ہو چکی تھیں - میرا دل چاہ رہا تھا کہ خوب روؤں - اس بنچ پر بیٹھ کر رات بھر روتا رہوں -

برات کو اسی وقت رخصت ہونا تھا - اک دم شور اٹھا کہ برات رخصت ہو رہی ہے - میں سر جھکائے گھر آیا - مجھے گھر کی عورتیں باہر ہی ملیں - اور عذرا آپا کو موٹر میں بٹھایا جا رہا تھا - سب نے مجھ سے کہا کہ عذرا آپا سے تو مل لوں - وہ جا رہی ہیں - اس وقت میری آنکھوں سے آنسو بری طرح نکل رہے تھے - اور میں بجائے عذرا آپا سے ملنے کے باغ کی طرف بھاگا - قریب ہی مجھے بھائی جان کے قہقہے سنائی دے رہے تھے - اور عذرا آپا کی موٹر آہستہ آہستہ پھاٹک سے باہر نکل رہی تھی -

---

(بقیہ صفحہ ۱۴ سے)

اور اکسپلورر ایجاد نہیں کرتے - ہم یورپ کی تقلید کرنا چاہتے ہیں مگر سائنس اور تجرباتی علوم سے بیزار ہیں - ہم امریکہ کے مقلد ہیں - پھر بھی نہ ہم میں کوئی نظریۂ اضافیت کا موجد ہے اور نہ جوہری طبیعیات کا عالم -

سوال یہ ہے کہ :-

کیا یورپ اور امریکہ کی اندھی تقلید ہمارے مسائل حل کر سکتی ہے ؟ -

---

لاہور — راولپنڈی
کی اب روزانہ
دوبار سروس ہے
صبح ساڑھے چھ بجے اور دوپہر کو ڈھائی بجے
اور پشاور کی سروس روزانہ ہے
پی۔آئی۔اے کے ہکن ویئر جہاز سے
کراچی سے لاہور کا سفر کیجئے اور ہوائی سفر کا لطف اٹھائیے
✓ صبح کو جائیے دن بھر لاہور میں رہئے اور شام کو واپس آجائیے۔
✓ لاہور کا سفر صرف تین گھنٹے کا ہے
✓ راولپنڈی کا سفر صرف سوا پانچ گھنٹے کا
✓ ہکن ویئر جہاز ایرکنڈیشنڈ ہیں۔ ان میں پرواز کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔
✓ آپ کی منزل اگر پشاور ہے تو راستہ میں لاہور اور راولپنڈی آپ رک سکتے۔ اس کا کوئی زاید کرایہ نہیں۔
پی۔آئی۔اے سے سفر کیجئے۔ ہوائی سفر کا کوئی مقابلہ نہیں!
پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز
ایم۔اے۔کھوڑو روڈ۔ کراچی فون:۔ ۵۱۰۶۲/۵۲۲۳۹
انشا، کراچی

جولائی

Y 1958 •
d. S. No. 2230

Phones { 37612
37433

INSHA

Idara-i-Zehne Jadid, Karachi-2

Only title printed at Lion Art Press, Frere Road, Karachi
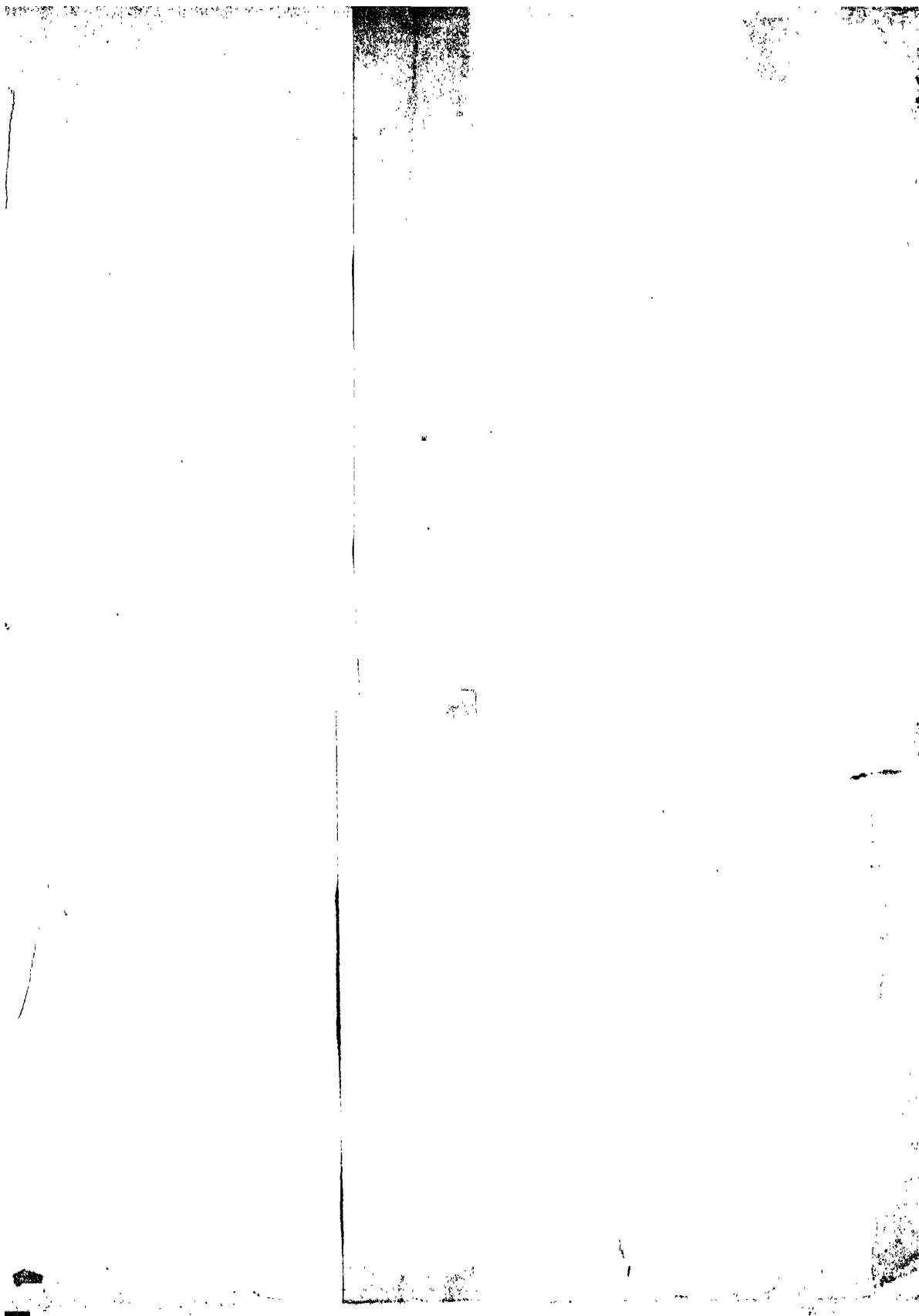
"امّاں، یہ کس قدر خوبصورت ہے!"

واقعی اس کی خوبصورتی میں کوئی شک نہیں... اور پھر یہ کپڑا نہ صرف دیر پا ہے بلکہ دھلائی کے بعد بھی اس کی آب و تاب میں کوئی فرق نہیں آتا۔
آجکل بہت سے مصنوعی ریشے تیل سے بنائے جا رہے ہیں اور شیل کے سائنسدان مسلسل تیل کے ایسے اجزا دریافت کرتے رہتے ہیں جو مصنوعی کپڑے، مصنوعی ربڑ، مصنوعی گوند، مصفیات مثلاً صابن وغیرہ اور اسی قسم کی دوسری صنعتوں میں کام آتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ بعض مصنوعات پر شیل کا نام نہ ہو لیکن ان کی ساخت کے پس پشت شیل کے ماہرین کی فکر اور تحقیقات عموماً پائی جاتی ہیں۔

بر ما شیل کا آپکی زندگی سے گہرا تعلق ہے

Habib Bank Limited
Pak Rs 100
45092
100

TULLO
تلو
یہ گھی ہے اپنے دیس کا
گھروں میں چل کے دیکھئے
ہر ایک طرح کی غذا
تلو میں تل کے دیکھئے
ہے گاہکوں کی بھیڑ بھاڑ
اسے خریدنے چلو
مزے میں بے مثال ہے
اثر میں لاجواب ہے
نہ گوشت میں ہے بدمزہ
نہ دال میں خراب ہے
مہک اٹھے گا گھر کا گھر
ذرا جو ہاتھ پر ملو
اسی زمیں کا مال ہے
یہیں کی سبزیوں کا گھی
ہر ایک کی پسند بھی
لذیذ بھی مفید بھی
کھپے گی جسم و جان میں
تلو میں جو غذا تلو
امیر یا غریب ہو
تلو پہ سب کا اعتماد
وطن کا مال ہے تلو
وطن کا مال زندہ باد
اسی پہ پال پوس ہے
پھلو پھلو۔ پلو پلو
تلو میں پکائیے فخر سے کھلائیے
wa
وزیر علی انڈسٹریز لمیٹڈ
T—47

اسے زندگی میں مردانہ وار داخل ہونا ہے
آج تو وہ محض طالب علم ہے، کھلنڈرا، شریر اور بے فکرا، لیکن کل اسے سنجیدگی اور عزم
کے ساتھ زندگی کی کشمکش سے دوچار ہونا ہے۔ اس وقت اسے دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار
لانے کے لئے جسمانی قوت کی اشد ضرورت ہوگی۔
صحت اور جسمانی طاقت بچپن ہی سے بنانی چاہئے۔ سنکارا کا باقاعدہ استعمال چلّوؤں خون
بڑھاتا ہے۔ اپنے ننھے کو طاقتور بنانے میں سنکارا سے مدد لیجئے۔ سنکارا قوت بخش اور
خوش ذائقہ ہے۔ حیات آفریں وٹامنز سے بھرپور اور ہر موسم میں استعمال ہوتا ہے۔
Cinkara
سنکارا
بچّوں کے لئے بے مثل ٹانک — اور آپ کے لئے بھی
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان کراچی ڈھاکہ لاہور
ہمدرد
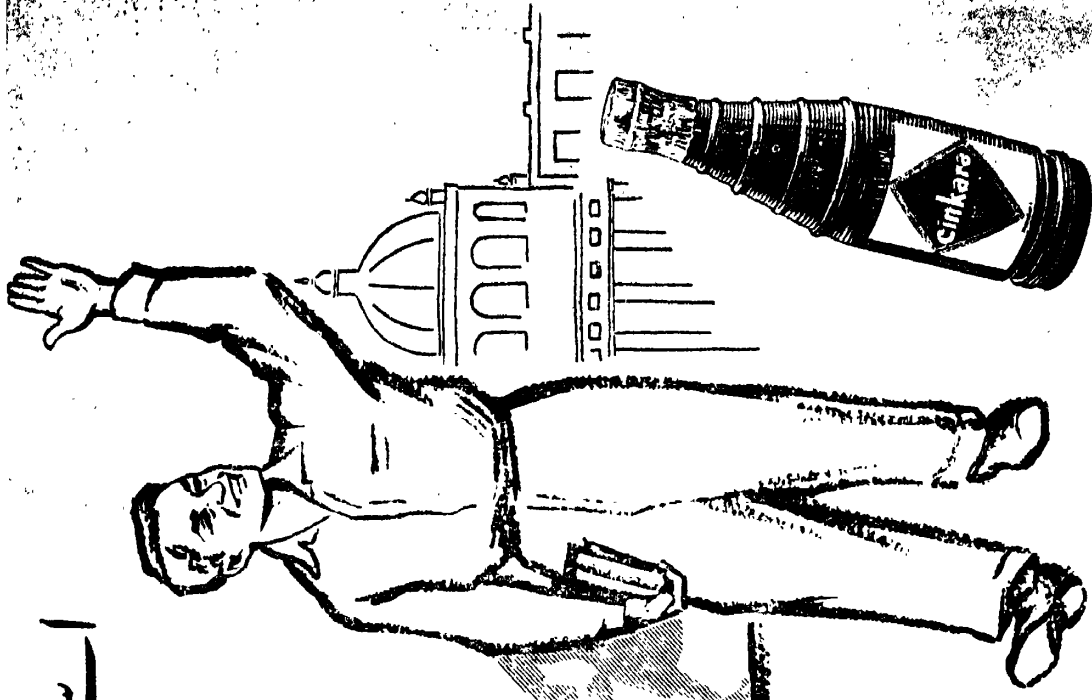
a treat
from
tip to toes
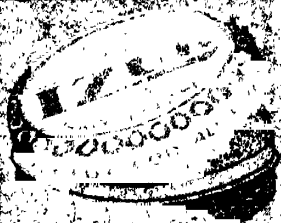
IZUR
FOR CUTS
BURNS, WOUNDS
AND
ALL SKIN DISEASES
IT HEALS WHERE OTHERS FAIL
M. A. AFTAB & BROS.
KARACHI

انشاء

تاسیس
رئیس امروہوی ★ سید محمد تقی

اکتوبر ۱۹۶۰ء
شمارہ ۱۰ ★ جلد ۴

مدیر:- جون ایلیاء

ادارہ تحریر:- ممتاز سعید نقی اختر
نظامت:- محمد عباس
کتابت:- ادارۂ فیض الکتابت

ادارۂ ذہنِ جدید

۹/- نیو کلاتھ مارکیٹ - بندر روڈ کراچی

فون:- ۳۰۸۹۷ — ۳۲۴۳۳

قیمت:- آٹھ آنے ★ سالانہ: پانچ روپے

دماغ کا بخار (انشائیہ)
وہ ہماری ہے — آپ پہچانے؟
حضرت شاہ نرالے میاں
جرمنی کی الف لیلہ
میں آیا، میں نے پی اور میں چھا گیا
میں خدا کو نہیں مانتا
چین کا قائد اعظم
آپ شوہر ہیں یا بیوی
خواب
شعلۂ بیدار
خط کا جواب
غزل
•
• •
فرشتے کی واپسی
ہو چکا انتظار
... مگر ملکۂ مصر نہیں
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا
جہاں نذر دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے

★

جون ایلیاء
محمد علی صدیقی
شیخ سدّو
ابن الرحمٰن
رئیس امروہوی
برٹرینڈ رسل (امتیاز سعادت)
محمد مہدی
صغیر زیدی
جون ایلیاء
سحر انصاری
دور آفریدی
جعفر طاہر
کامل القادری
شاعر فتحپوری ہینسن ریحانی
نسیم ایراق تیشو
دردانہ ہاشمی
عائشہ ممتاز
نشیان
ارباب انشاء

جون ایلیاء

دماغ کے بغیر

انشائیہ

اولمپک کھیلوں میں پاکستان نے ہندوستان سے ہاکی کا مقابلہ جیت کر جو عالمی امتیاز حاصل کیا ہے وہ یقیناً ہم سب کے لئے باعث مسرت ہے۔ صرف ہمارے ہی لئے نہیں بلکہ ہندوستان کے لئے بھی اس لئے کہ ہار اور جیت کا تعلق دو اجنبی ملکوں میں نہیں ایسے دو ملکوں میں قائم ہوا ہے جن کا نام زبان پر ایک ساتھ آتا ہے اور جو ایک دوسرے سے قریب تر ہیں۔ ایسے مقابلوں میں قوموں کی زندگی اور زندہ دلی کے امکانات نمایاں ہوتے ہیں اس لئے کھیلوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، افلاطون نے بھی اپنے نظام تعلیم و تربیت میں کھیلوں اور جسمانی ورزشوں کو قابل ذکر حیثیت دی ہے بعض فلسفی تو خود زندگی کو فطرت کا ایک کھیل سمجھتے ہیں اور وہ ایک کھیل ہے بھی تو۔ کہنا چاہیئے کہ وہ ایک عظیم الشان کھیل ہے۔ ہم اُن لوگوں سے متفق نہیں جو اُسے زہد، تقشف اور ریاضت سے تعبیر کرنا چاہتے ہیں زندگی میں اگر رنگ و آہنگ اور امنگ اور ترنگ نہیں تو پھر وہ موت ہے۔

مگر اس موقع پر ہمیں انتہائی دردمندی اور سنجیدگی سے جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ بات کو حد سے آگے نہیں بڑھانا چاہیئے یہ بڑی ہی دردناک بات ہے کہ ہم عموماً حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ چنانچہ کھیل کے سلسلے میں ہم نے گزشتہ عرصے میں جس غیر ذمہ دارانہ طرز عمل، بے اعتدالی اور ناقابل برداشت انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا ہے وہ بیحد تشویش ناک ہے۔ اور اب تو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ پچھلے دنوں اولمپک کھیلوں کے موقع پر کسی اور نے نہیں بلکہ وزارت تعلیم کے رکن اعلیٰ جناب حبیب الرحمٰن نے قوم سے اپیل کی کہ پاکستانی کھلاڑیوں کی فتح کے لئے مسجدوں میں دعائیں مانگی جائیں۔ گویا ان کے خیال میں پاکستان کے کھلاڑی قوم کی طرف سے تاریخ انسانی کا کوئی عظیم الشان فرض انجام دینے گئے تھے اس لئے قوم پر واجب تھا کہ ان کی فتح و ظفر کے لئے نمازیں پڑھے اور منتیں مانے۔

ملک کے وزیر تعلیم کی جانب سے کھلاڑیوں کی اتنی ہمت افزائی ہمارے لئے قطعاً ناقابل فہم ہے، محترم وزیر تعلیم نے یہ تکلیف دہ رویہ اختیار کر کے قوم کے سنجیدہ طبقے کو سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ جب وزارت تعلیم بھی کھیلوں کی تنظیم و تمجید پر تلی ہوئی ہے تو پھر نہیں کہا جا سکتا کہ اس قوم کا حشر کیا ہوگا؟ بات ایک حد تک تو ٹھیک ہے، ہم بھی کھیلوں کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں مگر کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمارے نوجوان کھلاڑیوں کو قوم کا ہیرو سمجھ لیں اور اپنے تمام فرائض فراموش کر کے صرف ایسے کاموں میں امتیاز حاصل کرنے کو اپنا سب سے اہم فرض خیال کر لیں جو اکثر حالات میں ترقی کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ آج کل ایک عجیب بات دیکھنے میں آ رہی ہے یہ کہ جن مشاغل میں دماغ

سے کام لینے کی سب سے کم ضرورت پیش آتی ہے بلکہ بالکل ہی ضرورت پیش نہیں آتی وہی ہمارے سماج میں سب سے زیادہ عظیم اور عزیز قرار پاتے ہیں۔ جہالت کو جتنی رعایتیں ہمارے سماج میں دی گئی ہیں اس کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم اپنی ترقی معکوس کا جشن منا رہے ہیں یہاں اگر کسی کو عوام و خواص میں مقبول ہونے کی خواہش ہو تو اُسے علم و ہنر کے بجائے ہاکی، کرکٹ، باکسنگ اور رقص و موسیقی میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، یہاں کے نوجوان تاریخ انسانی کے دانشوروں، مفکروں، حکیموں اور شاعروں کی بےکیف صحبت میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ہالی ووڈ کے اداکاروں کی ہدایت و رہنمائی میں جدید عہد کے مرحلے طے کر رہے ہیں۔ گویا تاریخ نے پاکستان کا اسٹیج محض اس لئے تیار کیا تھا کہ اس پر چند بہروپیوں، نقالوں اور کھلنڈروں کی نمائش ہو سکے۔ غضب یہ ہے کہ اب انہی مساعی اور مصروفیات کو ترقی و تہذیب کی علامت اور آرٹ کی سرپرستی و قدردانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ فقط اس لئے کہ اس ہونہار قوم کو مغرب کی نقالی دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔

یہ ایک تلخ ترین حقیقت ہے کہ ہم مغرب کی ذلیل ترین غلامی سے ذہنی طور پر آج تک نجات حاصل نہیں کر سکے کسی ترقی یافتہ قوم کی تقلید بری چیز نہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ تقلید کے فرائض کن میدانوں میں انجام دیئے جا رہے ہیں۔ یہ کتنا المناک حادثہ ہے کہ ہم نے اپنی پوری زندگی کا دستور عمل مغربی اقوام کے صرف تفریحی اوقات کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے گویا ہمارے خیال میں برطانیہ، امریکہ اور فرانس میں صبح سے شام تک صرف کھیلوں کے مقابلے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ عظیم مغرب کے ساتھ کتنی بڑی ناانصافی ہے! آپ ضرور کھیلئے، کھیلنے والوں کو دیکھ کر جوش مسرت میں تالیاں بجائیے لیکن آپ میں اتنی جسارت تو نہیں ہونا چاہئے کہ اپنے اس شغل کو علمی، تہذیبی اور سماجی فرائض کا بدل اور اپنی ذات کو قوم کے اصل نمائندوں کا قائمقام سمجھ بیٹھیں اور پھر قومی سطح پر اس خیرہ سری اور خیرہ چشمی کی داد بھی حاصل کریں۔ اس کیفیت کو دیکھ کر کبھی کبھی تو یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ یہ عہد کہیں فکری زوال کا عہد تو نہیں اور یہ قوم ذہنی طور پر دیوالیہ تو نہیں ہو گئی۔

آپ پر صدیوں کا قرض اور قرنوں کا دین ہے آپ ذہنی اور مادی طور پر جانوروں اور وحشیوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس لئے کہ آپ کے شکستہ و پسماندہ ماضی میں سو سال غلامی کے بھی شامل ہیں۔ ہم جب اپنے وجود پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم صدیوں اور قرنوں کی ایک مقہور و معتوب قوم کو دیکھتے ہیں۔ وہ قوم جسے اسکی خواہش کے بالکل برخلاف ارتقائے تاریخ کے بپھرے ہوئے سیلاب کی زد پر پھینک دیا گیا ہے جس نے سفینوں سے کود کر تنکوں کی طرف تیرنا سیکھا ہے جو چٹانوں کے بجائے جھاگوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتی ہے، واقعی ہم تاریخ کا ایک تماشا اور انسانیت کا ایک اعجوبہ ہیں ہمیں پوچھنا یہ ہے کہ آخر یہ قوم چاہتی کیا ہے؟ کیا قوم کے وہ دردمند افراد جو قوم کے لئے عظیم مستقبل کے خواب دیکھتے رہے ہیں ــــ دیکھ رہے ہیں ــــ جنہوں نے اس کی تعمیر نو کے لئے اپنی زندگیاں تج دی ہیں وہ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے؟ ہماری عاجزانہ گزارش ہے کہ کھیلوں اور ایسے ہی دوسرے شغلوں کی اس قدر ہمت افزائی نہ کی جائے اس طرح جہالت کا دماغ اور بھی خراب ہو جائے گا ہمارے نوجوان اور عوام خود ہی کافی بےحس اور بےشعور ہیں انہیں اس سلسلے میں کسی تائید و ترغیب کی کوئی ضرورت نہیں۔

پاکستان کے مفکروں، ادیبوں، شاعروں تہذیبی دانشوروں اور قومی رہنماؤں کے لئے سماج کا یہ رویہ انتہائی ناقابل برداشت اور دلشکن ہے کہ سماج ان کے مقابلے میں تیسرے درجے کے لوگوں کو اتنی اہمیت دیدے جس کے نتیجے میں تمام نظام اقدار تباہ ہو کر رہ جائے ہمیں اندازہ ہے کہ ہم نے اس نشست میں کھیلوں اور کھلاڑیوں کا بار بار ذکر کر کے اور اس مسئلے میں بہت زیادہ متوحش اور سنجیدہ ہو کر بردباری کا ثبوت نہیں دیا صرف یہ کہہ دینا کافی تھا کہ کھلاڑیوں، مداریوں اور سماجی مسخروں کو سماج کی جانب سے بڑی کشادہ دلی کے ساتھ

خوش رہنے اور خوش کرنے کا حق ملنا چاہئیے اس سے زیادہ اُن کی کوئی حیثیت نہیں ——— لیکن طول کلام کا سبب دراصل یہ ہے کہ قوم کے عوام کہیں گمراہ کن معیاروں اور غلط مثالیوں کا شکار نہ ہو جائیں غلط طرزِ عمل برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن غلط اندازِ نظر برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

چشمِ بددور

پنڈت نہرو صدرِ مملکت کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے، صدر سے مختلف مسائل پر ان کی گفتگو ہوئی اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ گفتگو بڑی حد تک کامیاب رہی، خوشی کی بات یہ ہے کہ معزز مہمان پاکستان کے عوام اور صدر کے خلوص سے متاثر ہو کر گئے امید ہے کہ یہ ملاقات دونوں ملکوں کے حق میں ایک مبارک و مسعود دور کی تمہید ثابت ہوگی۔ شروع ہی سے صدر ایوب کی یہ کوشش رہی کہ ہند و پاک ایک دوسرے کے قریب تر آ جائیں اور اپنے مسائل سیاست کارانہ سطح سے بلند ہو کر ہمدردانہ اور دوستانہ فضا میں حل کریں۔ دیکھا جائے تو دونوں ملکوں کے درمیان کوئی بھی ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے آسانی سے حل نہ کیا جا سکے صرف حقیقت پسندی اور معاملہ فہمی کی ضرورت ہے، اب جبکہ حالات نے ایک بہترین موقع دیا ہے تو ہمیں تمام رنجشیں دور کر کے ایک دوسرے کے دل میں گھر کرنے کی مقدس کوشش کرنا چاہئیے۔ ہم کتنے قریب ہیں مگر کتنے دور ہو گئے ہیں! مگر ہم جانتے ہیں کہ یہ دوری بالکل مصنوعی ہے صدیوں کے رشتے کہیں ٹوٹ سکتے ہیں؟ قرنوں کی محبتیں کہیں مٹ سکتی ہیں؟ اب ہمارا اور خاص طور پر ہمارے ادیبوں اور اخبار نویسوں کا فرض ہے کہ ایک دوسرے کے دل میں خلوص، ایثار اور محبت کے انمٹ نقوش اجاگر کرنے کی سعی کریں کہ دونوں ملکوں کے ان قائدوں کے ساتھ اس سے بہتر اور کوئی تعاون نہیں ہو سکتا۔ وقت کا اصل تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے حقیقی مسائل کی طرف توجہ کریں۔ ہم دونوں زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ دنیا بہت آگے بڑھ چکی ہے ہمیں گزشتہ نقصانات کی تلافی بھی کرنا ہے اور نئی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہونا ہے ایسے عالم میں ظاہر ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمارا برتاؤ کیا ہونا چاہئیے۔ ہم کہ ایک ہی تاریخ کے پروردہ اور ایک ہی انقلاب کے فرزند ہیں ہمیں بھوک سے لڑنا ہے، جہالت سے لڑنا ہے۔ رجعت پسندانہ عصبیتوں سے لڑنا ہے ان گنت دنیاوی ہیں۔ بے شمار فرائض ہیں۔ یہ کہیں روٹھے رہنے کا وقت ہے ہمیں اپنے اندرونی مسائل سے فراغت پانے کے بعد عزیز و عظیم ایشیا کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ ایشیا — ہماری وحدت و محبت کا مقدس استعارہ جو اپنے فرزندوں سے احساس و حمیت کا طالب ہے۔ آؤ کہ ہم اس کی بارگاہ میں عہد کریں کہ اے ہماری ارضِ مقدس ہم تجھے سربلند کریں گے۔ آخر میں ہماری دعا ہے کہ ہمارے تعلقات خوشگوار سے خوشگوار تر ہوتے چلے جائیں اور انہیں کسی دشمن کی نظر نہ لگ جائے۔

کوئی جنازہ کبھی تنہا نہیں اٹھتا۔ اس کے ساتھ کئی جنازے اٹھتے ہیں اور پھر جگرؔ کا جنازہ ——— جگرؔ اکیلے نہیں مر گئے ان کے ساتھ کئی نسلیں اور کئی فصلیں ختم ہو گئیں، غزل اور جگر یہ دونوں لفظ گویا ایک دوسرے کے ہم معنی تھے۔ یہ بھی ایک عجیب داستان ہے غزل جگر کے پاس اپنے پورے ہوش و حواس میں پہنچی تھی لیکن انہوں نے پی پی کر اسے بھی مدہوش کیا اور خود بھی مدہوش ہوئے یہاں کی پہلی شرارت تھی دوسری شرارت یہ کہ خود تو ہوش میں آ گئے اور اسے بے ہوش رکھا زندگی اگرچہ خود ایک افسانہ ہے لیکن یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی ہی میں ایک افسانہ بن جائے جگر اپنی زندگی ہی میں ایک افسانہ بن گئے تھے۔ انہیں جیتے جی ایک روایت کی طرح چاہا گیا۔ عجیب ظالم دکا فر شخصیت تھی۔ اب سنا ہے کہ مر گئے اور اصرار یہ کہ اس خبر پر یقین بھی کر و۔ دور افتادہ شہر سے آئی ہوئی اس خبر نے ہمارے دلوں کو بری طرح مجروح کر دیا ہے۔

محمد علی صدیقی
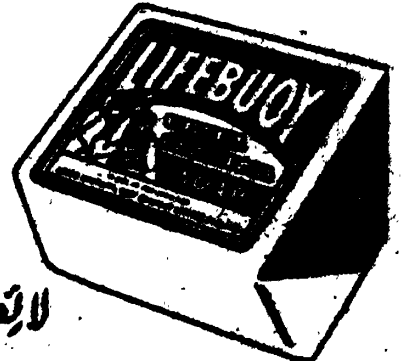
وہ ہماری ہے — آپ پہچانے ؟

گیانا —— اردو اسٹیج کی ایک خوبصورت شخصیت

"آپ.... کچھ بھلے بھی لگتے ہیں — میں بھوکی ہوں" وہ ڈائری کو ہاتھ میں لے کر سوچنے لگا کہ یہ کہیں دھوکہ تو نہیں؟ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ روم کی یہ خوبصورت دوشیزہ ہمارے اور آپ کے لئے ذرا بھی اجنبی نہیں۔ "جناب! میں انگریزی جانتی ہوں۔ آکسفورڈ میں پڑھی ہوں — اردو میں بھی گفتگو کرسکتی ہوں۔"

"یہاں وہ سب کچھ ہوگا جو انسان چاہتا ہے۔"

جب اس شہر کی بنیاد رکھی جا رہی تھی تو اس کا معمار رومس چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ روم علم و فن کا مرکز ہوگا یہاں یونانی دیویوں کی مسکراہٹ فضاؤں میں ارتعاش پیدا کریگی، روم کا نام آتے ہی تاریخ عالم کے شاندار اور خونچکاں باب نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

روم آج بھی وہی پرانا روم تھا لیکن بمباری سے تباہ، لٹا ہوا۔ جس کے چہرے پر تباہ کاریوں نے اتنی شکنیں ڈال دی تھیں کہ وہ ڈیلفی کے کھنڈروں سے بھی زیادہ ویران نظر آرہا تھا۔ جولائی کی ایک صبح روم کے چہرے کی ان شکنوں کو بغور دیکھ رہی تھی، ایک شخص اپنی آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کئے ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھا تھا۔ یہ اتحادی فوجوں کا ایک سارجنٹ تھا، اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جسے وہ باربار پڑھتا اور بند کر دیتا۔ "مسولینی اسکوائر" روم کا سب سے زیادہ خوبصورت چوراہا ہے۔ یہاں سے مڑنے والی لڑکیوں پر ایک زمانے میں نپولین کی فوجیں دندناتی ہوئی آئیں اور گزر گئیں، بعد میں پوپ اور اٹلی کے بادشاہ کی جنگ کے فیصلہ کن مرحلے بھی اسی چوراہے نے دیکھے۔ آج اس تباہ شدہ چوراہے پر ہو کا عالم تھا۔ کبھی کبھی اتحادیوں کے بکتر بند دستے گزر جاتے، اور پھر خاموشی اپنے ڈیرے ڈال دیتی، کبھی گاڑیاں، ٹرک، جیپیں اور اتحادی سپاہی فلیٹوں پر جھکی ہوئی خوفزدہ اور پریشان لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے گزر جاتے۔

سارجنٹ ڈکنس کے سامنے کے فلیٹ میں کبھی بار بار ایک ڈری اور سہمی ہوئی دوشیزہ آتی اور آہستہ سے کبھی فلیٹ کا دروازہ کھولتی اور کبھی بند کر دیتی، اچانک ایک خاصی بھاری ڈائری سڑک کے درمیان آکر گری۔ ڈکنس بچوں کی طرح اٹھا اور جھٹ سے ڈائری کو اٹھا لیا، پہلے ہی صفحہ پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا،

"آپ اتحادی سپاہی معلوم ہوتے ہیں کچھ بھٹکے ہوئے ہیں۔ میں بھوکی ہوں۔ ایک ڈبل روٹی اور ایک سگرٹ لادیں، میں سامنے کی عمارت میں دوسرے فلور پر ہوں ——— فقط گیا نا"

ڈکنس ڈائری کو ہاتھ میں لیکر سوچنے لگا کہ یہ کہیں دھوکہ تو نہیں اس کے دماغ میں بار بار غلط خیالات آتے رہے کہ کہیں کوئی بچا کچا فاشسٹ خفیہ گروہ تو کام نہیں کر رہا۔ بھاری بھاری قدموں سے وہ اس بلڈنگ کی طرف بڑھنے لگا۔ اور پھر سیڑھیوں پر رُکا، دوبارہ لفافہ پڑھا اور جلدی جلدی اوپر چڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے ——— کچھ تو اس لئے کہ اس کی بہن کا انتقال ہوگیا تھا اور کچھ اس لیے کہ اُسے رُوم سے بہت محبت تھی۔ ۱۰ سال پہلے وہ اس شہر میں اپنے والد اور بہن کے ساتھ آیا تھا۔ اس وقت کے روم میں اور آج کے روم میں کیا مقابلہ ——— وہ گلزار تھا تو یہ کھنڈر۔

اس نے کمرہ نمبر ۸ کے دروازہ پر دستک دی۔ ذرا زور سے تھپکا اور دروازہ سمیت اندر۔ مسلسل بمباری سے دروازہ ہی کیا پوری عمارت ہی کمزور ہوچلی تھی۔ دروازہ کے ساتھ ساتھ ڈکنس بھی دھڑام سے گرا۔ ایک ہاتھ نے جو پیچھے سے بڑھا۔ اس کی کلائی کو پکڑا اور اوپر اُٹھالیا۔

یہ گیا نا کا ہاتھ تھا اور خود گیا نا اب ڈکنس کے سامنے تھی۔ لانبا قد۔ سڈول جسم اور انتہائی خوبصورت۔ وہ کچھ نڈھال سی تھی لیکن ڈکنس کو اُوپر اُٹھا کر ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔ اُس کا تبسّم ہنسی میں بدلا اور پھر قہقہے کی منزل بھی آگئی اور ڈکنس چپ چاپ اس کی آنکھوں میں ایک رنگ آنے اور ایک رنگ جانے کی حکایتیں پڑھتا رہا۔ کبھی اُن میں چمک پیدا ہوئی اور کبھی مایوسیوں کی لہر دوڑ جاتی۔ ڈر اور جرأت کے ملے جلے احساسات نے اسے فطرت کی نفیس ترین ہستی بنادیا تھا۔

روم کی یہ خوبصورت دوشیزہ گیا نا ہمارے اور آپ کے لیے ذرا بھی اجنبی نہیں، وہ ہماری ہے۔ آپ پہچانے؟ گیا نا یورپ میں اردو سے رغبت رکھنے والی ان چند خواتین میں سے ایک ہے جو اُردو ادب سے صرف دلچسپی ہی نہیں لیتیں بلکہ اس سے گہرا تعلق رکھتیں ہیں۔ آج گیا نا اپنے فلیٹ میں ایک ایسے فوجی کو خوش آمدید کہہ رہی تھی جو آگے چل کر ہم سب کے لیے ایک عجیب کردار بن کر ہمارے سامنے آیا، اُس نے ہمارے اُردو ادب کو ایک ایسی دلکش شخصیت عطا کی جو یورپ میں رہ کر ہماری طرح سوچتی ہے ہماری طرح بولتی ہے۔ گیا نا جنگ سے پہلے ہی اُردو میں کافی دسترس حاصل کرچکی تھی وہ جنگ کے دوران فاشسٹوں کے نرغے میں اپنی مرضی کے خلاف کام کرتی رہی، اب معاہدہ صلح کے بعد وہ بھی اپنی دوسری ہم عمر لڑکیوں کی طرح اتحادیوں کے رحم وکرم پر تھی۔ لیکن اس کے حصے میں جو نوجوان سارجنٹ آیا وہ خود روتا ہوا آیا۔ ایک دردمند اور حساس سپاہی جو جنگ کے شعلوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلیتا۔ وہ امن کا حامی اور جنگ کا زبردست مخالف تھا، لیکن زبردستی محاذ جنگ پر بھیجدیا گیا تھا۔ آج ایک حسین دوشیزہ کے فلیٹ میں داخل ہو کر اس کا دل تڑپ اُٹھا۔

سارجنٹ ڈکنس نے گفتگو شروع کرتے ہوئے اس بات کو ملحوظ رکھا کہ انگریزی ٹوٹی پھوٹی ہو۔ تاکہ گیا نا سمجھ سکے، ڈائری میں انگریزی تحریر دیکھ کر وہ کم از کم یہ تو سمجھ ہی چکا تھا کہ سامنے بیٹھی ہوئی اطالوی دوشیزہ انگریزی جانتی ہے۔ اس نے کہا میں "ڈکنس ہوں" ——— آپ کے شہر کی مغربی کمانڈ کا سارجنٹ" ——— ایک نقرئی قہقہہ بلند ہوا۔ جس میں بھوک کی شدت کے باعث وہ کھنک تو نہیں تھی جو ہونی چاہیے تھی لیکن وہ پھر بھی ایک دلکش قہقہہ تھا، یہ اور بات ہے کہ بھوک اور پژمردگی نے اس کے صوتی تار توڑ دیئے تھے۔ گیا نا نے فوراً ہی ڈکنس کو شستہ انگلش میں جواب دیا۔

"جناب آپ مجھ سے اسی طرح گفتگو کریں جس طرح ایک انگریز لڑکی سے کرسکتے ہیں۔ میں انگریزی جانتی ہوں۔ ایٹن اور آکسفورڈ میں پڑھی ہوں۔ اگر آپ کو ناگوار خاطر نہ ہو تو کسی ہندوستانی مترجم کو لے آیئے میں اردو میں بھی گفتگو کرسکتی ہوں۔ آکسفورڈ کے زمانے میں انڈیا لائبریری میں تقریباً

تمام قابلِ ذکر اُردو کتابوں کا مطالعہ میں نے کرنل لارنس کے ساتھ کیا ہے جو اُردو پر کم از کم آپ کے ملک میں ایک اتھارٹی ہیں۔

ڈکنس اس غیر ضروری تعارف پر بوکھلا گیا۔ اس نے کچھ عجیب تلملاہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"گیانا! میں آپ سے کوئی بحث کرنے نہیں آیا صرف آپ کے رقعہ کے جواب میں بذاتِ خود حاضر ہوا ہوں"۔

بتلایئے ا ــــــ

ڈکنس اس عجیب و غریب لڑکی کو دیکھ دیکھ کر متحیر ہو رہا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ اطالوی بچے اور کم عمر لڑکیاں اتحادیوں کی صورت ہی دیکھ کر بھاگ جاتی ہیں۔ دروازے دھڑا دھڑ بند ہونے لگتے ہیں لیکن گیانا میں تو اُسے محکوم اطالیہ کی تڑپتی ہوئی جوان روح نظر آئی جو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کر سکتی ہے۔ اپنی شرائط پیش کر سکتی ہے اور منوا بھی سکتی ہے۔

ڈکنس نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔ "کچھ کھانا ہے اور کیا کھانا ہے؟"

گیانا نے جواب دیا۔ "آپ کا اس وقت تک کا برتاؤ دیکھ کر میں آپ سے بطور انسان ہی گفتگو کر رہی ہوں ورنہ کچھ کھانے کے لئے میں آپ کو بھی جانور بنائے بغیر نہ چھوڑتی ـــ اب جب کہ آپ کے اندر کا انسان اپنی جگہ موجود ہے، میری غیرت صرف ـــ "دو تین ڈبل روٹی اور ایک دو پاکٹ سگرٹ ـــ مانگنے کی اجازت دے رہی ہے۔

ڈکنس نے فوراً ہی بات کاٹی۔ "میڈم میں جس رجمنٹ کا سپاہی ہوں وہ اطالوی باشندوں کے ساتھ اپنے برتاؤ میں منفرد حیثیت کی حامل رہی ہے۔ مجھ سے آپ کوئی ایسی توقع نہ رکھیں جسے کل کوئی دھوکہ دہی اور بدتہذیبی سے منسوب کرے۔ میں جنگ لڑنے ضرور آیا ہوں لیکن کب؟ جب مجھے بھرتی والے دفتر میں جھونک دیا گیا۔ میں وطن کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن کسی اور طرح اور آج آپ کے کام آ کر میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گا کہ میں نے جنگ لڑ لی ہے اور حقیقی کامیابی بھی حاصل کر لی ہے"۔

گیانا کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو اُبل پڑے وہ اپنے صوفے سے اٹھی اور بے اختیار اجنبی سپاہی سے لپٹ پڑی۔ جذبات کی شدت نے اُسے پاگل کر دیا تھا۔

ڈکنس نے اُسے بڑی مشکل سے اپنے سینے سے الگ کیا اور برابر کے صوفے پر بٹھلاتے ہوئے کہا۔

"گیانا چلو کہ میں تمہیں کچھ دے دوں"۔ لیکن گیانا نے کہا۔ "اب میں تمہارا انتظار کروں گی۔ تم ضرور آؤ گے۔ میں چل نہیں سکتی۔ کافی نڈھال ہوں۔ کسی ٹریفک کا بھی بندوبست نہیں"۔ اور ڈکنس رخصتی بوسے کے بعد چلا گیا۔ گیانا اس قدر بشاش تھی کہ جیسے ایک ہی آن میں اُسے ڈبل روٹیوں سے بنا ہوا ایک انسان مل گیا ہے جس کے پاس سب کچھ ہے اور قدرے سنجیدگی سے حرکت کرنے والا دل بھی۔

گیانا اور ڈکنس کی ملاقاتیں کافی دن جاری رہیں، اسی دوران میں ڈکنس گیانا کی اردو دانی آزمانے کے لئے اُسے ہندوستانی رجمنٹ لے گیا اور S، D، F کے پروگراموں میں اُسے کام کرنے کا موقعہ دیا۔ گیانا روزانہ اُردو ڈراموں اور ہلکے پھلکے ناچ گانوں کے ورائٹی پروگراموں میں حصہ لیتی وہ ایک ماہر رقاصہ بھی تھی۔ بعد میں اس نے "لیلیٰ" کا کردار بھی انجام دیا اور اس کردار کی تمثیل نگاری میں وہ جوہر دکھلائے کہ ہندوستانی اسٹیج کی بہت سی لیلائیں "ماند پڑ گئیں۔ گیانا نے اس عرصے میں ایک چھوٹا سا ڈرامہ "بڑے خان" بھی پیش کیا جس میں ایک ہندوستانی سیٹھ کا قبل از جنگ یورپی سفر دکھایا گیا تھا۔ اس ڈرامہ میں صرف ایک ہی کردار سامنے آتا ہے اور وہ ہے "بڑے خاں" کا۔ باقی روم کا شہر اور باشندے ہیں۔ گیانا کی اُردو اس قدر رکلاسیکی تو نہیں کہ اس ڈرامے کو شاہکار کہا جائے لیکن اسے معمولی سی درستی کے بعد ایک قابلِ تمثیل ڈرامہ بنا دیا گیا تھا۔ اس

ڈراما کی سپر ورژن انقلابِ حسن اور   منوہر گھوشطے نے کی تھی جو اسی ٹروپ کے ہندوستانی لوکار تھے۔ گیانا اس ڈرامے کے ایک سین میں غالب کی غزل ——
"دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی" بڑی عمدگی سے گاتی تھی۔ جب وہ اسٹیج پر آتی تو ایک آگ سی لگ جاتی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی کہنہ مشق ہندوستانی مغنیہ گا رہی ہو۔ وہ اس ٹروپ کے ساتھ ٹورنٹو اور فلورنس بھی گئی اور جگہ جگہ اُردو دان سپاہیوں سے خراجِ عقیدت حاصل کیا۔ ہندوستانی سپاہیوں کی وطن کو مراجعت کے بعد گیانا ڈکنس کے ساتھ لندن چلی گئی۔ ڈکنس سے اُسے بے انتہا محبت تھی لیکن کیتھولک مذہب کی اس قدر کٹر پیرو تھی کہ جب تک ڈکنس بھی کیتھولک نہ ہو گیا اس سے شادی نہیں کی۔ عورت کی محبت نے آخر مرد کے مذہب پر فتح پائی اور وہ دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن گئے۔ لیکن اس کی عمر نے وفا نہ کی اور ۲۸ جون ۱۹۶۲ء کو سرے (SURREY) کے ایک گاؤں میں اُس نے وفات پائی۔

گیانا نے اردو ادب کے لیے کیا چھوڑا؟ "بڑے خان" اور ایک بچی این (ANNE) جو اب انگریزی کے ساتھ ساتھ گھر پر اُردو بھی پڑھ رہی ہے۔ اُس کی زندگی خود ایک ڈراما ہے اور اردو سے اس کی والہانہ عقیدت ہم سب کے لئے ایک تازیانہ ہے۔ گیانا نے ایک دفعہ ایک آرٹسٹ سے ایک دفعہ کہا۔

"میں اُردو پڑھتی ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں مشرق کے ایک زبردست اور عالیشان ماضی کے ہنڈولے میں جھول رہی ہوں مجھے اس کا حال اچھے مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔"

آج گیانا نہیں لیکن اس کے شہر روم میں کم از کم یورپ کی حد تک اردو کی سب سے بڑی فیکلٹی ہے جہاں سے ہر سال درجنوں اطالوی اور دیگر قوموں کے طلباء اُردو میں فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں اور اردو لائبریری کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا فوٹو ہمیشہ مسکراتا رہتا ہے اس احساس سے کہ اس کا شہر اپنے عظیم ماضی کے تقاضوں کو کس خوش اسلوبی سے پورا کر رہا ہے۔

حضرت شاہ نرالے میاں

کراچی شہر کو اپنے پیرانِ کرام اور مخدومانِ نیک نام پر ناز ہے جن کے دم قدم کی برکت سے یہ دیارِ عظیم اقطاعِ عالم میں ممتاز ہے سبحان اللہ کیا کیا عالمانِ باعمل اور کیسے کیسے فاضلانِ بے بدل اس بستی میں بستے ہیں کہ اپنی شگفتگیٔ طبع اور شادابیٔ فکر کے سبب طاقِ علم و عمل کے گلدستے ہیں منجملہ ان کے حضرت شاہ نرالے میاں کی ذاتِ والاصفات ہے کہ از سرتا پا مجموعۂ عجائبات ہے، عام طور پر شہرت ہے کہ شاہِ جنات ـ زعفر جن ـ آپ کا موکل و مرید ہے اور کوہ قاف کی پری، ملکۂ زمرد سبز پوش آپ کے زیرِ فرمان بلکہ ہزار جان سے حضرت پر قربان ہے۔

عامل کامل حضرت شاہ نرالے میاں مدظلہ العالی دکن کے باشندے اور مشائخ زادے ہیں۔ لڑکپن سے علم کے بجائے عمل.. درسیات کے بجائے عملیات کا ذوق شوق مشہور ہے کہ ستہ بجا کی پہاڑیوں میں ایک بہنہ چٹان پر بیٹھ کر چالیس روز تک "تسخیر شمس" کا چلہ کھینچا۔ چالیس ویں روز زمین شق ہوئی۔ اور ایک بتلا آتغیس زمین سے برآمد ہوا۔ زمین خدمت چوم کر حضرت سے عرض کرنے لگا کہ۔

غلام کو کیوں یاد فرمایا گیا ہے۔

شرط یہ تھی کہ جب تک چلہ ختم نہ ہو ایک لفظ زبان سے نہ نکالا جائے۔ پتلے کے مخاطب ہوتے ہی حضرت چونکے اور اس کے سوال کا جواب دینا چاہا۔ ابھی ایک لفظ بھی ان سے نہ نکلا تھا۔ کہ پتلے نے قہقہہ مارا اور "تا" فانا" بالشت بھر کا مجسمہ" دیو" بن گیا حضرت اس عجوبے پر حیران اور اس لطیفے سے پریشان تھے۔ کہ اس دیوزاد نے ایک ہیبت ناک

نعرہ درویشی گرج کے نکالا۔

پیرزادہ اور مشائخ زادہ ہے یعنی تجھیں تیرے بزرگوں کی رعایت منظور ہے۔ ورنہ ابھی اس عذاب سے قتل کرتا کہ ماہیان دریا اور مرغان ہوا تک تیرے افعال پر گریہ وزاری کرتے۔ بہتر ہے کہ اس خبط سے باز آ۔ اور ہمارے معاملات میں ٹانگ نہ اڑا۔ غیظ و غضب کے عالم میں یہ خوفناک الفاظ ادا کرنے کے بعد دھواں سمٹنا شروع ہوا۔ اور جس طرح ہوا نکلتے ہی ربر کا غبارہ پچک جاتا ہے چشم زدن میں سمٹ سمٹا کر فضا میں تحلیل ہوگیا۔ نرالے میاں کا یہ حال کہ تھرا کر زمین پر گر پڑے۔ اور کانپ کر بے ہوش ہوگئے۔ اور مستند روایت ہے کہ اس واقعۂ ہائلہ کے بعد کہ انسان کا کلیجہ شق اور خود فرشتے کا رنگ فق ہو جائے۔ نرالے میاں کا جوش و خروش اور بڑھ گیا۔ اور انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ جب تک شاہ جنات اور سلطانۂ قاف کو قابو میں نہ لاؤں گا۔ کسی کو منہ نہ دکھاؤں گا۔ چنانچہ عاملان کامل اور زاہدان مرتاض کی تلاش میں بسوئے صحرا نکل گئے۔ عرصہ تک دریائے تاپتی کی وادی میں ناپتے اور زمین کا گز بن کر دشت و بیابان ناپتے رہے۔ آخر ایک دن دلی مراد بر آئی۔ اور ایک جہاندیدہ عامل شاہ کبیر تیموری کی خدمت اقدس میں باریاب ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان بزرگ کی عمر ایک سو بیس سال کی تھی۔ دلّی مرحوم کے شاہزادوں میں شامل تھے۔ اور غدر کی تباہی میں خانہ برباد ہو کر بندیل کھنڈ کی طرف نکل گئے تھے۔ ازبسکہ رگوں میں تیموری خون موجزن تھا۔ اور گہوارے سے تاج و تخت کے سایہ میں پلے تھے۔ اس لئے آوارۂ غربت ہو کر بھی ظلِ شاہی بن گیا۔ اور انسانوں کے بجائے بزور عمل جنوں کو اپنے زیر فرمان لائے اور شاہِ جنات کے دربار عظمت آثار میں بہ منصب وکیل مطلق و امیر الامرا ترقی پائی۔ "نرالے میاں" کی قسمت کا ستارہ سامنے تھا کہ برسوں صحرائے غربت میں بھٹکنے کے بعد حسن اتفاق سے "شاہ کبیر تیموری" کی نظر کیمیا اثر پر چڑھ گئے۔ شاہ صاحب نے ان کے حال پر توجہ خاص مبذول فرمائی۔ کچھ جلالی اور جمالی عمل تعلیم کئے۔ چلہ کشی کے طریقے سکھلائے۔ "تسخیر شمس" اور "عمل معکوس" کے رموز سے آشنا کیا۔ موکلوں اور ہمزادوں سے تعارف کرایا۔ اور شدہ شدہ شاہ کبیر کی دست گیری سے "نرالے میاں" کی رسائی۔ شاہ جنّات کی محفل خاص تک ہوگئی۔ اور "شاہ جنّات" نے کمالات عجیب دیکھ کر موصوف کو عامل کامل کا خطاب اور اپنی ریش دراز کا ایک بال کہ سراپا کمال تھا۔ بر سبیل ارمغان و جاگیر عطا فرمایا۔ جناب موصوف اس روز سے عامل کے لقب سے مشہور اور کامل کے خطاب پر بجا طور سے مفتخر و مغرور ہیں۔ "شاہ کبیر تیموری" کی وفات تک حضرت انھیں کے ساتھ چپکے رہے کہ دنیا کی بہبود اور دین کی فلاح کا اقتضا ہی یہ تھا۔ ان کے وصال کے بعد جنگلوں سے بوریا بستر اٹھایا اور دلی آکر خواجہ کی چوکھٹ پر بیٹھ گئے۔ ازبسکہ شہرہ ان کے کمالات کا دور دور تک پہونچ چکا تھا۔ اس لئے بوریائے فقر پر بیٹھے بیٹھے قلوب مخلوق پر حکومت کرتے تھے۔ اسی زمانے میں حضرت نے ریاضت کے زور سے کوہ قاف کی شاہزادی ۔۔ ملکہ زمرد سبز پوش کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل فرمایا۔ اور عورتوں کے تمام مسائل و معاملات یعنی وزارت خواتین اس پری زاد کے سپرد کردی۔ جب ۴۷ء میں دلی میں غدر ثانی اور فساد لاثانی برپا ہوا۔ تو حضرت بقول خود شاہ جنات کی ہدایت پر ایک دیو زاد کے کاندھے پر سوار دلی سے کراچی تشریف لائے۔ اور "ریتی لائن" کے ریگستان میں ڈیرے ڈال۔ شیخ سعدی کے اس شعر کے مصداق ٹھہرے کہ

منعم بکوہ و دشت و بیابان غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

(ترجمہ) صاحب حیثیت آدمی نہ جنگل میں غریب ہے نہ بیابان میں۔ جہاں پہونچا خیمے گاڑ دیئے۔ اور جنگل میں منگل کا سماں کر دیا۔

شدہ شدہ اہل کراچی کو معلوم ہوگیا۔ کہ ایک عامل کامل اس شہر میں آیا۔ اور زن و مرد کے قلوب میں سمایا ہے۔ چنانچہ عوام و خواص آپ کی طرف رجوع لائے۔ جسے دیکھو دامن مراد پھیلائے باب عالی پر کھڑا ہے۔ جسے پاؤ سرِ نیاز جھکائے آستان جلالی پر پڑا ہے۔ مردوں کا الگ ہجوم ہے۔ عورتوں کی الگ ہمہمہ ہے حضرت ازبسکہ رجوعات خلق سے گھبرا گئے ہیں۔ یہ دیکھا تو راتوں رات ریتی لائن سے کھسک "ماری پور" سے بھی اس پار جا پہونچے کہ۔

کوئے جاناں سے خاک لائیں گے   اپنا کعبہ الگ بنائیں گے۔

لیکن رجوع خلق اور ہجوم مردم سے یہاں بھی چھٹکارا نصیب نہیں ۔ بقول شخصے ؎

ہر کجا چشمۂ بود شیریں
مردم و مور و مار گرد آیند

(ترجمہ) جہاں میٹھے پانی کا چشمہ ہوتا ہے ۔ آدمی تو آدمی ۔ سانپ چیونٹی تک وہاں اکٹھے ہو جاتے ہیں ۔

ذیل میں حضرت نرالے میاں عامل کے کچھ کمالات درج کئے جاتے ہیں ۔ جن سے اندازہ ہوگا کہ یہ بزرگوار جلالت مآب مخلوق کہلانے سے بیگانہ رہنے کے باوجود خلق خدا کی بہبودی کی کیسی کیسی تجاویز مرتب فرمائے بیٹھے ہیں ۔ مثلاً مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ تھا ۔ نرالے میاں صاحب قبلہ کو بخوبی احساس ہے کہ جب تک مہاجرین قرار واقعی آباد نہ ہو جائیں گے یقیناً نہیں کہ ملک کی دقتیں رفع اور مملکت کی پریشانیاں دور ہوں ۔ چنانچہ مہینوں تک اس مسئلہ پر غور و خوض فرمانے کے بعد حضرت نے خانہ برباد مہاجرین کی آبادکاری اور بحالی کی ایک اسکیم مرتب فرمائی ۔ اور وہ اسکیم چھوٹے لاٹ صاحب بالقابہ بہ اجلاس کونسل کے حضور میں بھیج دی گئی ۔ خلاصہ اسکیم کا یہ تھا کہ

جس طرح حاتم طائی نے دیوزادوں اور جنوں کی مدد سے راتوں رات ایک شہر زرنگار بیابان میں آباد کر لیا تھا ۔ اسی طرح آج بھی کوہ قاف کے طلسمی معماروں اور عالم پرستان کے سحرکار مہندسوں کی امداد سے یہ کام کیا جا سکتا ہے ۔ ترکیب صرف یہ ہے کہ حکومت پاکستان عامل صاحب کی خدمت میں پانچ ہزار اشرفیاں زر سرخ کی پیش کرے ۔ حضرت اس رقم سے دیوزادوں کی دعوت کا سامان مہیا کریں گے ۔ اور جب لوازمۂ ضیافت فراہم اور آذوقۂ دعوت بہم پہنچ جائیگا ۔ تو شاہ جنات کی مونچھ کا بال جو حضرت کے پاس بطور امانت موجود ہے ۔ پتھر پر گھس کر آناً فاناً جنوں اور دیووں کی فوج کوہ قاف اور پرستان سے بلوائی جائے گی یہ فوج طرفہ موج گھڑی کی چوتھائی میں کراچی کے برابر ایک نیا شہر آباد کر دے گی کہ ہفت عجائبات عالم میں شمار ہوا کرے گا ۔

"نرالے میاں عامل" کو یقین ہے کہ اگر اس نسخے پر عمل کیا جاتا تو مہاجرین کی آبادکاری اور بحالی کا مسئلہ بغیر کسی جھنجھٹ کے چٹکی بجاتے حل ہو جاتا ۔ اور صرف پانچ ہزار اشرفیوں میں وہ کارنامہ انجام پا جاتا کہ رہتی دنیا تک یادگار رہتا ۔

حضرت صاحب ازبسکہ روشن ضمیر صاف باطن اور نکتہ رس دماغ کے بزرگ واقع ہوئے ہیں ۔ اس لئے کثرت اشغال اور ہجوم وظائف کے باوصف (کہ وظیفۂ زوجیت ان میں درجۂ اول کی اہمیت رکھتا ہے) کسی وقت صنف نازک کی بہبودی اور جنس جمیل کی بہتری کے خیال سے غافل نہیں ہوتے ۔ اس میں بھی آپ کے نکتہ آفریں دماغ نے ایسی تجویز بہا نٹی ہے کہ سبحان اللہ و ماشاء اللہ ۔

نرالے میاں صاحب قبلہ کی تجویز یہ ہے کہ پاکستان کی پری جمال بیگمات کو ۔ اپوا کی شکل میں منظم ہیں ۔ قاف کی سلطانہ یعنی ملکہ زمرد سبز پوش کو اپنی مجلس کا صدر چن لیں کہ پریزادوں کی افسر اور حسن و نزاکت میں حوران خلد سے بہتر ہے ۔ اس کی بزم نشاط کی ہر پری کا دعویٰ ہے کہ ؎

شوخی سے نزاکت سے شرارت سے بھری ہوں
شمشاد مرا نام ہے میں لال پری ہوں !

حضرت کو یقین ہے کہ ملکۂ قاف کے فیض صحبت اور حسن تربیت سے بیگمات پاکستان فنون ناز و دلربائی اور اسرار حسن و رعنائی کی ان باریکیوں سے آشنا ہو جائیں گی ۔ کہ پیرس و لندن کی دوشیزائیں رشک کے مارے زہر کھا کر مر جائیں گی ۔ کاش پاکستان کی خواتین نکتہ نواز اور دختران طناز حضرت موصوف کے اس مشورے پر عمل پیرا ہو سکیں ۔

فی الحال حضرت عامل صاحب سندھ کے دورہ پر تشریف لے گئے ہیں ۔ خبر گرم ہے کہ انھیں صوبہ سندھ کے ایک سجادہ نشین نے کہ بیک وقت
(باقی صفحہ ۔۔ پر)

امین الرحمٰن

جرمنی کی الف لیلہ

اردو کے فاضل ادیب اور انشاء پرداز جناب امین الرحمٰن نے ۱۹۵۴ء میں عظیم جرمن ادیب و شاعر ہائنا کی مشہور تصنیف "فلورنس کی راتیں" کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، اس کتاب کے تعارف کے طور پر مترجم نے ہائنا کی نثر نگاری اور "فلورنس کی راتیں" پر ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ جسے موصوف نے ہماری درخواست پر انشا کے لئے مرحمت فرمایا ہے۔ یقین ہے کہ انشاء کے ادب دوست قارئین اسے خاص طور پر پسند فرمائیں گے۔ (ادارہ)

جرمن شاعر ہائن رش ہائنا صرف ایک نازک خیال شاعر ہی نہ تھا جس کی شاعری میں ہمیں بہاروں، پھولوں، ہواؤں، بادلوں اور سمندروں کا ایک غم آلود ذکر ملتا ہے۔ ہائنا نے جرمن زبان کی ٹھوس صلیبت اور پختگی کو ایک شاعرانہ لوچ ایک شاعرانہ نازک خیالی ہی عطا نہیں کی بلکہ ہائنا نے جو ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحب طرز نثر نگار بھی تھا، جرمن قوم کے احساس حسن کو، اور ذوقِ طنز و مزاح کو اپنی نثر میں ایسا اظہار بیان عطا کیا ہے کہ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر نثر کے معاملے میں جرمن ادب میں اُس کی کوئی نظیر نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہائنا کی نثر میں جو توازن، نفاست اور شعریت پائی جاتی ہے وہ بہت کم جرمن ادیبوں کے حصے میں آئی ہے۔

ہائنا کو جرمن زبان سے عشق تھا اور یہی وجہ ہے کہ اُس کی بیقرار روح کی والہانہ تڑپ اور درماندہ طبیعت کے سوز و گداز کا جس طرح جرمن نظم میں اظہار ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے نظم کے علاوہ جرمن نثر پر بھی کتنی زبردست قدرت حاصل تھی اور جرمن زبان کے اظہار بیان کی خصوصیات کا اُسے ایک ماہر زبان کی حیثیت سے کس قدر علم تھا چنانچہ اُس کے لکھے ہوئے نثر کے ہر پارے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نثر کے ہر فقرے ہر جملے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ادا کرنے کے لئے جن کے موضوعوں کی وسعت کا کوئی ٹھکانا نہیں، جرمن زبان میں، ہر موقع کے مطابق کس طرح ایک خاص قسم کا لوچ ایک خاص قسم کی شعریت، اور ایک خاص قسم کی گہرائی پیدا کر لیا کرتا تھا۔ تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال تو ایک پرانی بات ہے۔ لیکن ہائنا نہ صرف اپنی نثر میں اچھوتی تشبیہیں، نادر استعارے ہی استعمال کرتا ہے بلکہ اُس کی نثر میں نئی نئی اور چونکا دینے والی تمثالوں کا ایک بہت

جا ذخیرہ بھی ملتا ہے۔ اُس کی نثر میں کئی تمثالیں ایسی ملتی ہیں جن کے استعمال پر بیسویں صدی کی تحریک ماورائے واقعیت نے بہت زور دیا ہے۔ اس قسم کی تمثالیں خصوصیت سے اُس کی نثری کتاب "کتابِ عظیم" میں بہت ملتی ہیں مثلاً "میرے دل میں دردِ دنداں ہو رہا تھا" یا "اس کی آنکھیں سیاہ کافی کے دو بڑے بڑے پیالے ہیں"۔ انہیں تمثالوں کے استعمال سے ہائنا کی نثر میں ایک ایسی چونکا دینے والی نُدرت پیدا ہوگئی ہے جو اصل جرمن زبان کے مزاج کے مطابق تو ہے لیکن جسے کسی دوسری زبان میں اس طرح لانا کہ غیر مانوس اور غریب معلوم نہ ہو بےحد مشکل کام ہے۔

ہائنا نے نظم ونثر ہر دو اصناف میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اُس نے چھوٹے چھوٹے گیت اور چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھی ہیں۔ اُس نے بڑی بڑی طویل نظمیں اور بڑے بڑے لمبے منظوم قصے لکھے ہیں۔ اُس نے بیانیہ نظمیں بھی لکھی ہیں اور حمدیہ نظمیں بھی۔ پھر اُس نے ڈرامے لکھے ہیں۔ اخباروں کے لئے تبصرے اور تنقیدی مقالے لکھے ہیں، سیروسیاحت کے وقائع لکھے ہیں، اپنی اور دوسروں کی سوانحی یادداشتیں لکھی ہیں۔ اُس نے کوئی مکمل ناول تو نہیں، ہاں کچھ ناولوں کے اقتباس اپنے پیچھے ضرور چھوڑے ہیں۔ اُس نے پرستانی کہانیاں لکھی ہیں مختلف مسائل پر پمفلٹ لکھے ہیں، تاریخ ادب مرتب کی ہے۔ فلسفے پر لکھا ہے۔ سیاسی مضامین قلمبند کئے ہیں، غرض اُس نے جرمن نظم ونثر کا کوئی پہلو، کوئی صنف ایسی نہیں چھوڑی جس پر اُس نے کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ ہائنا نے کوئی مکمل ناول، کوئی مکمل رومان، یا کوئی مکمل افسانہ اپنے پیچھے نہیں چھوڑا۔ لیکن میرے خیال میں یہ بات صحیح نہیں "فلورنس کی راتیں" ایک مکمل طویل افسانہ ہے۔ اسے جدید طرز کا طویل مختصر افسانہ تو نہیں سمجھنا چاہئے لیکن اسے ہم بڑی آسانی سے ایک قصہ ضرور کہہ سکتے ہیں اسے ہائنا نے اٹلی کی سیاحت کے بعد، اپنے پیرس کے قیام کے دوران میں ۱۸۳۶ء میں ایک فرانسیسی رسالے "ریوو دے دُو موند" (رسالۂ ہر دو عالم) کے لئے لکھا تھا۔ ہائنا نے ۱۸۲۸ء میں سیروسیاحت کی غرض سے اٹلی کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس سیاحت کے دوران میں اُس نے اٹلی کے مشہور شہروں مثلاً جنیوا، لیگھارن، لکا اور فلورنس کی زندگی، اُن کے آثارِ قدیمہ اور اُن کے مناظر کا دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ پہلی بار ہائنا کو اٹلی کی اصل زندگی کو قریب سے دیکھنے اور اُس کی دلفریبیوں سے متاثر ہونے کا موقع ملا۔ زیتون کی سی رنگت رکھنے والی حسین اطالوی خواتین میں گھلنے ملنے کے مواقع میسر آئے۔ لکا کی سیروسیاحت کے بعد ہائنا نے اٹلی کے قدیم خوبصورت شہر فلورنس کا رُخ کیا۔ فلورنس شہر کی خوبصورتی، اُس کے آثارِ قدیمہ اور اطالوی حسیناؤں نے ہائنا کے احساسِ حُسن کو اس طرح گدگدایا کہ اُس نے اِسی شہر میں بیٹھ کر اپنی کتاب "اطالوی خاکے" لکھنی شروع کردی۔ لیکن اس شہر کی رومانی زندگی نے ہائنا کے حُسن پرست دل پر کچھ اور نقوش بھی ثبت کئے جن کا نتیجہ بعد میں "فلورنس کی راتیں" جیسی عجیب وغریب مگر دلچسپ داستان کی صورت میں برآمد ہوا۔

یہ ۱۸۳۵ء کا ذکر ہے۔

اُن دنوں ہائنا اپنی فرانسیسی محبوبہ ماٹیلڈ کے ساتھ پیرس شہر کے ایک وسطی علاقے میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ ابھی اُس نے ماٹیلڈ کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم نہیں کئے تھے۔ اُن دنوں اُس کے دل ودماغ کو عجیب عجیب قسم کی رومانی پریشانیاں مضطرب کرتی تھیں۔ اس کی بڑی وجہ ہائنا کی یہ شوخ وشنگ فرانسیسی محبوبہ تھی۔ وہ ایک بے باک قسم کی عورت تھی جس کے بارے میں پیرس، اور خاص کر جرمنی میں طرح طرح کی افواہیں مشہور تھیں۔ ہائنا کی یہ محبوبہ پیرس کے اُس معمولی طبقے سے تعلق رکھتی تھی جس کی عورتوں کو فرانسیسی زبان میں گری یعنی بھورے لہنگے والیاں کہا جاتا ہے۔ اسی لئے لوگ ہائنا کو جو اس قسم کی ایک معمولی حیثیت کی عورت کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، اور جو اُن کے خیال کے مطابق اُسے بیوقوف بنا رہی تھی قابلِ رحم سمجھتے تھے لیکن ہائنا کے بہت ہی قریبی دوستوں کا خیال تھا کہ اس عورت کو ہائنا سے واقعی محبت ہے۔ وہ ہائنا کو ہر وقت، ایک بگڑے ہوئے شوخ وشریر بچے کے مانند تنگ کرتی رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہائنا اُس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارے لیکن ہائنا کے لئے اپنے رومانی فرائض

سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ قوت لایموت کی خاطر اپنے ادبی مشاغل جاری رکھنا بھی ازبس ضروری تھا۔ اس لئے وہ ایک ایسی خلوت چاہتا تھا جس میں ماطیلد کی آرزو خیز بے باکی کا کوئی دخل نہ ہو کیونکہ اس بھوبرے لہنگے والی حسینہ کی موجودگی ہائنا کی ادب و شعر کی تمام خلاقانہ قوتوں کو کُند کر کے رکھ دیتی تھی۔ چنانچہ ہائنا کی قوت تخلیق کے لئے یہ روز و شب بڑے صبر آزما تھے۔ انہیں دنوں وہ فرانسیسی رسالے "ریے دو دُیے" ڈھونڈ نکیلئے مضامین لکھا کرتا تھا۔ اسی آشوب خانہ میں ۱۸۳۶ء کے لگ بھگ ہائنا نے اس رسالے کے لئے ایک طویل قصّہ لکھنا شروع کیا جس کا جرمن عنوان فلورنیتنش ناختا " یعنی "فلورنس کی راتیں" تھا۔

غالباً ہائنا نے "فلورنس کی راتیں" کا عنوان الف لیلہ کے مغربی نام کی رعایت سے رکھا تھا کیونکہ اس طویل قصّے کے آغاز اور انداز داستان گوئی میں اپنی تمام مغربی فضا کے باوجود الف لیلہ کے "قصہ در قصہ" انداز کی کسی قدر جھلک ملتی ہے لیکن حقیقت میں تو اسے مغربی داستان گوئی ہی کا ایک نمونہ سمجھنا چاہیئے ـــ لیکن بوکاچیو کی "ڈی کامیرن" سے بالکل مختلف۔ "فلورنس کی راتیں" میں بھی بہت سے شرقی اور مغربی قصوں کے مانند ایک داستان سے دوسری داستان نکلی چلی آتی ہے لیکن ہائنا نے اس انداز بیان میں بہت حد تک ترمیم کر دی ہے کیونکہ ہر بار وہ داستان میں سے داستان نہیں نکالتا بلکہ بہت سے تاریخی، معاشرتی، مذہبی، یا سیاسی مسائل بھی بیان کرنے لگ جاتا ہے۔

اصل کہانی کا کوئی خاص پلاٹ نہیں۔ اصل کہانی کے صرف دو کردار ہیں میکسی میلین اور ماریا۔ اس کے علاوہ شروع شروع میں دو نہایت ہی غیر اہم کردار بھی کہانی کی اٹھان میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک تو کوئی ڈاکٹر ہے اور دوسری ایک خادمہ حبش ڈبورہ۔ لیکن کہانی میں انہیں کوئی خاص کردار ادا نہیں کرنا پڑتا۔ ان کی موجودگی کہانی کے بعض واقعات کو ایک دوسرے سے منطقی طور پر مربُوط کرنے کے لئے ضروری سمجھی گئی ہے۔ فلورنس شہر کے کسی حصے میں میکسی میلین نام کے ایک شخص کی محبوبہ ماریا تپ دق میں بیمار پڑی ہے۔ ڈاکٹر نے مریضہ کو ملنے جلنے اور بات چیت کرنے سے سخت منع کر رکھا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے محبوب کی موجودگی میں اپنے جذبات اور اپنی گویائی پر قابو نہیں رکھ سکتی اور اس سے باتیں کرنا بھی چاہتی ہے اور پیار بھی۔ ان حالات میں میکسی میلین ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اُسے اس طرح باتوں میں لگائے رکھتا ہے کہ اس کی محبوبہ کو بہت کم بولنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ میکسی میلین کی دلچسپ باتوں کو بڑی دلچسپی اور اشتیاق سے سُنتی ہے۔ میکسی میلین اُسے اپنی زندگی کے عجیب و غریب قصّے سناتا ہے اور ایک قصّے میں سے دوسرا قصہ نہایت چابکدستی سے نکالتا چلا جاتا ہے۔ ان قصّوں سے ہمیں میکسی میلین کے کردار کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے دلچسپ قصّوں کی پُراسرار روشنی میں ایک عجیب و غریب کردار نظر آنے لگتا ہے کبھی اُسے اپنے لڑکپن میں ایک یونانی دیبی کے مرمریں مجسّمے کو جسے اُس نے اپنے آبائی "قلعے" کے اُجڑے ہوئے پائیں باغ میں دیکھ لیا تھا، چومنے کی بے پناہ خواہش پیدا ہوتی ہے تو کہیں اُس کے دل میں زندہ عورتوں کے بجائے مجسموں اور تصویروں سے والہانہ عشق کرنے کا ایک مریضانہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کبھی وہ کسی مردہ لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو کر بالکل خلوت گزیں ہو کر بیٹھ جاتا ہے تو کہیں اسے گلیوں اور بازاروں میں رقص کا تماشا دکھانے والی ایک بازی گر لڑکی مادامواژیل لورانس سے دلچسپی ہو جاتی ہے لیکن ان تمام قصّوں میں سے مادامواژیل لورانس کا قصہ سب سے زیادہ دلچسپ اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے۔ اس قصّے میں اسرار، دہشت اور رومان کی وہی فنکارانہ آمیزش موجود ہے جسے ہائنا سے ربع صدی قبل تھیوڈور ہوفمان نے جرمن ادبیات میں اپنے اسرار و دہشت کے افسانوں کے ذریعے سے متعارف کیا تھا۔

۱۸۲۷ء کے لگ بھگ نوجوان ہائنا برلین میں مقیم تھا۔ انہیں دنوں وہ گوبتس سے جو برلین کے مشہور فیشن ایبل رسالے "گیسل شافتر" کا ایڈیٹر تھا متعارف ہوا جس نے بعد میں ہائنا کو اس زمانے کے بہت سے جرمن . . . ادیبوں اور شاعروں سے روشناس کرایا۔ وہ دونوں کا فی دوا آل

ں اکثر جایا کرتے تھے۔ اسی کافے میں ہوفمان بھی آیا کرتا تھا۔ ہوفمان اُن دنوں اپنے افسانوں کی وجہ سے بہت مشہور ہو رہا تھا۔ سارے یورپ میں اُسکی اسرار و دہشت کے افسانوں کا چرچا ہو رہا تھا۔ گوبتس نے ہائنا کو ہوفمان سے بھی ملوا دیا۔ ہائنا کو ہوفمان کی شخصیت بڑی دلچسپ نظر آئی۔ وہ دونوں ں اوقات انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ادبیات کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔ ہوفمان نے ہائنا کو اپنے اسرار و دہشت کے افسانوں کے ودے پڑھنے کے لیے دیئے جنہیں ہائنا نے بڑی دلچسپی اور اشتیاق سے پڑھا۔ اس لئے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ مادموازیل لو پانس کے قصے نداز بہت کچھ ہوفمان کے افسانوں کے دہشت و اسرار کے عناصر کی یاد دلاتا ہے حالانکہ ہائنا نے یہ قصہ ہوفمان کے انتقال کے چودہ برس بعد لکھا ا۔ ہوفمان کا انتقال ۱۸۲۲ء میں ہو چکا تھا۔

ان قصوں کے علاوہ "فلورنس کی راتیں" میں ہائنا نے اپنے وقت کی اطالوی، فرانسیسی اور جرمن سوسائٹی کے کچھ پہلوؤں کو بھی واضح کیا ہے۔ ر اپنے زمانے کے بعض مشہور موسیقاروں مثلاً پاگانینی، روزینی، بیلینی، اور لی تست کے خاکے بھی ہلکے پھلکے انداز میں کھینچے ہیں خاص کر پاگانینی کا خاکہ بڑا دلچسپ ہے۔ اس میں ہائنا نے حقیقت اور خیال کے ایک ایسے انوکھے امتزاج سے کام لیا ہے جس سے اُس نے اِس عظیم ترین اطالوی وائلن نواز کی نصیت کو اور بھی زیادہ پُر اسرار بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تمام قصے میں ہائنا نے اسرار کے عنصر سے بڑا کام لیا ہے قصے کے دونوں اہم کرداروں کی نصیت، اُن کے آپس کے مراسم، بڑے پُر اسرار ہیں۔ خاص کر میکسی میلین کا کردار تو بہت زیادہ پُر اسرار ہے۔ پھر چھوٹی ویری کا کردار بھی کم پُر اسرار یں اور مادموازیل لو پانس کے کردار میں تو نہ صرف اسرار کے عناصر بہت نمایاں ہیں بلکہ اس ضمنی قصے کے تمام کرداروں کی زندگی میں بہت حد تک مرار دہشت اور رومان کو دخل ہے۔ اور یہ سب کچھ ہائنا کی رومانیت پسندی کا نتیجہ ہے۔

رومانیت کی ہزار پہلو، تحریک ہائنا کے نوجوانی ہی کے زمانے میں، یعنی انیسویں صدی کے اوائل ہی میں بڑی سرعت سے جرمن ادب، مصوری، یقی اور فلسفے کو متاثر کر رہی تھی۔ اپنی شخصیت کے عنفوان شعور ہی میں ہائنا نے جرمن نقاد اور عالم شلیگل کی ہمہ گیر شخصیت کا اثر بہت حد تک دل کر لیا تھا جو جرمن رومانیت کی روحِ رواں تھا۔ ہائنا کی تمام تحریروں میں خواہ وہ نثر ہو یا نظم رومانی اندازِ خیال کے بہترین نمونے ملتے ہیں "فلورنس کی راتیں" تو اُس زمانے کے رومانی اندازِ تحریر کی ایک بہت مکمل تصویر ہے۔ اِس قصے میں پاگانینی کا ذکر کرتے ہوئے کہانی کے کردار یکسی میلین نے موسیقی کے ان اثرات کو جو پاگانینی کی وائلن سنتے وقت اس کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ الفاظ کا جو خارجی جامہ پہنایا ہے اُس سے رومانی انداز کا ایک ایسا تار و پود وجود میں آیا ہے جس سے ہمیں ہائنا کی حیرت انگیز قوتِ متصورہ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح ہائنا نے "فلورنس ں راتیں" کے آخری حصے میں مادموازیل لو پانس کے قصے کو جس انداز میں اختتام کو پہنچایا ہے اور قصے کے آخری واقعات کو جس انداز میں بیان کیا ہے کسی فراموش شدہ واقعے کا محض ایک رویائی تاثر معلوم ہوتا ہے جیسے گویا ہائنا کے رومانی تخیل نے ایک بار پھر حقیقت اور خیال کی دنیا میں اپنی خلاقانہ درت سے زندگی بخش دی ہو جن لوگوں نے ہائنا کی زندگی اور اُس کے سوانح کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے اُن کے لئے "فلورنس کی راتیں" پڑھ کر اس ات کا اندازہ کر لینا کہ میکسی میلین کے کردار میں ہائنا کے اپنے کردار کی ایک واضح جھلک ملتی ہے کچھ مشکل نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہائنا لڑکپن ہی سے جنسِ مخالف کی کشش سے بے پناہ طور پر متاثر تھا۔ وہ جب تک زندہ رہا عورتوں سے اُس کے مختلف قسم کے مراسم استوار رہے۔ اُس نے بی بی مریم سے لے کر ایک معمولی عورت تک کو اپنے گیتوں اور نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ "فلورنس کی راتیں" میں میکسی میلین نے عورتوں کے ساتھ جس قسم کی والہانہ دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور اطالوی اور فرانسیسی عورتوں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اُسے بڑی آسانی سے ہائنا کے اپنے خیالات اور جذبات سمجھا جا سکتا ہے۔ ہائنا کی نہایت ہی دلچسپ سوانحی یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے لڑکپن میں دو چار کردار ایسے ضرور تھے جنہوں نے اُس کے معصوم

دل و دماغ کو محبت کی ایک ہلکی سی آنچ سے گداز کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہائنا کے لڑکپن کا غالباً سب سے رومانی واقعہ اس کا ایک جلاد کی بیوہ کے گھر آنے جانے سے تعلق رکھتا ہے جو "دائی گوچن" کے نام سے مشہور تھی عملیات، تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک اُس کا پیشہ تھا۔ وہ ڈسلڈارف شہر کے باہر جو ہائنا کا مسقط الراس تھا سوسائٹی کے غیر مطبوع لوگوں کے مانند رہتی تھی۔ اس بیوہ کے ساتھ اُس کی ایک بھانجی جس کا نام سیفن یا جوزفا تھا رہتی تھی۔ یہ لڑکی ہائنا کی ہم عمر تھی جس کی اُس زمانے میں ابھی سیں بھیگ رہی تھیں۔ یہ لڑکی ہائنا کو عجیب و غریب قصّے کہانیاں، بھوت پریتوں کے واقعے اور ایسے لوک گیت سنایا کرتی تھی جن میں خوفناک توہمات کا ذکر ہوتا تھا۔ وہ خود ان کہانیوں کے بیان کرتے وقت اس قدر ڈر جاتی تھی کہ ڈر کر ہائنا کی آغوش میں گر پڑتی تھی اور اس سے چمٹ جاتی تھی۔ ہائنا نے جوزفا کو زندگی میں پہلی مرتبہ جن حالات میں پیار کیا اُس کا ذکر ہائنا نے رومانی چٹخارے لے کر اپنی سوانحی یادداشتوں میں ایک افسانے کے سے انداز میں کیا ہے۔ اسی قسم کے ایک رومانی پیار کی کیفیت ہمیں "فلورنس کی راتیں" کے آغاز ہی میں ملتی ہے یعنی جب قصّے کا ہیرو میکسی میلین اپنے اُجڑے ہوئے دیہاتی باغ میں کسی یونانی دیبی کا چت پڑا ہوا مرمر کا ایک عریاں مجسمہ دیکھ لیتا ہے اور جب اُس کی نظریں اُس مجسمے کی بڑی نفاست سے ترشی ہوئی سفید سفید چھاتیوں پر جا پڑتی ہیں جو لمبی لمبی گھاس میں بڑی آب و تاب سے اپنی شوخ جھلک دکھا رہی تھیں تو ایک معصومانہ قسم کی حیا اُس کے سارے چہرے کو اپنی سُرخ لپیٹ میں لے لیتی ہے لیکن رات کے وقت اس عُریاں مجسمے کا خیال میکسی میلین کو سونے نہیں دیتا اور وہ ایک ناقابلِ بیان کشش کے زیرِ اثر اُس مجسمے کے قریب چلا جاتا ہے اور اس یونانی دیبی کے مرمریں لبوں پر ایک سہمی سہمی سی کیفیت اور ایک طفلانہ مستی سے ایک نرم نرم بوسہ ثبت کر دیتا ہے۔

ہائنا کے انگریز سوانح نگار ولیم شارپ کی رائے ہے کہ ہائنا نے "فلورنس کی راتیں" میں میکسی میلین کے لڑکپن کا جو رومانی واقعہ ایک شاعرانہ انداز میں لکھا ہے اُسے سراسر سوانحی تو نہیں کہا جا سکتا تاہم اُسے بالکل فرضی بھی نہیں کہا جا سکتا اور اس واقعے میں یاس و حرماں، افسُردگی اور خوف و حیا کا جو افسانوی بیان ہے اگر اُسے ہائنا کے بچپن کے واقعات سے کوئی بالواسطہ تعلق نہیں تو بالواسطہ تعلق ضرور ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس واقعے کی جُزئیات میں ہائنا کے لڑکپن کے کسی مبہم سے سوانحی رومان کا سراغ ملتا ہو!

ہائنا کے بعض نقادوں نے "فلورنس کی راتیں" کو بھی اُس کی دیگر رومانوں کے مانند ایک نامکمل افسانوی اقتباس سمجھا ہے چنانچہ اُس کا انگریز سوانح نگار ولیم شارپ غالباً ۱۸۳۱ء کے بعد کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ آئندہ آنے والے دس برسوں میں اُس کو نثر میں جو کچھ لکھنا تھا، ان میں تکمیل یافتہ "فلورنس کی راتیں" بھی شامل ہیں ربہ خیال رہے کہ اپنی ظاہر مکمل صورت میں بھی یہ ایک اقتباس ہی ہے لیکن میرے خیال میں یہ خیال صحیح نہیں۔ جہاں تک اس قصّے کی ٹیکنیک کا تعلق ہے "فلورنس کی راتیں" بڑی آسانی سے الف لیلہ کے مانند ایک ہزار ایک راتوں پر مشتمل ہو سکتی تھیں لیکن ہائنا نے میکسی میلین کی داستان گوئی کے لئے صرف دو راتیں ہی وقف کی ہیں۔ اور ان دو راتوں میں وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ لیتا ہے۔ میں نے یہ نتیجہ کسی خارجی شواہد کی بنا پر نہیں بلکہ داخلی شواہد کی بنا پر نکالا ہے۔ "فلورنس کی راتیں" جن دو چار قصّوں پر مشتمل ہے اُن کا اشارہ میکسی میلین اور ماریا کی گفتگو کے دوران ہی میں ملتا جاتا ہے۔ مادموازیل لورانس کا نام ہمیں سب سے پہلی مرتبہ ماریا ہی کی زبانی معلوم ہوتا ہے جبکہ "چھوٹی دیری" کا قصّہ ختم ہوتے ہی وہ میکسی میلین سے کہتی ہے۔

"تم سچ مچ خوش قسمت ہو لیکن یہ بتاؤ کیا مادموازیل لورانس کوئی مرمریں مجسمہ تھی، یا کسی مصوّر کی بنائی ہوئی کوئی تصویر۔ کیا وہ کوئی مردہ ہستی تھی یا کوئی خواب؟"

"دوسری رات تمام و کمال مادموازیل لورانس کے قصّے پر مشتمل ہے اور یہ قصّہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ دوسری رات ماریا ڈاکٹر کی

(باقی صفحہ ۶۱)

رئیس امروہوی

میں آیا، میں نے پی اور میں چھا گیا

بابا نے کہا
تمہیں بھی سید علی تقی خاں کے یہاں چلنا ہے۔ اُن کے دیوان خانے میں جلسہ ہے۔ جگر آئے ہوئے ہیں۔

جلسہ —— یعنی ادبی صحبت!

جگر —— یعنی علی سکندر جگر مرادآبادی

بابا —— یعنی علامہ ابوالمہدی سید شفیق حسن مرحوم۔

سنہ یاد نہیں یہی ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء ہوگا۔ گویا انتیس تیس سال قبل کا واقعہ ہے۔ امروہہ[1] میں سرما کے شباب کا موسم اتنا ہی پر از کیفیت ہوتا تھا۔ جتنا برسات کا موسم۔ دن میں سنہری خنک دھوپ اور شب میں ہلکی یخابی کیفیت لئے ہوئے شدید سردی۔ ایک ایسی ہی کپکپا دینے اور ٹھٹھرا دینے والی دسمبر کی رات میں جسے جماوٹ نے اور زیادہ خوشگوار یا ناگوار بنا دیا تھا۔ ہمارے گھر سے "زائرین جگر" کا ایک قافلہ نکلا۔ اس قافلے کے خضر راہ بابا مرحوم تھے۔ پاؤں میں براؤن رنگ کا بوٹ۔ درمیانی مہری کا پاجامہ۔ انگرکھے کی شیروانی۔ سیاہ ایرانی ٹوپی (جو اب ایران میں بھی متروک ہے) اور ہاں۔ ہاتھ میں بید کی طرح بل کھائی ہوئی سنہری روپہلی موٹھ کی عصا بابا کے دوش بدوش اور قدم بقدم پیچ چچا سید غنی حسن قبلہ تھے جنہیں بابا بھی چچا غنی کہتے تھے۔ میں بھی۔ اور میرے چھوٹے بھائی بھی اور مجھے یقین ہے کہ اگر موت اس مرحوم کو مہلت دیتی۔ اور وہ ہماری ستر پشتوں کو دیکھ سکتے تو ہر پشت میں "چچا غنی" کہلاتے ان دونوں بزرگان خاندان کے سائے اور عقب میں ہم تھے غالباً سید محمد تقی چندن (کمال امروہوی) اور میں —— گلی میں چنگی کی اندھی لالٹین سرخ رنگ کی چھوٹی اینٹوں کی بنی ہوئی دیوار کے ساتھ جڑی ہوئی ہوئے اور دھیمے دھیمے جل رہی تھی۔ یہ مختصر سا قافلہ نیم تاریک گلی کو پار کر کے محلہ دربار شاہ ولایت کی طرف آیا اور نوبت خانے محلہ جعفری اور محلہ گذری کے تنگ کوچوں کو عبور کر کے سید علی تقی خاں مرحوم کے دیوان خانے میں داخل ہوا —— پھاٹک سے گذر کر جو لمبا چوڑا اسلامی کا صحن آتا تھا۔ اس کے دونوں طرف گایوں بھینسوں کے بندھنے کی جگہیں تھیں۔ صحن کے بعد پھر سیڑھیاں آتی تھیں۔ ان پانچ زینوں پر چڑھ کر ہم اک بہت بڑے چبوترے کے صحن میں پہنچے۔ یہاں بھی اندھیرا سا پھیلا ہوا تھا۔ سامنے دالان در دالان تھے۔ جس کے محرابی دروں پر موٹے موٹے روئی کے پردے

---

[1] معذرت خواہ ہوں کہ میں ۱۹۴۷ء کے تقسیم سے قبل کے واقعات۔ افراد۔ اور اشیاء کی صفت کے بیان میں "ہے" کے بجائے "تھا" کا عادی ہوگیا ہوں۔

پڑے ہوئے تھے - ہم لوگ سردی سے کانپتے رضائیوں میں لپٹے - جب ان پہلوؤں کو اٹھا کر اندر دالان میں پہونچے تو عجب دلکش سماں نظر آیا - اندرونی دالان میں زمین پر بڑی بڑی دریاں - دریوں پر قالین - قالینوں پر گاؤ تکیے اور ہر ہر گاؤ تکیے کے سہارے شہر کے سربرآوردہ رنگ برنگے پھولوں اور فرشی حقوں کی نے مونہہ میں لئے خمیرہ مشک بو کا دھواں اڑاتے - اور خستہ پانوں کی گلوری اس کلّے سے اس کلّے میں منتقل کرتے - بڑی شان اور آن بان سے براجمان تھے - بابا اور چچا تقی حسن مرحوم کو آتے دیکھ کر صاحب خانہ یعنی سید علی تقی خاں صاحب نے آگے بڑھ کر استقبال کیا اور بڑے گرم جوشانہ انداز میں کہنے لگے کہ

آپ حضرات بالکل بروقت پہونچے - بس اب جلسہ شروع ہی ہونے والا ہے !

دیوان خانے کے اندرونی دالان میں امروہے کے چیدہ چیدہ ارباب ذوق (جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں) - جلوہ گر تھے اور جگر صاحب کا انتظار تھا - جو اندرونی دالان کی طرف صحنچی میں پردے کے پیچھے کسی "شغل" میں مصروف تھے ۔ جی ہاں کسی شغل میں - مشغلہ شعر و سخن کے علاوہ !

یہ وہ زمانہ تھا کہ میری شاعری کی عمر تین چار سال سے زائد نہ تھی - بعنفوان شباب و عنفوان شعر ـــــ اس زمانے میں جگر صاحب کی شاعری اور اور سرمستی کے بارے میں عجب عجب کہانیاں میں نے سن رکھی تھیں - مراد آباد سے جو لوگ آتے تھے وہ اور رسالوں کے ساتھ جگر کے بارے میں بھی افواہوں کے پلندے باندھ کر لاتے - مشاعرہ کو لوٹ لینے والی غزلیں - دنیا کو مسخر کرنے والی سرمستی اور شراب میں ڈوبی ہوئی شخصیت ـــــ ہائے جگر کے بارے میں کیسے کیسے رومانی تصورات میرے ذہن پر چھائے ہوئے تھے - عہد قدیم کا کوئی بانکا ـــــ ازمنہ وسطیٰ کا کوئی رومانی ہیرو ـــــ اور شاہنامہ فردوسی کا کوئی داستانی کردار

لیجئے جگر صاحب آ رہے ہیں !

کہ جیسے حافظ شیراز چور چور آئے

اس زمانے میں مجھے خود اپنے پر ناز تھا - چھریرا قد - نازک جسم، سرخ و سفید رنگ، شربتی آنکھیں - اور ملائم ریشمی بال - لیکن جگر ؟ - تو جگر کا حسن اور ان کی دل کشی ناقابل بیان تھی - بے شک ان کا حسن بلاشبہ ان کی دل کشی ؟ ـــــ مستی میں بکھرے ہوئے بال - نشۂ شراب سے سرخ آنکھیں - سیاہ تاب رنگ اور اِک کالا کلوٹا کمبل سر پر ڈالے ـــــ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ صحن چی کے دبیز پردوں سے ایک حافظ طلوع ہو رہا ہے - ایک خیام نکل رہا ہے اور ایک "جمشید" برآمد ہو رہا ہے - جگر کی شخصیت کے ناقابل بیان طلسم کے سامنے میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور میں ہپناٹزم کے ایک معمول کی طرح دم دبا کر اور سینگ جھکا کر ـــــ اس پُراز رومان شخص کے سامنے بے حس و حرکت بیٹھ گیا ـــــ اعظیم جگر - عجیب شاعری !

میرے خیال میں تو غزل ایسی ہوا کرتی تھی کہ

قصّہ نہ پوچھ مجھ سے شب انتظار کا ہر اشک آئینہ ہے مرے حال زار کا

اے دل ! نہ چھیڑ ساز قیامت اثر نہ چھیڑ ساکن ہے ذرہ ذرہ ابھی کوئے یار کا

لیکن پندرہ سولہ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ میں نے انوکھی اور نرالی غزلیں سنیں ـــــ نئے انداز کے ساتھ - نئے اعجاز کے ساتھ اور نئے لہجہ [illegible] کے ساتھ

محبت [illegible] کی جاتی ہے

[illegible] جس کو کہ اس میں ان کی [illegible] بھی پائی جاتی ہے

[illegible] کبھی کبھی تری آنکھوں میں پائی جاتی ہے

حُسن کی حد سے نکلتے اور یہ منظر دیکھتے   کاش حسن یار کو ہم حسن بکر دیکھتے

جگرؔ صاحب دو غزلوں کے بعد اپنے خبر گیروں کے ساتھ جلسے سے اٹھ کر اندر صحنچی میں چلے جاتے اور پھر کچھ دیر کے بعد سرمستی کی نئی کیفیت کے بعد واپس آتے۔ اس وقفے کے دوران اہل محفل اس طرح ان کی شخصیت اور شاعری سے متاثر۔ خاموش بیٹھے رہتے گویا ان کے سروں پر کوّے بیٹھے ہوئے ہیں (کان علی روسھم الغراب۔ عربی کہاوت)

کیا بتاؤں کہ مے۔ اور مے کا یہ اجتماع کتنا لطیف تھا۔ موسم سرما کی اس ناقابل فراموش رات میں جو شعر۔ شراب اور جگر کے ساتھ امروہے پر نازل ہوئی تھی۔

پھر وہی جگر صاحب تھے۔ اور وہی میں ــــــ لیکن یہ امروہہ نہیں مرادآباد تھا اور دوسری جنگ عالم گیر کا پُر آشوب زمانہ ــــ اب میں اِک روزنامے کا ایڈیٹر تھا اور سر سے پاؤں تک سیاست اور انقلاب میں غرق ــــــ اب مجھے نہ جگر کی شخصیت میں کوئی دلکشی نظر آتی تھی نہ اُن کی شاعری میں کوئی زندگی ــــــ سرے سے غزل کی صنف ہی میرے نزدیک بے معنی تھی ــــــ مہمل ــــ زندگی سے گریز ــــ حقیقتوں سے فرار ــــ اور بے عملی کا بہانہ مرادآباد میں جگر صاحب سے ایک نہیں بہت سی ملاقاتیں رہیں۔ لیکن میں نے اُن سے کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ حد یہ ہے کہ مجھے اُن کی عام گفتگو بھی سخت مُبہم اور بے مقصد نظر آتی تھی۔ عرفان ذات ــــــ معرفت نفس فن سے خلوص ــــــ سوز و گداز دل ــــ اور نجانے کیا کیا متصوفانہ اور عارفانہ اصطلاحات ــــــ جنھیں میں بورژوائی استعاروں سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا۔ محض بورژوائی استعارے ـ سرمایہ دارانہ محاورے دس برس گذر گئے! اور مجھے ۱۹۴۷ء کے جہنمی تنور میں پکایا گیا۔ میرے قلب کی میل کچیل صاف کی گئی۔ مجھے پگھلایا گیا شخصیت کے نئے سانچے میں ڈھالا گیا۔ اور میں یہاں کراچی آیا۔

نومبر [illegible] میں روزنامہ ڈان کے زیر اہتمام اک عظیم الشان مشاعرہ تھا۔ اور غالباً خواجہ ناظم الدین صاحب اس بزم کے صدر تھے جگرؔ صاحب ملے۔ ٹوٹے پھوٹے ــ خستہ و شکستہ اور آزردہ و افسردہ ــــــ ہم سب کا یہی حال تھا ــــــ جگرؔ صاحب کا عالم اور بھی خراب تھا ــــ کئی روز ساتھ رہا اور یہ کئی روز آنسوؤں بغیر روتے اور آہوں بغیر کراہتے گذرے! پھر اس ملاقات میں جگرؔ صاحب از سر نو مجھ پر منکشف ہوئے۔ نئی برشتگی اور دلسوزی کے ساتھ نئے کرب اور نئے گداز کے ساتھ ــــــ!

ہر دوسرے سال جگرؔ کے مدّاح انہیں بھارت سے پاکستان کھینچ بلاتے۔ کوئی نہ کوئی انڈو پاک مشاعرہ ہوتا۔ جگرؔ صاحب سے ملاقاتیں رہتیں مشاعروں میں وقفوں میں نجی صحبتوں میں اور نجانے کہاں کہاں؟ اب میں ایک مرتبہ پھر اِن کی شاعرانہ شخصیت کی محبوبیت اور اِن کی محبوبیت کی شاعرانہ توجیہ کا معترف ہونے لگا تھا۔ لیکن وہ بالکل یک رنگ آدمی تھے۔ یا غزل۔ یا تصوف یا رمی غزل سے مجھے دلچسپی۔ تصوف سے لگاؤ اور رمی سے شدید نفرت والی پھر جگر صاحب سے نباہ کیونکر ہو ــــــ اخبار نویسی کے سبب شخصیت کا تنوع میری نظر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے سیاست۔ فلسفہ۔ تاریخ۔ معاشیات۔ جنسیات۔ جرائم۔ مذہب۔ جو شخص اِن تمام مسئلوں پر بیک وقت محرمانہ گفتگو نہ کر سکتا ہو۔ اور صرف غزل کہتا ہو۔

پھول کھِلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

چاہے ایسی ہی غزل کیوں نہ ہو ــــــ پھر بھی اس سے مل کر کیا خوشی ہوگی ۔ آپ کو؟ میرا مطلب ہے نشاط خاطر و تسکین ذوق!

جنوری ۱۹۵۶ء کو اپنے مکان پر میں نے جگر صاحب اور ان کے احباب کی دعوت کی ۔ یہ دعوت بعض وجہوں سے مجھ پر فرض تھی ۔ عین اس وقت ۔ جب میرے گھر دعوت کی تیاریاں ہو رہی تھی امروہہ سے تار آیا ۔

بابا مر گئے!

اور دعوت ملتوی ہوگئی!

تیسرے چوتھے روز جگر صاحب بابا مرحوم کی تعزیت کو آئے ۔ کچھ دیر بیٹھے اور رسم پوری کر کے چلے گئے ۔ لیکن اس تکمیل رسم کے دوران بھی انہوں نے اس عجیب و غریب انداز سے میری دلدہی کی کہ چند لمحے کے لئے جیسے دل کا بوجھ اتر گیا ــــــ! واقعی ــــــ جگر صاحب کبھی کبھی بڑی موثر گفتگو کرنے لگتے تھے ۔ بشرطیکہ تاش کے پتے ان کے سامنے نہ ہوں کراچی میں جگر صاحب کا قیام ہفتوں نہیں مہینوں رہتا تھا ۔ لیکن بے شمار مواقع کے باوجود مجھے ان سے ملنے میں ہمیشہ گریز رہا ۔ اس کی وجہ رمی سے ان کا غیر معمولی شغف تھا ۔ آپ کسی شخص سے ملنے جائیں اور وہ تاش کے پتوں میں غرق ہو اور ہر پانچ منٹ بعد سر اٹھا کر آپ سے اعتذاراً یا رسماً پوچھ لے ۔

تو ہاں ــــــ مزاج بخیر ہے نا ــــــ بہت عرصے میں ملاقات ہوئی ۔

اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مزاج پرسی کا یہ سلسلہ برابر جاری رہے ۔ تو آپ بور ہو جائیں گے بشرطیکہ آپ اک ذہین انسان ہوں اور فقط جگر صاحب کی زیارت کے لئے نہ تشریف لے گئے ہوں ۔ میں بحمد اللہ زیارت قبور کا تو قائل ہوں لیکن زیارت اشخاص ؟ ــــــ تو یہ اک ایسی بت پرستی ہے ۔ جس سے مجھے فطرتاً کوئی مناسبت نہیں ۔ ہم خود اپنی زندگی میں اک "مزار" ہیں ہم کیوں دوسروں کی زیارت کریں ۔

نواب شاہ کا ٹکٹ لیکر جو میں سیکنڈ کلاس میں داخل ہوا ۔ تو دیکھا حضرت جگر مراد آبادی ۔ شوکت تھانوی ۔ ماہر القادری ۔ نظر حیدر آبادی ۔ ادیب سہارن پوری ۔ نظر امروہوی اور نجانے کون کون سے شعرا ڈبے میں ٹھسے پڑے ہیں ۔ میرے ساتھ سجاد سخن تھے لیجئے ہر ہر سیٹ پر تاش ہو رہا ہے نجی جیلانی کہ میر قافلہ تھے ۔ شعرا کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں ۔ کسی کے لئے چائے آرہی ہے ۔ کسی کے لئے اور ینج منگوایا جا رہا ہے ۔ کوئی پانوں کے لئے چیخ رہا ہے کسی کو سگریٹ کی طلب ہے ۔ مگر "رمی" بایں ہمہ جاری ہے ۔ لاحول ولا قوۃ ۔ جگر صاحب حسب معمول معذرت خواہانہ ملے ۔ کیونکہ انہیں بخوبی علم تھا ۔ کہ میں "تاش" سے کتنا متنفر اور تاش کے کھلاڑیوں کو کس بیزاری کے ساتھ "خواجہ تاش" کہا کرتا ہوں کراچی سے ۔ نواب شاہ تک برابر تاش کا سلسلہ جاری ۔ اور میں کتاب بینی میں غرق رہا ۔ نواب شاہ اسٹیشن پر گاڑی سے اتر کر جب ہم تانگوں کے اڈے پر آئے تو یہ سن کر مجھے سخت حیرت ــــــ یا شاید مسرت ہوئی کہ سامان اتارتے وقت جگر صاحب کا بستر گاڑی میں رہ گیا اور ریل چھوٹ گئی!

یہ مشاعرہ ۔ نواب شاہ کے اہل ذوق نے میرے لنگوٹیا یار اور جگر صاحب کے قدیم محرم اسرار ۔ بشیر درانی کے دیوان "جذب و گریز" کی تقریب ولادت کے سلسلے میں منعقد کیا تھا اور ہم سب لوگ جگر صاحب کی سرکردگی میں حضرت بشیر کے اس معنوی نومولود کی مبارک باد دینے کراچی سے نواب شاہ حاضر ہوئے تھے جگر صاحب کے بستر کی گمشدگی کا واقعہ جس میں بقول جگر اک جہان معنی لپٹا ہوا تھا یعنی پانوں کی ڈبیہ ـ نئے کرتے نئے پاجامے کمربند سمیت ــــــ اور تازہ کلام ــــــ تمام اہل قافلہ کے لئے ایک ایسا حادثہ جانکاہ تھا ۔ کہ ہر شخص جگر صاحب سے تعزیت اور بشیر درانی سے ہمدردی کر رہا تھا ۔ جو بالواسطہ طور پر بستر کی گمشدگی کے ذمہ دار قرار پاتے تھے ۔ کیوں کہ نہ وہ شاعر ہوتے نہ مشاعرہ کرتے نہ جگر صاحب کراچی سے نواب شاہ آتے اور نہ یہ جہان معنی "یعنی جگر صاحب کا بستر گم ہوتا ۔

اسٹیشن سے شہر تک بستر کا ہنگامہ گرم رہا اور ادھر قیام گاہ پر پہونچ کر یاروں نے ——————

بطرز خاص تواں گفت راز خلوتیاں

سرِ سبو بکشادند و در فرو بستند

اب ہمارے چہکنے کی باری تھی۔ جگر صاحب بستر پر دراز تھے بعض اہل عقیدت ان کے پاؤں دبا رہے تھے اور بعض سر —————— اور ہم چہک رہے تھے

پھر دیکھئے انداز گل افشانیٔ گفتار

نقلی مشاعرے سے قبل۔ جو کسی حاکم ضلع کی صدارت میں رات کے نو بجے منعقد ہونے والا تھا اصلی مشاعرہ شاعروں کی قیام گاہ پر منعقد ہوا۔ اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح میں نے بھی جی بھر کر اپنی غزلیں جگر صاحب کی خدمت میں پیش کیں

دل کسی مست ناز تک پہونچے ۔ یہ حقیقت مجاز تک پہونچے ۔

یا رب اغم عشق کیا بلا ہے ؟ ہر شخص کا تجربہ نیا ہے۔

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

وغیرہ وغیرہ وغیرہ وغیرہ وغیرہ وغیرہ

نواب شاہ میں بڑا زور دار مشاعرہ ہوا۔ جگر صاحب نے گمشدہ بستر کی بازیابی کی خوشی میں ایک چھوڑ۔ دو اور پھر تین غزلیں سنائیں مشاعرے کے بعد پھر رت جگا ہوا۔ سر مستیاں ، چہلیں ، ہنگامے ، اچھے لطیفے کو دے ، غزلیں بھڑکیں۔ شاعر تھرکے۔ اور یہ ساری رات جگر کی دلکش شخصیت کے گرد رقصاں وپاکوباں طواف کرتی گذر گئی ۔ اٹھیئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی ۔

کراچی واپس آنے والی گاڑی میں بیٹھنے اور اپنے پہلو میں بطور خاص مجھے بٹھلانے کے بعد جگر صاحب نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا کہ ۔

میں حیدرآباد (سندھ) اتروں گا۔ آپ بھی میرے ساتھ اتر جائیے۔ آج آپ بطور خاص میرے مہمان رہیں گے جملہ لوازم مہمانی موجود ہوں گے ۔ کل چلے جائیے گا۔ آج جی بھر کے آپ کی غزلیں سنیں گے

میں نے دست ادب جوڑ کر گذارش کی کہ

حضور والا! میں بیک وقت کراچی کے دو روزناموں سے متعلق ہوں۔ روزنامہ شیراز اور روزنامہ جنگ —————— ایک شب کی غیر حاضری تو اہل دفتر و بیوی کی طرف سے معاف ہے۔ لیکن دو راتوں کی غیر حاضری کا کیا جواب دوں گا؟

حیدرآباد کا اسٹیشن آیا اور جگر صاحب لدے پھندے مع اپنے ساتھیوں کے حیدرآباد اتر گئے —————— حیدرآباد سندھ میں چند روز قیام کرنے کے بعد وہ لاہور تشریف لے گئے اور لاہور سے بھارت!

یہ جگر صاحب کا آخری سفر پاکستان تھا ——————

وقت گذر گیا۔ جگر صاحب گذر گئے (اور ہم بھی گذر جائیں گے) لیکن الحق کہ وہ ایک عظیم انسان تھا۔ اور عجیب شاعر —————— الماس کی طرح شفاف آئینے کی طرح آب دار۔ پھول کی طرح خوش رنگ اور طوطی کی طرح خوش نوا —————— میرے بہتر نشتروں نے انہیں خدائے سخن بنا دیا ہے۔ مگر جگر صاحب کے "پس ماندگان شعری" اور "باقیات معنوی" یعنی ان کے عقیدت مند حضرات۔ شعلۂ طور اور آتش گل سے ۔ نشتر چنیں تو وہ ، نشتر سے کم نہ ہوں گے تیر تقی سے ایک سو نشتر زیادہ اور جگر غزل کی دنیا کے "خداوند خدا" قرار پا جائیں گے۔ جی ہاں۔ خداوند خدا ——————

جس کی روح پانیوں پر حرکت کرتی تھی (بقول توریت)

اکتوبر ۱۹۶۰ء

اشہر کراچی

برٹرینڈ رسل
امتیاز سعادت

میں خدا کو نہیں مانتا

سقراط نے یونان کے خداؤں سے بغاوت کی تھی اور اسے اپنے نظریات کی قیمت زہر کا پیالہ پی کر ادا کرنا پڑی — برٹرینڈ رسل نے بھی اپنے دور کے خداؤں سے بغاوت کی ہے اور ان کو اپنے افکار کی سزا معاشی اور سیاسی جلاوطنی کی شکل میں مل چکی ہے جرات افکار کے سلسلے میں رسل کو موجودہ دور کے سقراط کا نام دیا جا سکتا ہے - ذیل کا مضمون ان کے مضمون "میں عیسائی کیوں نہیں ہوں" کا ترجمہ اور تلخیص ہے -

میں عیسائی کیوں نہیں ہوں ؟ اس سلسلے میں گفتگو کا آغاز کرنے سے پہلے یہ طے کر لینا مناسب ہوگا کہ لفظ عیسائی سے ہماری کیا مراد ہے - کچھ لوگوں کے نزدیک عیسائی سے مراد ایک ایسا شخص ہے جو بھلائی کی زندگی گزارتا ہے - لیکن اس تعریف کو مان لینے کے بعد ہمیں ہر مذہب اور ہر فرقہ میں عیسائی مل جائیں گے - میرے خیال میں خود کو عیسائی کہلوانے کا حق کسی شخص کو اس وقت پہونچتا ہے جب وہ چند واضح عقائد کا احساس رکھتا ہو - خود کو عیسائی کہنے کے لیے کسی شخص کے لیے دو باتیں ضروری ہیں اول تو یہ کہ اسے خدا اور بقائے روح پر اعتقاد ہونا چاہیے دوسرے یہ کہ اس مذہب کے نام کی نسبت سے حضرت عیسٰی کے بارے میں کوئی واضح عقیدہ ہونا چاہیے - خدا اور بقائے روح پر تو مسلمانوں کو بھی یقین ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو عیسائی نہیں کہہ سکتے - عیسائی ہونے کے لیے کم از کم یہ یقین ضروری ہے کہ حضرت عیسٰی عقلمند ترین اور احسن ترین انسان تھے اس لیے جب میں اس سوال کا جواب دوں گا کہ "میں عیسائی کیوں نہیں ہوں" تو مجھے دو باتیں بتانا پڑیں گی - ایک یہ کہ مجھے خدا اور بقائے روح پر یقین کیوں نہیں ہے - دوسرے یہ کہ میرے نزدیک حضرت عیسٰی عقلمند ترین اور احسن ترین انسان کیوں نہیں تھے ، حالانکہ ان کی اخلاقی عظمت میری نظر میں مسلّم ہے -

خدا کا وجود

خدا کے وجود کا سوال بے حد اہم اور سنجیدہ ہے اور اگر میں اس پر واقعی کوئی بسیط گفتگو شروع کر دوں تو شاید قیامت تک بھی اس پر سیر حاصل بات چیت نہ ہو پائے گی - لیکن میں مختصراً کچھ معروضات پیش کروں گا - آپ جانتے ہیں کہ کیتھولک چرچ کے عقائد میں ہے کہ خدا کا وجود عقل کے ذریعے ثابت کیا جا سکتا ہے - چنانچہ خدا کے وجود کے حق میں دلائل پیش کئے گئے - یہ دلائل تعداد میں بہت ہیں لیکن میں صرف چند پر بحث کروں گا -

علّت اولیٰ کی دلیل

سب سے زیادہ سادہ اور آسان علّت اولیٰ کی دلیل ہے۔ ہم اس کائنات میں جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی کوئی علّت ہونا چاہیے اور اگر ہم اسباب و علل کی اس زنجیر پر پیچھے ہٹتے جائیں تو ہم ایک علّت اولیٰ تک پہونچ جائیں گے۔ یہی خدا ہے۔ لیکن اس دلیل میں اب کوئی وزن نہیں ہے چونکہ ۔ ۔ ۔ نظریۂ علّت وہ نہیں ہے جو پہلے تھا۔ فلسفی اور سائنسداں علّت کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور اب اس میں پرانا سا وزن باقی نہیں رہا ہے۔ لیکن اسکے علاوہ بھی یہ بات واضح ہے کہ علت اولیٰ کی دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے۔ جب میں جوان تھا اور ان مسائل پر اپنے ذہن میں بحث کیا کرتا تھا۔ تو میں نے اس دلیل کو قبول کر لیا تھا۔ پھر ایک دن میں نے جان اسٹوارٹ مل کی خود نوشت سوانح حیات پڑھی۔ اس میں مجھے یہ جملے ملے۔ "میرے باپ نے مجھے بتایا کہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کہ 'مجھے کس نے پیدا کیا ہے' اس لئے کہ اس سوال میں ایک دوسرا سوال مضمر ہے وہ یہ کہ 'خدا کو کس نے پیدا کیا ہے'۔" ان جملوں نے مجھ پر واضح کر دیا کہ علّت اولیٰ کی دلیل میں کیا تناقض ہے۔ اگر ہر شے کی کوئی علّت ہے تو خدا کی بھی کوئی علت ہونی چاہیے اس بات کو مان لینے میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے کہ کائنات بغیر علت ہی کے وجود میں آگئی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود ہو۔ یہ کیوں فرض کیا جائے کہ کائنات کا کوئی آغاز تھا۔ یہ خیال کہ ہر شے کا کوئی آغاز ہونا چاہیے دراصل ہمارے تخیّل کی کم مائگی کا ثبوت ہے۔

قانون فطرت کی دلیل

علت اولیٰ کی دلیل کے بعد قانونِ فطرت کی دلیل آتی ہے۔ یہ دلیل اٹھارویں صدی میں نیوٹن کی کونیات کے زیر اثر بہت مقبول تھی۔ لوگ سیاروں کو قانون کشش کے تحت سورج کے گرد گھومتے دیکھتے تھے اور یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ ان سیاروں کی حرکت کا سبب یہ ہے کہ خدا نے انھیں اسی طرح حرکت کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ دراصل ایک آسانی تھی اس لئے کہ اس طرح قانون کشش کی مزید وضاحت سے جان بچ جاتی تھی۔ لیکن اب آئن شٹائن نے قانون کشش کی ایک پیچیدہ تر توضاحت کر دی ہے جو نیوٹن کی میکانیت کے برعکس ہے معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کو ہم پہلے فطری قوانین کا نام دیا کرتے تھے وہ انسانی ذہن کی تن آسانیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھیں۔ یہ قوانین دراصل اعداد و شمار کے اوسط ہیں۔ اس روشنی میں فطری قوانین کی وقعت بہت ہی کم رہ جاتی ہے، اگر ہم یہ سوچیں کہ یہ سائنس کا موجودہ نظریہ ہے اور اس میں آئندہ تبدیلی کا امکان ہے تو ہمیں یہ تو مان لینا چاہیئے کہ فطری قوانین کے پیچھے کسی قوت کو فرض کرنا دراصل انسانی اور فطری قوانین کو گڈ مڈ کرنے کے مترادف ہے۔ انسانی قوانین احکام ہوا کرتے ہیں جن کو ماننا یا نہ ماننا آپ کے لیے ضروری نہیں ہے لیکن فطری قوانین اشیاء کے طرز عمل کو ظاہر کرتے ہیں اور صرف اُنکے اس طرز عمل سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ ان سے کسی نے اس طرز عمل کے لیے کہا بھی ہے۔ اگر ایسا ہے بھی تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر خدا نے یہی قوانین کیوں پیدا کئے ہیں اور کوئی کیوں نہیں؟ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے یہ سب کسی وجہ سے نہیں کیا تو پھر ثابت ہو جاتا ہے کہ کوئی شے ایسی ہے جو قوانین کی تابع نہیں ہے اور اسطرح وہ قوانین فطرت والی بات ختم ہو جاتی ہے۔ پھر اگر آپ کلیسائیوں کی طرح یہ کہتے ہیں کہ ان قوانین کی آفرینش میں خدا کے مد نظر ایک اصول تھا یعنی یہ کہ بہترین کائنات پیدا کی جائے تو خدا محتاج اور محدود ثابت ہو جاتا ہے۔ اور ایسے خدا کو اگر نہ مانا جائے تو بہتر ہے۔

تیسری دلیل

یہ دلیل کہتی ہے کہ کائنات کی ہر شے کچھ اسطرح پیدا کی گئی ہے کہ ہم اس میں زندہ رہ سکتے ہیں اور اگر اس کی ساخت میں کوئی تبدیلی ہو جائے تو ہماری زندگی ناممکن ہو جائے، اس دلیل کی بعض شکلیں بڑی عجیب ہیں۔ مثلاً یہ کہ خرگوشوں کے سفید دمیں اسلئے ہوتی ہیں کہ اُن پر نشانہ آسانی سے

لگایا جاسکے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ خرگوش اس دلیل کے بارے میں کیا محسوس کریں گے۔ اس دلیل کی پیروڈی بڑی آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ والٹیئر نے کہا تھا کہ ناک اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ عینک لگانے میں آسانی ہو۔ اس دلیل میں بھی اب پرانا سا وزن باقی نہیں رہا ہے۔ ڈارون کے بعد سے ہمیں معلوم ہوگیا ہے کہ انسان اور جانور اپنے ماحول کو کس طرح اپنا لیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ماحول کو انسانوں اور جانوروں کے لیے بنایا گیا ہے بلکہ انہوں نے خود کو ماحول کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ کسی قسم کے نظم کی اس سلسلے میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر ہم اس دلیل پر مزید غور کریں تو حیرت ہوتی ہے کہ قادر مطلق اور عالم مطلق نے لاکھوں سال بعد اس قسم کی کائنات پیدا کی ہے مجھے تو اس بات پر یقین نہیں آتا۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ کو قدرتِ مطلق اور علم مطلق حاصل ہو جائیں اور آپ کو لاکھوں سال کا عرصہ بھی دیدیا جائے تو آپ کو کلکس[1] کلان اور فاشسٹوں سے بہتر چیز نہیں بن پائیں گے؟ اس کے علاوہ اگر ہم سائنس کے عام قوانین کو مان لیں تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑیگا کہ ایک معینہ مدت میں ہمارا نظام شمسی اور انسانی زندگی ختم ہو جائیں گے —— زوال کے اس طویل عمل کے دوران ایک نقطہ ایسا آتا ہے کہ حرارت وغیرہ زندگی کی پیدائش کے لیے مناسب ہو جاتے ہیں اور نظام شمسی کی کل زندگی کے ایک مختصر عرصہ کے لیے زندگی زندہ رہتی ہے۔ چاند پر اسی قسم کے حالات ہیں جو بالآخر ہماری زمین کا مقدر ہیں یعنی سردی اور موت۔

یہ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کے خیالات قنوطیت کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ اگر اس قسم کی باتوں پر یقین کر لیا جائے تو زندہ رہنا مشکل ہو جائے لیکن یہ سب مہمل باتیں ہیں اس لئے کہ کسی کو اس کی فکر نہیں ہے کہ لاکھوں سال بعد کیا ہونے والا ہے۔ اور اگر بظاہر کسی کو اس طرف سے پریشانی ہے تو یہ دھوکا ہے۔ دراصل یہ پریشانی کسی بے حد غیر اہم بات کے بارے میں ہوتی ہے جو کائناتی شکل اختیار کر لیتی ہے یا پھر خراب ہاضمہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اخلاقی دلائل

اب ہم خدا کے وجود کے اخلاقی دلائل کی طرف آتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں وجودِ خدا کے لیے تین اہم دلائل رائج تھے جن کو کانٹ نے اپنی تنقید عقل محض میں باطل کر دیا تھا۔ کانٹ نے ان دلائل کو باطل ثابت تو کر دیا لیکن ان کی جگہ ایک نئی دلیل ایجاد کر دی جس کا انداز اخلاقی ہے۔ اور اس دلیل نے کانٹ کو قائل بھی کر دیا۔ کانٹ اور بہت سے لوگوں کی طرح عقلی معاملات میں تو ضرور شک پسند تھا لیکن اخلاقی معاملات میں اسے ان تمام باتوں پر یقین تھا جو اسے اپنی ماں کی گود میں سکھائی گئی تھیں۔

کانٹ نے جو اخلاقی دلیل ایجاد کی تھی وہ انیسویں صدی میں بے حد مقبول تھی اس کی بہت سی اشکال ہیں۔ ایک شکل یہ ہے کہ اگر خدا موجود نہ ہو تو نیک و بد میں تمیز کرنا ناممکن ہو جائے گا مجھے فی الحال اس سے سروکار نہیں کہ نیک و بد میں کوئی فرق ہے یا نہیں یہ مسئلہ بالکل الگ ہے — مجھے کہنا یہ ہے کہ اگر ہمیں یقین ہے کہ نیک و بد میں فرق ہے تو کیا ہمارے لیے یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ یہ فرق خدا کے حکم کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ فرق احکام خداوندی کا نتیجہ ہے تو پھر خود خدا کے لیے نیک و بد میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ کہنا غلط ہے کہ وہ خود خیر ہے۔ پھر اگر ہم کلیسائیوں سے اتفاق کر لیتے ہیں کہ خدا خیر ہے تو ہمیں یہ مان لینا پڑے گا کہ مشیت ایزدی سے الگ بھی نیک و بد کا وجود ہے۔ چونکہ مشیت ایزدی کا شر ہونا محال عقلی ہے۔ یہاں تک اگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک بلند تر خدا ہے جس نے اس کائنات کے خالق کو حکم دیا تھا کہ کائنات کو پیدا کرے۔ یا پھر ہم یہ بھی خیال کر سکتے ہیں کہ ہماری کائنات کو شیطان نے خدا کی نظر بچا کے پیدا کر دیا ہے۔ اس خیال کی تائید میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور میرا جی نہیں چاہتا کہ اس کی تردید کروں

انصاف کی دلیل

اخلاقی دلیل کی ایک عجیب و غریب شکل یہ ہے کہ خدا کا وجود اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر دنیا میں انصاف ناممکن ہے۔ دنیا میں

[1] KU KLUX KLAN

انصافی بہت ہے اکثر نیک آدمی مصائب میں گھِر جاتے ہیں جب کہ اکثر بُرے آدمی پھلتے پھولتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ بحیثیت مجموعی دنیا میں
اف باقی رہے تو ہمیں ایک دوسری زندگی کو فرض کرنا پڑے گا جس میں اس بے انصافی کا ازالہ ہو جائے گا۔ اس طرح خدا کا وجود ضروری ہے، جنت
دوزخ کا ہونا ضروری ہے تاکہ انصاف عمل میں آسکے۔

یہ دلیل بے حد عجیب ہے۔ اگر ہم اس پر سائنسی انداز میں غور کریں تو ہم ایک ہی نتیجہ نکال سکتے ہیں وہ یہ کہ اگر اس زندگی میں بے انصافی
ذ دوسری دنیا میں بھی ہوگی یوں سمجھئے کہ اگر آپ کو سنتروں کی ایک ٹوکری ملے اور اسے کھول کر دیکھنے پر آپ یہ پائیں کہ اُوپر کے تمام سنترے سٹر گئے
تو آپ یہ ہرگز نہیں کہیں گے کہ "نیچے کے سنترے ضرور اچھے ہونگے ورنہ اُوپر کے سنتروں کی خرابی کا ازالہ کیسے ہوگا" آپ کا ردِعمل یہ ہوگا کہ ٹوکری میں
م سنترے خراب ہیں۔ یہی بات ایک سائنسی انداز رکھنے والے شخص کو کائنات کے بارے میں بھی سچ معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ نتیجہ نکالے گا کہ ہم اس کائنات
بے انصافی کا دور دورہ دیکھتے ہیں انصاف کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ صورت حال خدا کے وجود کو نہیں اس کے عدم کو ثابت کرتی ہے۔

یہ سب کچھ ہے لیکن یہ عقلی دلیلیں عام آدمیوں پر کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ عام آدمی خدا کے وجود پر ان دلائل کی بناء پر یقین نہیں رکھتے بلکہ
لیے کہ بچپن میں انھیں یہی بتایا گیا تھا خدا موجود ہے۔ یہی خدا پر یقین کی سب سے بڑی وجہ ہے دوسری وجہ تحفظ کی خواہش ہے۔ یہ خواہش کچھ
قسم کا احساس لئے ہوتی ہے کہ ایک بڑا بھائی موجود ہے جو ہماری نگہداشت کرتا رہتا ہے۔ خدا پر یقین کے سلسلے میں یہ خواہش بیحد اہم کردار
کرتی ہے۔

عام آدمی مذہب کو جذباتی بنیادوں پر قبول کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مذہب کے خلاف سوچنا بُرا ہے اس لیے کہ مذہب انسان کو نیک بناتا
، کہنے کی حدتک یہ بات ٹھیک ہے لیکن عملی زندگی میں ایسا ہوتے بہت کم دیکھا گیا ہے میرا اندازہ تو یہ ہے کہ اکثر عیسائی مذہب کے ماننے والے بے حد
ر پسند ہوتے ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی زمانے میں مذہبی احساس جسقدر شدید ہوا ہے اسی قدر ظلم میں اضافہ ہوا ہے۔ ان ادوار میں جن کو
ان کے عہد کا نام دیا جاتا ہے، انکوئیزیشن اپنے تمام مظالم کے ساتھ موجود تھا۔ لاکھوں بے گناہ عورتوں کو چڑیل قرار دیکر نذرِ آتش کر دیا جاتا
ا۔ اور ہر قسم کے آدمیوں پر ہر قسم کے مظالم اور سختیاں روا رکھی گئیں، اور یہ سب کچھ مذہب کے نام پر ہوا۔

دنیا پر نظر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ منظم مذاہب نے انسانی جذبات کے فروغ، تعزیرات کی اصلاح، جنگ کے انسداد، سیاہ اقوام سے بہتر سلوک، غلامی
، انسداد، غرض کہ ہر اُس اقدام کی مخالفت کی ہے جس سے بنی نوع انسان کی اخلاقی حالت درست ہو سکے میں مکمل قصد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اپنی
ظم شکل میں عیسائی مذہب اخلاقی ترقی کا سب سے بڑا دشمن رہا ہے اور اب بھی ہے۔

شاید آپ کہیں کہ پچھلے جملے کے آخری حصے میں میں حد سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ حقائق کو دیکھئے۔ حقائق خوشگوار نہیں ہیں
لیکن کلیسا والے خود ناخوشگوار حقائق کو دعوت دیتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ آج ایک ناتجربہ کار لڑکی کی شادی ایک سوزاک زدہ آدمی سے کر دی جائے تو
کیتھولک چرچ کا حکم ہوگا کہ "شادی ایک ناقابلِ منسوخ مقدس رسم ہے۔ آپ دونوں کو عمر بھر ساتھ رہنا ہے۔ اور یہ کہ اس لڑکی کو کوئی ایسا قدم نہیں
اٹھانا چاہئے جس کے ذریعے مبینہ بچے نہ پیدا ہوں۔ میرے خیال میں یہ ظلم کی انتہا ہے اور کوئی بھی شخص جس کی فطری ہمدردی کو عقائد نے مردہ نہیں
کر دیا ہے یہی کہے گا کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔

یہ صرف ایک مثال ہے اور بہت سے طریقے ہیں جن کے ذریعے کلیسا، جسے اپنی اخلاقیات پر اصرار ہے، بے مقصد اور بے موقع مصائب کا
باعث بنتا ہے۔

(باقی ص۵۳ پر)

محمد مہدی

چین کا قائد اعظم

مثلاً غاروں میں رہنا ——— سانپوں اور اژدہوں سے لڑنا۔ پہاڑوں
پر دشمنوں کی تاک میں بیٹھنا ——— اپنی خیالی محبوبہ کے فراق میں بار بار جان
پر کھیل جانا ——— بیشک وہ ——— ناول کا ایک کردار ہے ———

یہ آسمان بلند اور پارہ ہائے سحاب
نظر جمائے ہوئے ہیں جنوب کی جانب
ہم اپنے عہد کے ہیرو ہیں سر بکف ہیرو
جنوب میں ہے وہ دیوار چین۔ پُر عظمت

طویل مارچ مسلسل ہزاروں کوس کی راہ
ہر ایک میل کو میں انگلیوں پہ گنتا ہوں
نسیم غرب اڑاتی ہے سرخ پرچم کو

یہ کس کے شعر ہیں ؟ ——— ماؤزے تنگ کے ——— جو ہمارے زمانے کا سب سے بڑا کمیونسٹ رہنما ہی نہیں چینی زبان کا سب سے بڑا۔ کلاسیکی رنگ کا شاعر بھی ہے۔ ماؤزے تنگ کی انقلاب پسندی دنیا بھر میں مسلّم ہے۔ کیوں نہ ہو اُس شخص سے بڑا انقلابی کون ہوگا جس نے ساٹھ کروڑ انسانوں کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا لیکن ماؤ کی انقلابی ذہنیت اُس کی سیاست اور معاشی طریق کار تک محدود ہے۔ یا فلسفہ تاریخ اور مذہب کی حد تک ——— جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے تو وہ چین کے کلاسیکی شاعروں کے قدم بہ قدم چلتا ہے اور پرانی ڈگر سے بال بھر سرکنا کفر سمجھتا ہے۔ انسانی تاریخ کے ممتاز سیاست دانوں میں یہ فخر غالباً ماؤ ہی کے لئے مخصوص ہے کہ اس نے سیاست کاری کے ساتھ اپنی فن کاری کو بھی برقرار رکھا ہے۔

چین کے ساٹھ کروڑ انسانوں پر حکومت کرنے کے ساتھ شعر بھی کہتا ہے اور کبھی کبھی تو اس کی شعریت اس کی سیاست پر غالب آجاتی ہے!

مثال کے طور پر ـــــ اس نے چینی قوم کو ہمہ گیر اجتماعی زندگی (کمیون سسٹم) کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے جو پالیسی وضع کی تھی۔ اس کا نام ـ
سو پھولوں کی حکمت عملی" تجویز کیا تھا۔ کتنا شاعرانہ نام ہے یہ؟ ـ "سو پھولوں کی حکمت عملی کا مطلب یہ ہوا کہ پھولوں کے رنگ رنگ گلدستے کی
ح مل جل کر خوش رنگ زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ ـــــ ماؤزی تنگ[۱] ـ اخلاقی طور پر بڑے بے عیب اور صاف ستھرے کیرکٹر کا انسان ہے۔ دو
ی خراب عادت میں مبتلا نہیں۔ مگر ایک ـــــ یعنی مسلسل تمباکو نوشی ـــــ سگرٹوں کی ایک لمبی قطار ہے جو سلگتی ہوئی اس کے حلق کے اندر اترتی چلی
تی ہے اور بس ـ مگر فقط تمباکو نوشی ہی کیوں؟ ماؤزی تنگ نے چار شادیاں بھی تو کی ہیں۔ یہ بھی تو اس کے کیرکٹر پہ بہت بڑا دھبہ ہے ماؤ کی پہلی
بوی ماں باپ کی پسند سے آئی تھی۔ میاں بیوی میں نباہ نہ ہوا اور ماؤ نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ دوسری بیوی کو اس نے خود چنا تھا۔ وہ قوم پرست
چیانگ کائی شیک کے ساتھیوں کے ہاتھ سے قتل ہو گئی یہاں تک کہ تیسری اور پھر چوتھی پر نوبت پہنچی اور اس طرح ماؤ نے کمیونسٹ رہنماؤں کی تاریخ
بں اک نئے سماجی باب کا اضافہ کیا۔

ماؤ۔ فطرتاً فن کار ہے اور اس نے سیاسیات کو بطور مشغلے یا پیشے کے اختیار کیا ہے۔ وہ جس طرح آرٹ میں نظم و ترتیب اور حسن کا قائل ہے
س طرح سیاسیات اور حکمرانی کے فن میں بھی کسی وقت توازن اور ترتیب سے انحراف نہیں کرتا۔ ماؤ ۱۹۲۱ء میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوا تھا
در اب وہ ایشیا کا سب سے بڑا کمیونسٹ رہنما ہے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۶۰ء تک اس کی توجہ کا مرکزی نقطہ کسان رہے ہیں[۲]۔ کمیونسٹ فلسفہ میں
ماؤ نے ایک خاص مکتب فکر کی بنیاد ڈالی ہے جس کا نصب العین اور نعرہ ہے۔ "مارکسی انقلاب کسانوں کے ذریعے"! (یہ نعرہ ایشیا میں دن بدن
مقبولیت حاصل کرتا چلا جاتا ہے)

ماؤ کو چینی کمیونسٹ پارٹی کے اندر رہ کر اپنے ساتھیوں سے بڑی لڑائی لڑنی پڑی۔ اس لڑائی کی ابتدا ۱۹۲۲ء سے ہوئی۔ جب کہ پارٹی کے
جنرل سکرٹیری "چن تو سیو" نے ماؤزی تون کے کسانوں والے انقلابی نظریے کو ٹھکرا دیا۔ اس کے بعد کومن ٹانگ سے سمجھوتے کے سوال پر ماؤزی
تون کو پارٹی کے دیوؤں سے کشتی لڑنا پڑی۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل (کومن ٹرن) نے چینی کمیونسٹ پارٹی کو ہدایت کی تھی کہ وہ کومن ٹانگ سے مل کر کام
کرے۔ کومن ٹانگ چینی قوم پرست پارٹی کا نام ہے جس کی قیادت تیس سال سے جنرل (ازمو چیانگ) کائی شیک کر رہے ہیں[۶]۔ ماؤ نے اس ہدایت کو
ماننے سے انکار کر دیا لیکن عرصے تک چینی کمیونسٹ پارٹی "کومن ٹانگ" کے جال میں الجھی رہی۔ ماؤ شروع ہی سے کمیونسٹ پارٹی کے اخبار "گائڈ"
(رہنما) کا مضمون نگار تھا۔ لیکن بہت جلد پارٹی کے حکم پر اخبار کے چیف ایڈیٹر[۵] نے۔ ماؤ کے مضامین کی اشاعت بند کر دی کیونکہ ان مضامین میں
کمیونسٹ پارٹی کی طے کردہ پالیسی سے واضح انحراف پایا جاتا تھا۔ بہر حال کچھ عرصے کے بعد ماؤزی تون نے کمیونسٹ قیادت سے سمجھوتہ کر لیا اور
وہ "کومن ٹانگ[۶]" کی نیشنل کانگرس (منعقدہ کینٹن) میں کمیونسٹ پارٹی کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوا اور اس کے بعد ماؤ کو کومن
ٹانگ کمیونسٹ پارٹی کے شنگھائی بیورو کی مجلس انتظامیہ میں لے لیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں ماؤ کو پارٹی کی کسان ـــــ اور ماؤ نے
"ینان کے کسانوں کی معاشی حالت پر اپنی رپورٹ پیش کی[۸]۔

---

[۱] MAO TSE TUNG [۲] کمیونسٹ انٹرنیشنل (رپورٹ) ۱۹۲۵ء [۳] مارکس ازم میں صرف صنعتی مزدوروں ہی کو انقلاب کا پیش رو.....
[۴] فارموسا کی نیشنلسٹ چینی حکومت کے سربراہ کار [۵] CHI'ENTU-HSIUCH.EN [۶] قوم پرست جماعت
[۸] ینان کی انقلابی کسان تحریک (ماؤ)

آج ماؤ ازم کی تشریح و وضاحت کے لئے چین میں جو عظیم اور وسیع لٹریچر چھپ رہا ہے۔ یہ رسالہ ان سب میں سرفہرست کی حیثیت رکھتا ہے ہرچند کہ ۱۹۲۶ء میں چینی کیمونسٹ پارٹی کی پانچویں کانگرس نے اس رپورٹ کو ٹھکرا دیا تھا۔

لیکن ذرا ٹھہریئے ـــ پہلے یہ سوال کیجئے کہ "ماؤ زی تون" ہے کون؟

اس کی ولادت ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ اور ایسے گھر میں جو ۱۸۸۰ء میں یکایک خوش حال ہو چکا تھا۔ ماؤ کا باپ کسان اور زرخیز وادی ہانگشا کے گاؤں (SHAO SHAN) میں پندرہ ماؤ (۶۰ء ماؤ ـ ایک ایکڑ کی برابر) زمین کا مالک تھا۔ ماؤ کے باپ (SHUN SHENG) نے ٹے پنگ بغاوت کے زمانے میں کاشتکاری چھوڑ دی اور فوج میں شامل ہو گیا۔ اس زمانے میں چین کے نزدیک ڈاکہ زنی کا پیشہ۔ بڑے فائدے کا پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ ماؤ کے باپ نے ہل ہاتھ سے رکھ کر تلوار سنبھالی اور قزاقوں کی ایک فوج کا لیڈر بن گیا ـــ صرف ایک سال میں "ماؤ شن شنگ" نے اتنا کما لیا کہ مزید ۱۲۰ ایکڑ زمین خرید سکے۔ اسی کے ساتھ اس نے سوروں کی تجارت اور غلے کی چور بازاری بھی شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے۔ ماؤ کا دور اندیش باپ "شن شنگ" اپنے گاؤں کا خوش حال کسان بن گیا۔ اس واقعے کے بارہ تیرہ سال بعد شن شنگ" کے یہاں ۱۸۹۳ء میں، آنے والے چین کے عظیم ترین لیڈر "ماؤ زی تون" کی ولادت ہوئی اور چند سال بعد اس کا چھوٹا بھائی (TES MIN) پیدا ہوا۔ باپ نے دونوں بیٹوں کو اچھی خاصی تعلیم دلائی۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ماؤ کے دونوں چھوٹے بھائی۔ قوم پرست چینیوں کے ہاتھ سے ہلاک ہو گئے۔

ماؤ کے باپ کس ذہنیت کے مالک تھے۔ بیٹے سے سنئے۔

ماؤ کہتے ہیں کہ

ہمارے ابا کی تاکید یہ تھی کہ ہم روپے کی تھیلیوں کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر دونوں ہاتھوں سے تولا کریں۔ تاکہ ہمیں روپے کی صحیح تول آ سکے۔ باپ کی دولت پرستی کا تو یہ حال اور بیٹے ـــ تو بیٹے غریب باپ کی کمائی کو لٹانے پر کمر باندھے ہوئے تھے۔ اور باپ کی تجوریوں کو کھول کھول کر غریبوں میں روپیہ تقسیم کیا کرتے تھے[1] ـــ آفریں ہے صاحبزادوں کی اس سعادت مندی پر!

ایک روز ایسا ہوا کہ ماؤ زی تنگ مویشیوں کی منڈی میں سور بیچنے گئے۔ جب قیمت لے کر پلٹے تو راستے میں ایک بھک منگا مل گیا۔ اس مرد دلیر نے اس روز کی تمام کمائی گداگر کے حوالے کر دی اور خود ننگے ہاتھ گھر لوٹ آیا۔

یہ تو فروخت کی داستان ہوئی اب خرید کی داستان سنئے!

ماؤ کے باپ نے ایک جانور کا سودا کیا۔ اور بیچنے والے کو پیشگی کچھ رقم بھی دے دی۔ ماؤ کو مقرر کیا گیا کہ وہ دوسرے گاؤں میں جا کر بیچنے والے کسان سے جانور لے آئے سعادت مند لڑکا۔ باپ کے حکم کی تعمیل میں پڑوس کے موضع میں گیا اور کسان سے کہا کہ۔

لائیے جناب۔ ہمارا جانور ـــ

اس حقیقت پسند کسان نے ماؤ کو جواب دیا کہ

بھتیجے ـــ! ـ سنو۔ تمہارے باپ نے اس جانور کا سودا۔ دس روز پہلے کیا تھا۔ اس وقت منڈی میں جانوروں کی قیمت گری ہوئی تھی۔ اب اضافہ ہو گیا ہے اول تو وہ اضافہ دلواؤ۔ پھر یہ کہ یہ جانور دس روز تک میرے کھونٹے سے بندھا۔ چارہ کھاتا رہا اسکے پیسے دلواؤ۔

---

[1] بحوالہ۔ ہشاؤ مین (جس نے ماؤ کی سوانح عمری لکھی ہے)

ماؤ نے دونوں باتیں مان لیں اور خالی ہاتھ گھر لوٹ آیا۔

شفیق باپ کو اپنے بیٹے کی ہر راحت و آرام کا مکمل خیال رہتا تھا۔ چنانچہ سردی کے زمانے میں ژن شنگ نے بیٹے کے لئے ایک اوورکوٹ خریدا۔ جو خاصا قیمتی تھا۔ ماؤ اس اوورکوٹ کو پہن کر اسکول روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک ہم جماعت مل گیا جو روئی کا فرغل پہنے سردی میں کانپ رہا تھا۔ ماؤ نے یہ قیمتی اوورکوٹ اپنے کاندھے سے اتار کر اُسے پہنا دیا۔ اور سارے جاڑے لرزتے کانپتے کاٹ دئے۔

ایڈگر اسنو نے چین کے حالات کے ضمن میں ماؤ کی سوانح عمری لکھی ہے[1]۔ ماؤ نے اپنے یوروپی سوانح نگار کو بتایا کہ ابا جی۔ روپے سے اتنی محبت کرتے تھے کہ مجھے ان کی باتوں سے الجھن ہونے لگی تھی۔ پیسہ جوڑنے کے سلسلے میں مجھے ان کی عادت بہت بری لگتی تی۔ مگر ہماری اماں روپے کی لالچی نہ تھیں۔ وہ بڑے کلے ٹھلے اور آن بان کی عورت تھیں۔ ایڈگر اسنو نے ماؤ کی بات چیت سے یہ نتیجہ نکالا کہ مستقبل کا بے مثال اشتراکی رہنما جو "افریشیائی لینن" کہلاتا ہے بچپن میں صرف اپنی ماں سے متاثر ہوا تھا اور باپ سے صرف اس حد تک کہ وہ اپنے پدر بزرگوار کے ساہوکارانہ ہتھکنڈے دیکھ کر ساہوکاری اور سرمایہ داری دونوں سے نفرت کرنے لگا۔

سرمایہ داری سے ماؤ کو جو نفرت ہے وہ باپ کا ورثہ ہے اور سرخ فوج کو منظم کرنے میں اس نے جس تنظیمی قابلیت کا ثبوت دیا ہے وہ باپ سے ورثے میں ملی ہے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۵ء تک، ماؤزے تون نے کمیونسٹ قبیلے کے سردار کی حیثیت سے بڑی پُر از رومان زندگی بسر کی جس طرح پرانے چینی کرداروں کی زندگی۔ مثلاً غاروں میں رہنا۔ سانپوں اور اژدہوں سے لڑنا۔ پہاڑوں پر دشمنوں کی تاک میں بیٹھنا۔ اپنی خیالی محبوبہ کے فراق میں بار بار جان پر کھیل جانا بے شک ماؤزے تون ناول کا ایک کردار ہے۔ ایسے لوگ تو صرف قصے کہانیوں کی دنیا میں ملا کرتے ہیں۔

ماؤ کو بچپن میں طلسم ہوش ربا اور الف لیلا جیسے قصوں سے بڑی دلچسپی تھی لیکن بہت جلد وہ ان خیالی کہانیوں سے اکتا گیا اور اس نے چینی قومیت کے بانی ڈاکٹر سن یات سین کے انقلابی رسالوں اور ایک دوسرے چینی انقلاب پسند LIANG CHI'I - CH-HO کے اشتراکی مضامین کو پڑھ پڑھ کر اپنے انقلابی کردار کو بنانا اور سجانا شروع کیا۔ اور ۱۹۲۰ء تک وہ پکا انقلابی بن گیا ــــ ماؤ ۱۹۴۵ء میں اپنی عظمت کی انتہا کو پہنچ گیا اور اس نے چینی کمیونسٹ پارٹی کے طاقت ور رہنما کی حیثیت سے۔ چیانگ کائی شیک کی زوال پذیر قوم پرست حکومت (کومن ٹانگ گورنمنٹ)، کے خلاف فوجی معرکہ آرائیاں شروع کر دیں شروع شروع میں چینی کمیونسٹوں اور کومن ٹانگ کے درمیان مکمل سمجھوتہ پایا جاتا تھا اور یہ دونوں پارٹیاں جاپانی حملہ آوروں کے خلاف پوری طرح متحد تھیں لیکن جب ستمبر ۱۹۴۵ء میں جاپان نے امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور چینی قوم کو جاپانی خطرے سے نجات ملی تو شمالی چین سے کمیونسٹوں نے ماؤزے تون ــــ چو این لائی ــــ اور جنرل چوتہہ (CHUTEH) کی قیادت میں وسطی اور جنوبی چین پر جہاں جنرل چیانگ کائی شیک کی رشوت خور۔ بدعنوان اور نالائق حکومت برسر اقتدار تھی) پر دھاوا مارا اور مضبوط چینی فوج نے۔ جو روسی ہتھیاروں سے لیس تھی ــــ امریکہ کی کٹھ پتلی حکومت۔ کومن ٹانگ سرکار کو چین کی سرزمین سے اکھاڑ پھینکا۔ آج کل یہ جلا وطن حکومت فارموسا میں پناہ گزیں ہے۔ ۱۹۴۹ء سے اب تک ماؤ چین کی کمیونسٹ حکومت کا واحد رہنما ہے اور ایشیا و افریقہ کی کمیونسٹ پارٹیاں اپنے لیڈر کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہیں۔

ماؤ ــــ چین کی پیپلز سنٹرل گورنمنٹ کمیٹی اور فوجی مسائل کی انقلابی کمیٹی کا چیرمین ہے۔[2] اس نے کمیونسٹ چین کی تاریخ کے دھارے کو بدل دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ماؤ کی شخصیت جنوبی مشرقی ایشیا، مشرق بعید۔ وسط ایشیا۔ مغربی ایشیا اور افریقہ کے دو ارب انسانوں کی شخصیت

---

[1] RED STAR OVER CHINA چین کے افق پر سرخ ستارہ [2] اب ماؤ نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا ہے

پر حیرت انگیز طور سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اور برابر اپنی عظمت کی پرچھائیوں کو وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جاتی ہے۔

آئیے۔ ماؤ کا مقابلہ دنیا کے سب سے بڑے اشتراکی ملک سوویت یونین کی بڑی بڑی شخصیتوں سے کریں۔ سب سے پہلے لینن کا نام ہمارے ذہن میں آتا ہے۔

کوئی شبہ نہیں کہ لینن، سوویت ازم کا باپ اور بیسویں صدی کے افق پر حیرت انگیز طور سے چھایا ہوا نظر آتا ہے لیکن وہ نہ ادیب تھا نہ شاعر —— پھر اس کی زندگی اُن رومانی مہمات سے خالی ہے جو ماؤ کو پیش آئیں۔ وہ چھ ہزار میل کا سفر ماؤ زی تون لال جھنڈا لئے آگے آگے چل رہے ہیں۔ پیچھے پیچھے کمیونسٹوں کے قافلے ہیں۔ قدم قدم پر ڈاکوؤں کی ٹولیوں اور شمالی چین کی خود مختار فوجوں سے مڈبھیڑ ہو رہی ہے۔ بھوک، پیاس جلا وطنی۔ سازش اور خانہ جنگی کے طوفان ان تباہ حال قافلوں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ آخر ماؤ اور اس کے ہزاروں ساتھی کٹتے پٹتے اور مرتے جیتے شمالی چین کے صوبہ ینان میں پہنچتے ہیں اور وہاں اک نئی کمیونسٹ حکومت کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ دس بارہ سال تک ینان کی کمیونسٹ ریاست چیانگ کائی شیک کی طاقتور فوجوں سے نبرد آزما رہتی ہے۔ بیچ بیچ میں عارضی سمجھوتوں کے وقفے بھی آتے ہیں، مگر پھر وہی ہنگامہ پیکار گرم ہو جاتا ہے۔ آخر ۱۹۴۹ء میں پورے چین پر کمیونسٹوں کا اقتدار قائم ہو جاتا ہے اور ماؤ کو عوامی انقلابی حکومت کا صدر چن لیا جاتا ہے۔ انصاف کیجئے کہ بھلا لینن کی زندگی میں یہ "داستان امیر حمزہ" کہاں ؟ لینن پندرہ بیس رسالوں کا مصنف ضرور ہے مگر ادب سے اسے کیا مناسبت ؟ جب کہ ماؤزی تنگ نئے چین کا سب سے بڑا کلاسیکی شاعر، افسانہ نگار اور ادیب ہے اور ہاں ادبی نقاد بھی —!

اب آئیے اسٹالین کی طرف۔ اسٹالین ۱۹۲۴ء سے ۱۹۵۳ء تک سوویت یونین کا قادر مطلق رہا۔ اس کی سیاسی سوجھ بوجھ جنگی مہارت قہار طبیعت۔ حکمرانی کا حقیقت پسندانہ نقطہ نظر تعمیری جوش وخروش۔ پارٹی کی تطہیری مہمیں (کہ ایک ایک مہم میں ہزاروں آدمیوں کو گولی سے اڑا دیا جاتا تھا) اور پنج سالہ منصوبے۔ دنیا بھر سے خراج تحسین (یا دہشت کا نذرانہ) وصول کر چکے ہیں۔ لیکن ماؤ کی شخصیت میں جو فلسفیانہ تفکر، مفکرانہ شعور، جو تخلیقی اجتہاد، چینی زندگی کی عوامی روایتوں سے جو وابستگی اور شعر کی جو کلاسیکی قدرت پائی جاتی ہے۔ اسٹالین کی زندگی میں اس کی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔

اب آئیے این۔ ایس۔ خروشیف کی طرف —— خروشیف کیمروں اور فوٹوگرافروں کے سامنے زندگی بسر کرنے کا عادی ہو گیا ہے۔ دن رات پریس کانفرنس۔ صبح وشام فوٹو۔ اور شب و روز ڈنر —— یہاں تک کہ وہ امریکہ و برطانیہ بھی ہو آیا ہے۔ ایڈن۔ میکملن آئزن ہاور۔ نکسن۔ ڈی گال۔ اور مغربی جرمنی کے ایڈناور سے بھی مل چکا ہے[1] —— لیکن ماؤزی تون خود چینی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری جنرل سے بھی (گویا) پردہ کرتا ہے۔ صرف دو مرتبہ سوویت یونین کی حکومت کو یہ شرف نصیب ہوا ہے کہ وہ ماؤ کی میزبانی کی عزت حاصل کرے صرف دو مرتبہ —— اس کے علاوہ دنیا کے کسی ملک کو یہ عزت نصیب نہیں ہوئی کہ وہ عظیم چینی لیڈر کی پذیرائی کر سکے چینی زبان میں ماؤ کی صرف ایک سوانح عمری لکھی گئی ہے اور اس سے بھی۔ اس کی نجی زندگی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ وہ کس طرح رہتا ہے۔ کیا کھاتا ہے۔ کیا پیتا ہے۔ اس کے احباب کون کون ہیں۔ ماہانہ آمدنی کیا ہے؟ اس کے شب و روز کس طرح بسر ہوتے ہیں۔ غصے کا کیا انداز ہے۔ پیار کا کیا ڈھنگ ہے۔ وغیرہ وغیرہ —— ان میں سے کوئی بات کسی کے علم میں نہیں پیکنگ میں ہر روز غیر ملکوں کے وفود آتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کی ملاقات صرف چو این لائی سے

---

[1] جس وقت یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، خروشیف روسی وفد کے قائد کی حیثیت سے نیویارک پہنچے ہوئے ہیں اور یو۔ این کی جنرل اسمبلی میں روس کا مقدمہ پیش کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے دو گھنٹے دس منٹ تک، ۷ صفحے کی تقریر امن عالم پر کی ہے

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

صغیر زیدی

آپ شوہر ہیں یا بیوی؟

اگر آپ نے دلیلوں سے اپنی بات کو منوا بھی لیا تو اُس سے آپ دونوں کی مسرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

سلمیٰ کی شادی وقار سے ہوگئی وقار بلحاظ حسن سلمیٰ کے معیار کو نہیں پہنچتا تھا۔ وقار کا دوست فرخ ایک زندہ دل خوبصورت اور غیر شادی شدہ نچلا نوجوان تھا فرخ نے سلمیٰ سے یہ کہنا شروع کیا کہ سلمیٰ ایک اچھی عورت ہے اور وہ وقار کی قسمت پر رشک کرتا ہے کہ اس کو سلمیٰ جیسی حسین اور مہذب بیوی ملی ہے۔ وقار سلمیٰ جیسی بیوی کا مطلق اہل نہیں۔ وہ ایک غیر دلچسپ مرد ہے۔ سادہ لوح سلمیٰ اِن باتوں میں آگئی اور اس سے ناجائز جنسی تعلقات استوار کرلئے فرخ کچھ دنوں کے لئے کسی کام سے باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی پر سلمیٰ نے اس کو بتایا "پیارے فرخ میں نے وقار سے طلاق لے لی ہے اور اس سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارہ حاصل کرلیا ہے اب میرے اور تمہارے درمیان کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی آؤ اب ہم دونوں شادی کرلیں اور دنیا کی تمام مسرتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیں۔ چالاک فرخ نے اپنا دامن فوراً بچالیا اور کہا کہ "سلمیٰ میں نے تم سے یہ کب کہا تھا کہ تم وقار سے طلاق لے لو۔ میرا تو ابھی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں"۔

سلمیٰ اس غیر متوقع جواب کو سنکر پریشان ہوگئی اس نے پھر اپنے پرانے شوہر وقار سے رجوع کیا لیکن اس نے ہمدردانہ لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے بے حد افسوس ہے کہ اب میں تمہارے کام نہیں آسکتا کیونکہ میں نے دوسری شادی کرلی ہے اور اب ہم دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی زندگی بسر کررہے ہیں"۔

یہ واقعہ دنیا کے تمام شوہروں اور بیویوں کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ناجائز جنسی ملاپ جیسا سنگین جرم ازدواجی زندگی کے لئے اتنا تباہ کن ثابت نہیں ہوتا جتنا میاں بیوی کا ایک دوسرے کے مزاج کو صحیح طرح نہ سمجھتے ہوئے صحت مندانہ محبت کو برقرار نہ رکھنا اور خود غرضی اور لالچ کے جذبات کو اپنا کر ازدواجی زندگی کے توازن کو کھو بیٹھنا۔

ہمارے یہاں شادی کا مقصد محض جنسی ملاپ سمجھا جاتا ہے جس کا نتیجہ شادی خانہ آبادی نہیں بلکہ خانہ بربادی کی صورت میں نکلتا ہے حالانکہ شادی کا اصل مقصد صرف دو جسموں کو یکجا کرنا نہیں بلکہ دو روحوں کو یکجا کرنا ہے۔ دو مختلف نظریات دو مختلف طریقہ ہائے زندگی اور دو مختلف مزاجوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کریں اور دونوں جذبہ ایثار و قربانی کو اپنائیں۔ یاد رکھئے جس طرح ایک پودے کی نشو و نما کے لئے پانی اور دھوپ ضروری ہے۔ اسی طرح ایک میاں بیوی کے پُر مسرت تعلقات کے لئے ایثار و قربانی کا وجود ناگزیر ہے۔

عورت اور مرد کے مزاج کا ایک عام اور نمایاں فرق مدنظر رکھئے۔ عورت کے جذبات نہایت لطیف ہوتے ہیں۔ عورت بہت حساس ہوتی ہے وہ معمولی معمولی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ مرد پھر بھی معمولی باتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے لیکن مرد میں ناقدانہ جذبہ زیادہ کارفرما ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تنقید کے ذریعہ اپنا وقار قائم کرے۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ بعض اوقات مرد اپنے اس جذبہ میں اعتدال قائم نہیں رکھ پاتا اور تنقید برائے تنقید بھی کر دیتا ہے۔ جس کو عورتیں برداشت نہیں کر پاتیں۔ ایک کامیاب شادی کے لئے ضروری ہے کہ مرد اور عورت اپنے ان نمایاں جذبات میں اعتدال پیدا کریں۔ خاندان کا معیار بلند کرنے میں مرد سے زیادہ عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مرد تو برائے نام ہی خاندان کا سربراہ ہوتا ہے۔

آیئے اب ہم آپ کو ایک پُر مسرت اور کامیاب شادی کے لئے ایسے اصول بتائیں جو وسیع تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہیں حالانکہ عام طور پر ان کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ ان اصول کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ ان کی کتنی اہمیت ہے۔

شوہر کو کیا کرنا چاہیئے؟

۱ دن میں ایک مرتبہ اپنی بیوی کی گردن کی پشت پر بوسہ دیجئے۔
۲ اپنی بیوی کے لئے ایسے پھول لایئے جن کو وہ سونگھنا پسند کرتی ہو۔
۳ اگر آپ کی شادی کو کافی عرصہ گزر گیا ہے تو آپ کو چاہیئے کہ اپنی بیوی کے پکائے ہوئے کھانوں کی اکثر تعریف کیا کریں اور اس کا شکریہ ادا کریں۔
۴ اپنے کاموں میں اپنی بیوی کا مشورہ لیجئے اور اس کے معقول مشوروں کو قبول بھی کر لیا کیجئے۔
۵ ایسے گانوں کے ریکارڈ لایئے جن کو آپ دونوں سننا پسند کرتے ہوں۔
۶ اکثر اوقات اپنی بیوی کو ہنسانے کے لئے مذاق کے نئے نئے پہلو نکالیئے۔
۷ اپنی بیوی کی موجودگی میں کسی دوسری عورت کی تعریف سے احتراز کیجئے۔
۸ اگر آپ کسی تقریب میں جا رہے ہیں اور آپ کی بیوی التجا کرتی ہے کہ آپ جلدی واپس آ جائیں تو آپ اس کا کہنا مانئے۔
۹ اپنی بیوی سے یہ نہ پوچھئے کہ آپ دن بھر کیا کرتی رہتی ہیں۔
۱۰ گھر میں ہمیشہ مسکراتے ہوئے داخل ہو جیئے
۱۱ اپنی پوری تنخواہ یا آمدنی ہر مہینہ اپنی بیوی کے حوالے کر دیجئے۔
۱۲ اپنی بیوی کو اکثر تحفے پیش کرتے رہیئے۔

بیوی کو کیا کرنا چاہیئے؟

۱ اپنے بچوں سے یہ کبھی نہ کہئے کہ میری طرف سے تو تم کو ایسا کرنے کی اجازت ہے لیکن تمہارے والد منع کرتے ہیں۔
۲ کوئی مسئلہ اس وقت تک شوہر کے سامنے نہ رکھئے جب تک کہ آپ اس کو کھانا نہ کھلا دیں۔
۳ اچھا لباس پہنئے اور اپنی زینت کو برقرار رکھئے۔
۴ اپنے شوہر سے اکثر اس قسم کے جملے کہئے "آج تو آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں"

۵ اگر آپ اپنے شوہر کو کچھ گنگناتے ہوئے پائیں تو اس کو کبھی نہ ٹوکیے۔
۶ اپنے شوہر سے یہ کبھی نہ کہیئے کہ آپ کی یہ عمر نہیں کہ ایسی باتیں کریں یا اب تو آپ عمر ہو گئے ہیں اس لئے اب آپ کو ایسی حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں۔
۷ اپنے شوہر کے آنے کے وقت گھر پر موجود رہیئے۔
۸ اگر آپ کے شوہر کبھی غصہ کریں تو ان سے تکرار نہ کیجئے بلکہ بات کا رخ پلٹنے کی کوشش کیجئے۔
۹ اپنے شوہر کے لئے اکثر تحفے خریدیئے۔
۱۰ آپ اپنے شوہر سے ہر وقت یہ نہ پوچھا کیجئے "کیا آپ واقعی مجھ سے محبت کرتے ہیں"؟
۱۱ اور جب آپ کے شوہر آپ سے محبت کا اظہار کریں تو ان پر یقین کیجئے۔ اور اُن پر اپنا اعتماد ظاہر کیجئے۔

شوہر اور بیوی دونوں کو کیا کرنا چاہیئے؟

۱ اپنی صحت کا خاص خیال رکھئے۔
۲ ہمیشہ جنسی ملاپ ایک دوسرے کی آمادگی پر اور خوشگوار حالات میں کیجئے۔
۳ کھانا کھانے کے فوراً بعد کبھی جنسی ملاپ نہ کیجئے۔
۴ اگر آپ کچھ مدت کے بعد ایک دوسرے سے ملیں تو ایک دوسرے کا پرجوش خیر مقدم کیجئے۔
۵ ایک دوسرے کو اپنے بچوں کی نسبت سے ماں یا باپ کہکر نہ پکاریئے مثلاً رضیہ کے ابا یا شاہد کی امی۔ بلکہ ایک دوسرے کا نام لیجئے۔
۶ کسی مسئلہ کو طے کئے بغیر یا اس کا صحیح حل نکالے بغیر نہ سوئیے۔
۷ ایک نوٹ بک رکھئے اور اس میں اپنے خاندان کے اہم واقعات تحریر کیجئے۔
۸ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی کھیل کھیلئے جیسے بیڈمنٹن، کیرم، تاش، ٹیبل ٹینس وغیرہ۔
۹ کسی کام میں تاخیر ہونے پر ایک دوسرے پر جھنجھلایئے نہیں۔
۱۰ ایک ہی وقت میں غصہ کرنے سے پرہیز کیجئے۔
۱۱ ایک دوسرے کے ذاتی حالات اور رازوں کو دوسروں پر ظاہر نہ کیجئے۔
۱۲ خوشگوار موسم میں پکنک پر جایئے۔
۱۳ ایک مشترکہ فوٹو البم بنایئے جس میں خاندان کے افراد کی تصویریں ہوں۔
۱۴ ایک دوسرے کے اعزا اور احباب کا احترام کیجئے اتنا ہی جتنا آپ اپنے اعزا اور احباب کا احترام کرتے ہیں۔
۱۵ مہینہ میں ایک رات کے لئے ایک دوسرے سے ضرور جدا رہیئے۔
۱۶ ہمیشہ مستقبل کے منصوبے مشترک طور پر بنائیے۔
۱۷ کسی دوسرے کی موجودگی میں ایک دوسرے پر تنقید ہرگز نہ کیجئے۔
۱۸ کبھی اس قسم کے جملے استعمال نہ کیجئے "بہرحال آپ کے لئے تو مجھے ایسا کرنا ہی پڑے گا"۔

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

خواب

جونؔ ایلیاء

شمالی شہروں کی ایک گلپوش وادی ـــ نوازاں ـــ کے نام جہاں اب ویرانے آباد ہیں ـ (ایلیاء)

کبھی اک خواب سا دیکھا تھا میں نے

کہ تم میری ہو اور میرے لئے ہو
تمہاری دل کشی میرے لئے ہے
تمہارے آتشیں رخسار و لب کی
شہابی تازگی میرے لئے ہے
تمہاری مرمریں دوشیزگی کا
گدازِ "اجنبی" میرے لئے ہے
میں جو کچھ ہوں تمہارے ہی لئے ہوں
تمہاری ہر خوشی میرے لئے ہے
تمہارا جسم ہے میری امانت
تمہاری روح بھی میرے لئے ہے

وہ راتیں آہ وہ سرمست راتیں

کہ جن کی تشنہ لب سرمستیوں نے
سرورِ تشنگی بخشا تھا مجھ کو
تمہاری والہانہ بیخودی نے
غرورِ دلبری بخشا تھا مجھ کو
تمہارے جسم کی جاں پروری نے
جمالِ سرمدی بخشا تھا مجھ کو
ہماری باہمی انگڑائیوں نے
یقینِ زندگی بخشا تھا مجھ کو

یقینِ زندگی ـــ خوابِ جوانی

عذابِ روح بن جائے گا اک دن
کبھی میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا
نظر کے ساتھ تردیدِ نظر بھی
ضروری ہے یہ سمجھا ہی نہیں تھا
یہ ہوگی خواب کی تعبیر ـــ یعنی
کہ میں نے خواب دیکھا ہی نہیں تھا
جو میری زندگی کا نقش گر ہے
کبھی وہ دور گزرا ہی نہیں تھا

بہت مہنگا پڑا وہ خواب مجھ کو

کہ بیداری میں بھی وہ خواب مجھ سے
ہر اک لمحے کی قیمت چاہتا ہے
کبھی کا ایک نیم آسودہ احساس
شعورِ غم کی شدت چاہتا ہے
ہو دل میں شعلہ زن اک داغِ نفرت
جو دنیا بھر سے نفرت چاہتا ہے
محبت کا شعور زخم خوردہ
ہر اک شے سے بغاوت چاہتا ہے

تمہیں کیا کچھ سمجھ رکھا تھا میں نے

تمہاری اس زوال آمادگی پر
مری انسانیت اندوہگیں ہے
مگر تم سے گلہ کیا ہو کہ تم میں
اب احساس تناسب تک نہیں ہے
یہ دُنیا اف یہ انسانوں کی دنیا
ہر اک انساں یہاں تنہا نشیں ہے
قیامت ہے کہ یہ تنہا نشینی
ازل سے آج تک خواب آفریں ہے

وہ راتیں خواب ہو کر رہ گئی ہیں

مگر خوابوں میں خوابوں کا تسلسل
عذاب جاں بھی ہے جاں آفریں بھی
یہ زنجیر خیال و خواب و اوہام
فریب زندگی بھی ہے یقیں بھی
فریب زندگی اک ایسی جنت
نہیں جو میری دنیا میں کہیں بھی
یقین زندگی ایسا جہنم
جو ہے خود سوز بھی خود آفریں بھی
یہ ظالم خواب یہ اپنا مقدر
ہیں ایسا جبر جو ہے بھی نہیں بھی
کہیں ان سے مفر ممکن نہیں ہے
یہ دنیا بھی ہیں دانش بھی ہیں دیں بھی

میں جب بیدار ہوتا ہوں تو مجھ کو

حقیقت بن کے بہکاتے ہیں یہ خواب
سُلا کر حال کی تاریکیوں میں
مجھے ماضی میں چونکاتے ہیں یہ خواب
مری پلکوں کو بوجھل دیکھتے ہی
سمٹ جاتے ہیں شرماتے ہیں یہ خواب
میں ان خوابوں سے جب بھی روٹھتا ہوں
تو برسوں اشک برساتے ہیں یہ خواب
مجھے باہنوں کے حلقے میں جکڑ کر
مرے سر کی قسم کھاتے ہیں یہ خواب
مرا آغوش اپنانے کی خاطر
زمانے بھر کو ٹھکراتے ہیں یہ خواب
اگر یہ جاگ اٹھیں تو سارا جگ ہیں
نہیں تو خواب کہلاتے ہیں یہ خواب
حقیقت کب ہے ان کی دسترس میں
کہ بس خود کو ہی دہراتے ہیں یہ خواب
ہوں شاید میں بھی اک خوابوں کا سایہ
جسے خوابوں میں چونکاتے ہیں یہ خواب
شفق پر روکتے ہیں اپنا آنچل
افق میں جا کے چھپ جاتے ہیں یہ خواب

جہاں اپنے عدم میں ہے اکیلا
خلاؤں کا عظیم الشان اندھیرا

شعلۂ بیدار

سحر انصاری

زندگی! تیرے غم انگیز نہاں خانے میں
کتنی صدیوں کے حوادث تھے بہل جانے میں
کتنے سائے در و دیوار پہ لہراتے رہے
سانپ کی طرح سے پھنکارتے، بل کھاتے رہے
کسی روزن سے نہ جلووں کی کرن در آئی
کوئی امیدِ تجلّی نہ کبھی بر آئی
عقل گم، قلب تپاں، گنگ زباں، اعصاب شل
نہ کوئی شامِ تمنا، نہ کوئی صبحِ عمل
کتنی صدیوں کے مصائب تھے بہل جانے میں
زندگی! تیرے غم انگیز نہاں خانے میں!

یک بیک روحِ عناصر کو ملی جنبشِ نو
ذہن میں جاگ اُٹھی علم کی، عرفان کی رَو
عقل اک شعلۂ بیدار کی صورت چمکی
رات خود مہرِ طرحدار کی صورت چمکی
روح میں جمع کیے کتنے شرارے میں نے
خود تخیل سے نئے نقش اُبھارے میں نے
کتنے بے آب چمن، خونِ جگر سے سینچے
کس قدر نقشِ جواں صفحۂ جاں پر کھینچے
موجِ مے، نکہتِ گل، بادِ صبا، رنگِ حنا
ان کی ترتیب سے میرا بُتِ پندار سجا
یک بیک ٹوٹ گیا میری خموشی کا طلسم
روح کے ساتھ ہی سرگرم ہوا رقص میں جسم
دل ہوا مائلِ پرواز سوئے ماہ و نجوم
زندگی جان گئی ذوقِ سفر کا مفہوم

مگر اے زیست! زمانہ ہے ہمہ قہر و بلا

ایک ہی ضربِ حوادث نے کہیں کا نہ رکھا
سیلِ آفات سے طوفاں بھی دبل جاتے ہیں
دشت و کہسار بھی بچ بچ کے نکل جاتے ہیں
شعلہ و شبنم و گلزار کا موسم بدلا
جذبہ و دانش و افکار کا موسم بدلا
روزنِ در سے فقط سرد ہوا آنے لگی
فصلِ گل، غنچۂ معصوم تھی، مرجھانے لگی

سارے ماحول کو اک یخ زدگی چاٹ گئی
رشتۂ جہد و عمل، تیغِ اجل کاٹ گئی
حسرتِ سیرِ چمن، اُلفتِ گل، بیمِ خزاں
ایک دل، اور یہ بڑھتے ہوئے اندوہ گراں!
ذہن ماؤف ہوا جاتا ہے، رفتہ رفتہ
روحِ بیدار نظر آتی ہے خستہ خستہ
دب گیا برف میں وہ شعلۂ بیدار مرا
موم کا بُت نکل آیا، بُتِ پندار مرا
سر کو ٹکراؤں تو کس آس پہ اب ٹکراؤں
بُت کو اب تک نہیں پوجا ہے تو اب کیا پوجوں
لاکھ یہ برف کا ماحول ہے پر پھیلائے
کاش اک تازہ تپش روح میں گھر کر جائے
سرد یہ شعلۂ بیدار نہ ہونے پائے
موم کا بُت ستم آثار نہ ہونے پائے
تاکہ دل کو یہ یقیں ہو کہ صبا آئے گی
اپنے دامن میں لیے بوئے وفا آئے گی
موم تو شمع کی مانند بھی جل سکتا ہے
برف، شعلے کی حرارت سے پگھل سکتا ہے

دوَر آفریدی

خط کا جواب

جب ترے شہر و کوچہ و در سے
زندگی سر گراں رہی تو نے
کوئی عہدِ وفا کی بات نہ کی

۲

تیرے کردار کے چراغوں میں
حُسن جلتا رہا تقدس کا ——
وہ تقدّس کہ جس کا سرمایہ!
نورِ شائستگی و شرم و حیا
رفعتِ دلبری و رنگِ حنا
شوخی و بے خودی و ناز و ادا
تو نے اپنی ہوس کی نذر کیا ——
پھر بھی تو مطمئن رہی کہ تری
فکر و خصلت کا بول بالا تھا

۳

اس جہانِ خراب میں کہ جہاں
تیری فرعونیت کے چرچے تھے
میری دُنیا پہ ایک وقت پڑا
صُبحیں اپنا نکھار بھول گئیں
شامیں افسردگی کے نام ہوئیں
راتیں مُنہ ڈھانپ ڈھانپ کر روئیں
پھر بھی تجھ کو کوئی خبر نہ ہوئی

۴

وقت گذرا گذرنے والا تھا
وقت نے کب کسی کا ساتھ دیا
اے مری آج کی قلوپطرہ ——

۵

اور اب! جب کہ زندگی کے لئے
کوئی فکرِ نشاط و غم بھی نہیں
اپنی چاہت کا واسطہ دے کر
اب مجھے کیوں بلا رہی ہے تو؟

۶

جب ترے شہر و کوچہ و در سے
زندگی سر گراں رہی تو نے
کوئی عہدِ وفا کی بات نہ کی!

غزل

جعفر طاہر

پھر کسی کے لب و گیسو بولے
جیسے گلزار میں خوشبو بولے
کھل کے لہرائے نہ کیوں زلفِ رسا
سر پہ چڑھ کر ہی تو جادو بولے
بندِ پیراہن محبوب کھلے
سہمے سہمے ہوئے آہو بولے
کس کے آنچل کا پڑا ہے سایہ
سرو لہرا کے لب جو بولے
بات کرنے کی ادا ہوتی ہے
بولے، وہ بولے وہ ابرو بولے
یوں اُٹھائیں انھیں چپکے چپکے
کوئی پائل کا نہ گھنگھرو بولے
چوڑیاں چھنکیں ستارے ٹوٹے
جو نہ بولے تھے وہ جگنو بولے
ہم پہ تصویر کا عالم ہی رہا
رو برو سینکڑوں مہرو بولے
باتیں کرتے رہے کس کس ڈھب کی
ڈھونڈ کر سوچ کا پہلو بولے
دیر ہے کعبہ ہو دل ہے کیا ہے؟
ہر مسلمان سے ہندو بولے
ہائے زنجیر و سلاسل کی صدا
آج شرماتے ہوئے تو بولے
تیری آواز رُتوں کا سپنا
میرے اشعار میں باہو بولے
گر زباں چپ رہی جعفر طاہر
سرِ مژگاں مرے آنسو بولے

کامل القادری

○

محرمِ رازِ گلستاں ہیں ہم
فطرتِ گُل کے ترجماں ہیں ہم

طبعِ نازک پہ جو گراں گزرے
شمعِ کشتہ کا وہ دھواں ہیں ہم

چپ ہوئے تو ہیں محشرِ خاموش
بول اُٹھے تو اک فغاں ہیں ہم

ہم غریب الدّیار کیا جانیں!
راہ کتنی ہے! اب کہاں ہیں ہم؟

رنگِ محفل کا دیکھ کر چُپ ہیں
وہ سمجھتے ہیں بے زباں ہیں ہم

رسمِ سقراط ہم سے تازہ ہے
زہر پی کر بھی شادماں ہیں ہم

ہم سے کامِل ہے ارتقائے حیات
قطرۂ بحرِ بیکراں ہیں ہم

شاعر فتحپوری

گل یاد نہ امواجِ نسیمِ سحری یاد
کچھ بھی نہیں جز عالمِ بے بال و پری یاد

خورشیدِ سحر عارضِ مہتاب کا عالم
نظروں کو ابھی تک ہے تری جلوہ گری یاد

سوئے حرم و دیر کبھی رُخ نہ کریں گے
جن کو مرے ساقی کی ہے رنگیں نظری یاد

بیخود ہے مری روح محبت کی فضا میں
غم یاد ہے مجھکو نہ ہے آنکھوں کی تری یاد

یہ وقت بہرحال گذر جائے گا لیکن
رہ جائیگی آہوں کی ہمیں بے اثری یاد

جلوؤں کی نمائش نہیں کرتی نظر اُن کی
رہتی ہے جنہیں حسن کی دیوانہ گری یاد

پاکیزہ طبیعت پہ بہت ناز ہے واعظ
کیا تجھکو نہیں شیشہ و مینا کی پری یاد

میں وہ ہوں کہ بے پردہ تجھے دیکھ چکا ہوں
شاید ہو تجھے میری وسیع النظری یاد

میخانہ تھا اور شغل مئے ناب تھا شاعر
اب تک ہے مجھے [illegible] کی تری یاد

ھینسن ریحانی

تقلید سے بشر کو آزاد کر رہے ہیں
ہم ایسی ایک دنیا آباد کر رہے ہیں

بنیادِ آشیاں تو رکھدی چمن میں ہم نے
کرنے دو مشورے جو صیاد کر رہے ہیں

اے حسن ہم نے جی کر رکھلی ہے لاج تیری
جو کر سکے نہ قیس و فرہاد کر رہے ہیں

اس انجمن میں اپنا محرم نہیں ہے کوئی
سازِ غزل پر ان کو ہم یاد کر رہے ہیں

اے برق آ نہ جائے گلزار تیری زد میں
ہم خود نشیمن اپنا برباد کر رہے ہیں

نظریں نہیں ہیں جن کی محدود خالِ رخ تک
وہ نو بنو ستارے ایجاد کر رہے ہیں

کیوں شیخ اور برہمن اتنا نہیں سمجھتے
دونوں بیان اک ہی روداد کر رہے ہیں

ریحانی گوشِ گل تک ہو یا نہ ہو رسائی
بلبل تیرے گلستاں میں [illegible] کر رہے ہیں

نسیم ایرانی نیشو

فرشتے کی واپسی

اطلال کی راہوں میں تمناؤں کی شمعیں جل اٹھیں۔ دیوتا میوس کا عتاب تھم گیا۔ فضا میں صحائفِ مقدسہ کا سا جمال ظاہر ہونے لگا۔ عبرانی کاہنیں ہاتھی دانت کی بنی ہوئی اعنورائیں (صراحیاں) اٹھائے ہیولات کے ساتویں ہیکل میں داخل ہو رہی تھیں۔ کبھی یہاں سے دریائے یردن کا باعظمت پانی بہتا گزرا تھا جو گناہ میں ملوث روحوں کو توبہ کا بپتسمہ دیا کرتا تھا اور یہ بھی کہا جاتا تھا۔

"میں نے تم کو پانی سے بپتسمہ دیا وہ تم کو روح القدس کا بپتسمہ دے گا۔"

ہیولات کا معبد خاموش تھا اس کے بڑے ناقوس پر سات گیت منقش تھے جسے ہر صبح ایتھر میں ڈوبی ہوئی اور نہلائی گئی عروسی لباس پہنے اس کے سپید کاندھے سے دودھیا اعنورا گر پڑی، اور بکھرتے ہی زعفرانی دھواں بن گیا۔ اور ستونوں پر زعفرانی خوشبودار نمی پھیلنے لگی۔ کوئی کراہ اٹھا۔

میں مجسم نفیر و فریاد ہوں، کوئی مجھے اعنورا سے اس کے دو قطرے پلا دے۔ روح تو دردِ حقیقت سے آشنا ہے۔ لیکن جسم سرخ و زرد اشتیاق کی زبان نہ بن سکا۔ بادل آسمانی خیمے ہیں جن کے پیچھے مقدس مکاشفات کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے وہاں زبور اور توریت کے امین ہیں جہاں نئی الہام گاہوں کے خوابیدہ فرشتوں کے سنہرے تالاب رواں ہیں جن کے پینے سے عرفان کی ابدی لوریاں گنگنانے لگتی ہیں اور جہاں عرش العرش کے پاک و طاہر معمار شفقت و زاہدیت کے کلیسا تعمیر کرتے ہیں تاکہ آنے والوں کا استقبال کر سکیں۔ میں حقیقتِ الوہی سے آشنا ہوتے ہوئے بھی نیم سارب بن گیا زبور کے ایک سو پچاس گیت گاتے ہوئے بھی آہوں کی شمع بن گیا مجھ میں پروانوں کی سانسوں کا عرق جذب ہو رہا ہے . . . . وہ تھا سائرل جسے کوڑھ کے موذی مرض نے گندے پاتال سے اوپر اچھال دیا تھا۔

معبد کی کنواری سبینا نے پوچھا "تم کون ہو۔ فرشتگانِ ازل نے تم جیسا بدصورت انسان شاید ہی کسی کو بنایا ہو۔ تمہارے بدن چہرے پر پھوڑوں کی بساند ابل رہی ہے اور تمہارے ان سیاہ ہونٹوں پر پیپ کے کیڑے رینگ رہے ہیں۔ کون ہو تم؟"

"سبینا۔ اس مردار کی ہڈیاں یوں ہی گل سڑ جانے دو۔ تم خواہ مخواہ ناپاک کیوں ہو رہی ہو" دوسری معبد کی داسی نے سائرل کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اشجار ایلم کے مقدس سائے تلے خداوند کی مدح سرائی کرنیوالا ہماری شفقت کا طالب ہے" وہ بولی۔

"کائنات کی ہر شے نسمۂ پاک ہے شبنم کی لطافت سے زیادہ معصوم اور جنگلی شہد سے زیادہ میٹھی۔ بحر تلخ و شیریں ایک ہی سمت بہتے ہیں۔ لیکن ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہوتا ہے جو دونوں کے امتیاز کی مدہم لکیر ہے۔ گہراؤ کے بلبلے ڈھیر سے اس نے جو کچھ بھی پیدا کیا وہ اس کا نور ہو کر [illegible]ہ گیا ساسبری کے مقدس تالاب سے مجھے وہ مشروب پلاؤ جس سے معبد کی کنواریاں اپنا سر دھوتی ہیں۔

"مجھے تمہاری آمد کتاب مقدس کا باب معلوم ہوتی ہے۔ میں تمہاری شفایابی کے لئے وہ امرس ضرور لیکر آؤنگی۔" سبینا کی اس تعلیٰ سے سب کانپ گئیں۔

معبد کی خوبصورت ترین راہبہ یسوعِ ناصری اور سیر اعظم کے عتاب کا کچھ تو خیال کرو۔ تیرے جسم کا ہر گیت خاموش ہے تیرے بربط ناز کا ہر تار روشن ناصری کیطرح ساکت ہے۔ مکڑی جال اس لئے بنتی ہے کہ مکھیوں کو اس کی خوراک بنائے چرند اپنے ریوڑوں کی دیکھ بھال اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ان کے لئے اون اور دودھ فراہم کریں تو اس کوڑھی کو شفایاب کرکے کیا پائے گی:

"گیت کا اصل جادو یہی ہے کہ اُسے گایا جائے بربط کی بڑائی اسی میں ہے کہ وہ بجایا جائے، میرا جسم یسوع مسیح کے عبادت خانے کا خاموش گیت سہی لیکن اس میں قوت مسیحائی پیدا ہو چکی ہے۔ میں اس کے لئے اپنی تشنگر فی چھاتیوں کو شفقت آمیز آغوش بناؤں گی، میرا جسم اس جاڑے کے لئے چادر مسیحی بن جائیگا، ثلجی فضاؤں کی خنکی میں میری زلفیں اس کے لئے گرم دوشالے کا کام دیں گی، میرے جسم کا پسینہ اس کے لئے ارغوانی مرہم کا کام دیگا۔ میں اس کے لئے زیتون اور مہندی کی ڈالیوں سے ایک ننھی سی جھونپڑی بناؤں گی، اور اس کے ارد گرد انگوروں کی یاقوتی بیلوں کی باڑھ لگاؤں گی اُپتل اور سفید کنول کے گلدان سجاؤں گی۔ انسان کا انسان کیطرف جھکنا ہی ابدالآباد کے دروازے کھولتا ہے جسم کا چشمہ روح کا وضو نہیں بن سکتا اس کی پژمردگی کو جلا دینے کے لئے پاکیزہ بوسوں کی ضرورت ہے میں وہ مکمل بوسہ بنوں گی۔

"نادان سبینا! تو معبد کی قابلِ ستائش عصمت رہی ہے۔ تجھے نخلستانی ناریل کے پانیوں سے غسل دیا جاتا رہا ہے۔ تو فسانۂ عنب کی بے نظیر تمثیل ہے بصبطِ مریم کی رُوئیں سپنسٹر (SPINS TER) ہے تمہارے پستان گلیل کی دو جھیلوں کی مانند فراخ ہیں جن کے ننھے پرلک زرباف سمن ہیں۔ معطر جھاگوں میں نہائے ہوئے زرباف سمن توان کی تقدیس پر نجاست کیوں گرانا چاہتی ہے اسقدر پاک دامن ہوتے ہوئے غلیظ کیوں بننا چاہتی ہے۔ ہم ان سیکاریوں کے متحمل نہیں ہو سکتے سیر اعظم کے فرمودہ احکام کی تذلیل نہ کرو سبینا! ۔ ورنہ روحانی عذابوں سے ماری جاؤ گی تمہاری سرشت میں حمد و ثنا کی حرارت پیدا ہو چکی ہے جو دنیاوی لگاؤ سے قطعی بے تعلق ہے، تمہاری روح سراپا خدائی تمجید بن چکی ہے اسے آشفتہ نہ بنا سکو۔ باہر کی دنیا ہماری دنیا نہیں فسق و فجور کی دنیا ہے۔" بوڑھی راہبہ سمجھاتے سمجھاتے لرزنے لگی۔

"اسی آشفتگی کے بہاب میں فریفتہ ہوں۔ میری روح میں حق و باطل کی گہری کشمکش پیدا ہو چکی ہے بدی بھی نیکی کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے لیکن اس کے قبیح چہرے کو روشن کرنے کے لئے یاسمین کی کلیوں سے مہک چرانا ضروری ہے جو اکسیر کا اثر رکھتی ہو۔ تم سب چلی جاؤ میرے اعضا پر محبت کی چمیلی لکیریں کھینچی جا رہی ہیں، میری آنکھوں کی پتلیوں میں حسن آفریں شاعرہ کی مشوب غزلیں رقص کرنے لگی ہیں وہ عظیم شاعرہ جس نے یسوع مسیح کی پیدائش پر سات غزلیں نقرئی لے میں گائی تھیں، وہ غیبی شاعرہ جو اپنی سات غزلوں کا تحفہ سنہرے مصری کاغذ میں لپیٹ کر لائی۔ لاجوردی رنگوں کے شفاف دھارے کی پھوار سے اَب وہ آسمانی پردوں میں گم ہو رہی ہے۔" سبینا کے ان الفاظ سے وہ دوبارہ سر سے پاؤں تک لرز گئیں۔ ان سب کی مرمریں باہنوں میں لرزش پیدا ہو گئی۔ اسطورائیں چھلک اٹھیں، میٹھا امرس زعفرانی دھواں بنکر ایک بار پھر فضاؤں میں تحلیل ہو گیا۔ دھوئیں کے پھیلتے ہی سبینا اپنی اسطورا سنبھالے معبد میں داخل ہو گئی امرس کو ابری کے مقدس قاب میں انڈیلا اور وہ مشوب چرا لائی جس سے معبد کی کنواریاں اپنا سر دھوتی تھیں۔ یہ چراتے ہی اس کی صراحی دار گردن سے وہ خوبصورت مالا بے اختیار ٹوٹ گئی۔

ہیکلات کے ساتویں دروازے خود بخود بند ہونے لگے پھر ایک دروازہ کھلا جس میں ایک داسی غضبناک صورت بنائے نکلی۔

"بدنصیب سبینا۔ یہ لے مٹی کا آبخورہ اور پیتل کی کٹوری۔ اس گناہ کی پاداش میں تجھے ہمیشہ کے لئے ان دو برتنوں میں کھانا ہوگا۔ بگڑیو رکھو! اگر

اپنے برتنوں میں تو نے کسی اور کو کھلایا تو نہایت بھیانک روگ کا شکار ہو گی۔ اب تو ایک ملعون حقیر بدروح ہو کر رہ گئی ہے"۔

ساتوں دروازے بند ہو چکے تھے۔ ادھر سائرل درد و تکلیف کے باعث بری طرح چیخ رہا تھا۔

"میں تمہارے لئے مقدس قاب کا جادو اثر مشروب لے آئی ہوں مظلوم انسان" سبینا بولی۔

"مجھے بچاؤ . . . ." وہ چلایا۔ اس نے وہ مشروب سائرل کے حلق میں انڈیلا اور پھر زیتوں کی جھاڑن سے اس کے متعفن جسم پر بیٹھتی ہوئی مکھیاں اڑانے لگی۔

متواتر سات مہینوں تک وہ اس کی تیمارداری کرتی رہی، کٹوری میں سبزیوں کا شوربہ ڈالتی اور آبخورے میں پانی بیتی۔ گاؤں کا رحمدل گوالا ہوفر کبھی کبھار بکریوں کا دودھ دے جایا کرتا۔

"اب میرے اچھے ہونے کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے"۔ سائرل نے کہا۔ "وہ کونسی" اس نے پوچھا۔

"میری غمخوار اچھی سبینا، میں بتاتے ہوئے ڈرتا ہوں"۔ وہ بولا۔

"ڈرو نہیں، میں ہر حالت میں تمہاری شفقت کا سائبان بنی رہوں گی"۔ سبینا کہنے لگی۔

"آہ! تو سنو! اے شفقت کا مکمل ترین پیکر . . . . سنو، مجھے اپنے آبخورے اور کٹوری میں کھانا کھلاؤ اور سچے دل سے مجھے اپنی کول . . . کنول سی معصوم آغوش میں لے لو"۔ سائرل نے کہا۔ اور وہ یک لخت کانپ گئی۔

"مجھ بیکس کو اگر نراش ہی کرنا تھا۔ ؟ ؟ یونہی نراشا کی کالی کھائی میں گرانا تھا؟" سائرل سر جھکاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"نہیں نہیں۔ میں تمہیں ناامید نہیں ہونے دوں گی"۔ اس نے اپنی کٹوری آگے بڑھا دی۔ سائرل کی برص زدہ انگلیاں اپنے لئے چھوٹے چھوٹے نوالے بنانے لگیں اور جب انجام سے بے خبر ہو کر سبینا نے سائرل کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تو اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی نخلستان میں بری طرح الجھ کر گھائل ہو رہی ہو۔ دوسرے لمحہ وہ بے سدھ ہو گئی اور پھر جب اس نے اپنے حواس مجتمع کئے تو اپنے سامنے ایک صبیح و شکیل نوجوان کو پایا جس کے جسم پر ایک بیلوغ نم کا عبرانی لبادہ تھا۔ وہ حیران و پریشان ہو گئی۔

"سائرل کہاں گیا۔ تم کون ہو . . ." وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

"میری مسیحا۔ یہ میں ہوں تمہارا اپنا سائرل . . . ."

مشرقی کناروں اور اس کے اطراف و جوانب میں بادلوں کی رنگت ہلکی شربتی ہوتی گئی، ہر سمت ابرق کے سیمابی دھارے ابھرتے لگے۔ فضائیں نشاط جمال کا دلکش نغمہ بن گئیں۔

"اعجاز مسیحا تم پر اپنا کرم رکھے۔ تم کون ہو . . . . ." اس نے دوبارہ پوچھا۔

"سچ مچ میں تمہارا سائرل ہوں، ذوق جمال رُوفسی سپنسٹر (SPINSTER) میری سبینا !!!" وہ قدرے وارفتہ ہو چلا۔ عجیب سی کیفیت سبینا پر طاری رہی پھر وہ یکلخت چلانے لگی۔

"میرا سارا جسم جھلس رہا ہے۔ مجھے بچاؤ . . . مجھے بچاؤ"۔ اسی لمحہ اس کا چاندی سا جسم ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ پیتل کی کٹوری چھوٹ گئی اور جونہی سبینا نے اسے ہاتھ میں پکڑا۔ کٹوری کی چمکیلی سطح پر اسے ایک بھیانک چہرہ نظر آیا پھوڑوں اور تعفن کا وہی اُبال لئے ہوئے

"سائرل میرا چہرہ ؟ . . . ."

لیکن سائرل کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔

"اب شاید ... مسیحا کی باری ہے" وہ جواباً مسکرایا۔

"تم کتنے احسان فراموش اور بے فیض ہو سائرل! کیا تمہیں میری گذشتہ خدمات کا ذرّہ بھر بھی احساس نہیں کہ میری بدصورتی پر ایک لمحہ ہی اظہار افسوس کر سکو۔ آہ سنگدل سائرل . . . یوں تو نہ مسکراؤ . . ." وہ بے اختیار رونے لگی۔

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہوں۔ یوں غم نہ کرو سبینا۔ ایک بار میری آغوش میں واپس آجاؤ تاکہ تمہارا سارا جسم نئے کندن میں ڈھل سکے" یہ کہہ کر سائرل آگے بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے سبینا روپ کی اچھوتی کلا بن گئی . . . "تم کون ہو سائرل میری خوبصورتی مجھے واپس مل گئی تمہاری آغوش میں فردوس کی سی گمنام شادابیاں ہیں۔ تم کون ہو؟"

اسی اثنا میں پادریوں کا ایک گروہ ان دونوں پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں گرفتار کر لئے گئے

"سمیر اعظم بیت المقدس کے متبرک و مبارک طواف سے واپس آگئے ہیں اور وہ تمہیں معبد کی بے حرمتی کی سزا دینا چاہتے ہیں تمہیں اس گناہ اور ہٹ دھرمی کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔"

سبینا کو راہب اعظم کے فرمان کے مطابق سنگسار کرنے کا فیصلہ سنایا گیا اور سائرل کو شہر بدر ہونے کا یوم سبت پر راہبوں کا ایک طویل جلوس موسیقی کے طائفے کے ساتھ نکلا۔ چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد یہ جلوس ایک خاص میدان میں جسے "میدان نشور" کہا جاتا تھا جا کر رکا، سبینا ایک . . . بے ڈھنگے چھکڑے میں کھڑی تھی جسے حبشی مسخرے کھینچ رہے تھے، سبینا کے ہاتھ میں کاٹھ کی معمولی سی صلیب تھی جسے تھامے ہوئے وہ بار بار سائرل کا نام لے رہی تھی۔

"خدائے قدیر و مطلق محبت کا سرچشمہ ہے سائرل! میں اس تک عنقریب چلی جاؤں گی میرے ہاتھوں میں اس صلیب اور تمہاری محبت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔"

جب سمیر اعظم کے حکم کے مطابق اسے سنگسار کرنے کے لئے کھڑا کیا گیا تو سائرل نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ فریاد کے لئے اٹھائے عین اس وقت۔

دیوتا عیولس (ہواؤں کا دیوتا) اپنی آہن گاہ سے نکلا اور اس نے بادلوں کو حکم دیا۔

"جہنمی بادیہ کی سب سے اسفل ہواؤ . . . جاؤ اور ان کو غارت کر دو۔ آسمانی ہطل کی لہرو . . . جاؤ اور ان کے جسم کی ایک ایک شریان میں انجماد پیدا کر دو۔ سلامتی ہو ان پر جو ایمان و صداقت سے اپنے دلوں میں سکون پاتے ہیں۔"

پھر میدان نشور حقیقتاً آسمانی نشور کی زد میں آگیا... ہر چیز نیست و نابود ہونے لگی اس قیامت خیزی کے بعد دیوتا عیولس نے کہا۔
"نسیم تریں کے جھونکو! ارض مقدس کے ان لوگوں کو پیام راحت پہنچاؤ جو اپنے معبود عظیم کے حضور سربسجدہ ہیں"
وہ سبینا سائرل سے پوچھ رہی تھی کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

"یہ بات [illegible] سبینا! ورنہ میں تمہیں [illegible] نہ پاسکوں گا، مگر سبینا کا اصرار [illegible] سبینا تم مجھے کھو دینا چاہتی ہو؟ نہیں [illegible] محبت [illegible] کی قسم [illegible] . . . [illegible]

[illegible]

"اچھا میں تمہیں یہ بتلاتے ہوئے وداع ہوتا ہوں کہ میں آسیہ کے ساتویں کلیسا کا معتوب و معزول فرشتہ ہوں۔ مجھ پر یہی منکشف ہوا کہ محبت ایک اجمالی کیف ہے جو انسان کو آسمان کی بلندیوں سے گراتی ہے اور یہی محبت زمین سے پھر آسمانوں تک لے جاتی ہے۔ الوداع سبینا تمہاری ہی محبت نے مجھے آج معراج بخشی ہے میری سرشت و نژاد میں اب یہی محبت ہے انتظار کی کلیاں لیے شاداب رکھیں۔ آمین: زعفرانی دھواں اٹھا۔ زیتون کی پتیوں پر آنسوؤں کے دائرہ نما نقشے نوحہ خواں تھے:

(بقیہ ص۳۳)

میرے خیال میں مذہب کی بنیاد سراسر خوف پر ہے۔ خوف اس پورے معاملہ کا محور ہے۔ پراسرار اشیاء کا خوف، نامعلوم اشیاء کا خوف شکست کا خوف، موت کا خوف —— اور خوف ظلم کا بانی ہے۔ اس طرح یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ ظلم اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ دونوں کی بنیاد خوف پر ہے۔

اب ہم اس دنیا کو کچھ کچھ سمجھنے لگے ہیں اور سائنس کی مدد سے ہم عناصر پر قابو پاتے جا رہے ہیں — سائنس ہمیں خوف کی اس کال کوٹھری سے نکلنے میں مدد دے سکتی ہے جس میں انسان ابتک رہتے آئے ہیں۔ سائنس ہی نہیں بلکہ خود ہمارے دل ہمیں بتا سکتے ہیں کہ اب ہمیں موہوم سہاروں کی ضرورت نہیں ہے، کہ اب ہمیں آسمانوں سے رشتہ توڑ کر اپنی تمام کوشش زمین پر مرکوز کر لینا ہیں تاکہ یہ دنیا زندگی کے شایان شان بن سکے ——

(بقیہ ص۳۵)

ہوتی ہے۔ ماؤ سے ملاقات قریب قریب خارج از بحث ہے۔ دنیا کے ہر اخبار کا نامہ نگار خروشیف سے مل سکتا ہے۔ آئزن ہاور سے انٹرویو لے سکتا ہے چرچل کا مہمان بن سکتا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی خواب گاہ میں گھس سکتا ہے۔ لیکن ماؤزے تنگ؛ تو وہ ایک خیالی انسان ہے جس کی تصویریں سب نے دیکھی ہے۔ ملاقات کی مسرت کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ مگر اس گوشہ نشینی کا سبب ماؤ کی انفرادیت پسندی یا حد سے بڑھا ہوا شعور ذات نہیں۔ بلکہ اس کا انکسار اور شرمیلی طبیعت ہے۔ وہ عظیم چینی دانش مندوں کی طرح اپنی شخصیت کے خول میں بند رہتا ہے یوں سمجھئے کہ ماؤ بجائے خود ایک غار ہے جس میں خود ماؤ چھپا ہوا ہے کہ

میں ایک سیدھا سادھا چینی کسان ہوں — اور میرا فریضہ یہ ہے کہ صبح سے شام تک محنت کروں۔ ساٹھ کروڑ انسانوں کے مسئلوں پر غور کروں — ہمارے لئے۔ ڈنروں۔ پارٹیوں اور ملاقاتوں میں وقت ضائع کرنا عیاشی ہے۔ چینی قوم ایک غریب اور بے وسیلہ قوم ہے اور وہ میری اس عیاشی کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔

(بقیہ ص۷۲)

۱۹ ہمیشہ ایک دوسرے سے میٹھے اور دھیمے لہجہ میں بات کیجئے۔

۲۰ اگر آپ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں تو ایک دوسرے کے خطوں کا جواب فوراً دیجئے۔

۲۱ ایک دوسرے کے پسندیدہ لباس، پسندیدہ غذاؤں، پسندیدہ کھیلوں اور محبوب شاعروں اور مصنفوں کو دل سے پسند کرنے کی کوشش کیجئے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم ظاہر ہی کیجئے کہ آپ انھیں پسند کرتے ہیں۔

دنیا میں ایسی چیزیں یا ایسے اصول و نظریات بہت ہی کم ہیں جن پر آپس کی محبت اور انسانی قدروں کو قربان کر دیا جائے۔ فرض کیجئے کہ آپ میں [ایـ]ک کو پکے گانے پسند ہیں اور دوسرا ہلکی پھلکی دھنوں کو پسند کرتا ہے تو اس پر سنجیدگی سے بحث کرنے بات کو طول دینے اور اس پر جم جانے سے کیا فائدہ؟ [د]لیلوں سے اپنی بات کو منوا بھی لیا تو اس سے آپ دونوں کی مسرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا، بلکہ اختلافات اور بھی محکم ہو جائیں گے۔

[اب] آپ نے یہ مشورے پڑھ لئے ہیں دیکھیں کہ آپ کس حد تک ان پر عمل کرتے ہیں۔ اور اپنی زندگی کو کتنا خوشگوار اور پر مسرت بناتے ہیں۔

دُردانہ ہاشمی

ہوچکا انتظار

چھن۔ چھن۔ چھن۔ آغا بھائی کی تصویر ایک جھٹکے کے ساتھ زمین پر آرہی۔ میں اور نسرین گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔ کہیں صنوبر بھابی کی نظر نہ پڑ جائے مگر تصویر کا چھناکا صنوبر بھابی نے سن ہی لیا۔ میں تصویر کے ٹکڑے زمین پر جمع کرنے بیٹھی۔ تو بھابی کی کمزور و نحیف آواز کمرے میں گونجی۔

"کیا گر گیا شاہد؟ تم زمین پر بیٹھی کیا کر رہی ہو؟" اُن کی آنکھوں سے آنسو نکل کر دودھ جیسی سفید چادر میں جذب ہوگئے۔

"اللہ یہ تمہارے آغا بھائی کی تصویر کہاں گئی؟"

میں جواب دینے کی ہمت نہ پا رہی تھی۔ نسرین فوراً بول اُٹھی۔

"گرتا کیا بھابی عرفی نے گلاس پھینک دیا۔"

"مگر تصویر .... ؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"تصویر .... وہ .... وہ تو ساجد بھائی لے گئے۔"

"مگر شاہد زمین سے کیوں نہیں اُٹھتیں؟"

"میں! بھابی میں گلاس کے ٹکڑے چن رہی ہوں کہیں پیروں میں نہ چبھ جائیں۔" میری آواز بھرانے لگی۔ "مگر آپ لیٹ جائیے۔ بار بار اُٹھنے سے پسلیوں میں درد ہو جائیگا۔"

"درد! وہ تو کبھی کا ہو چکا۔ اب مزید کسی درد کی گنجائش نہیں۔ مگر یہ تصویر ساجد کیوں لے گئے۔"

بھابی نے بات ختم بھی نہ کی تھی جو دروازہ کھلا ساجد تیر کی طرح اندر داخل ہوئے۔ ساجد کا اُس وقت آنا مجھے قطعی اچھا نہ لگا۔

"ساجد تم تصویر لے گئے تھے۔ وہ لادو مجھے کمرہ سونا سونا لگ رہا ہے۔" ساجد نے چند سیکنڈ حیرت سے مجھے اور میری گود میں بھرے ہوئے کو دیکھا پھر سب کچھ سمجھ کر آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"لادوں گا بھابی۔ اُس کا فریم خراب ہو گیا تھا۔"

"اور ہاں ساجد بھیا جانی بھائی جان کی طرف جانا ہو تو پوچھ لیجیو آغا کا کوئی خط آیا۔"

"آغا کا خط جانی بھائی کے پاس!" ساجد پھر گھبرا گئے۔

"ہاں بھائی بھائی کہہ رہے تھے آغا انھیں خط بھیجتے ہیں۔"

"اُدھر جانا ہوا تو ضرور رکھ دونگا۔" وہ گھبرا کر باہر چلے گئے۔ تصویر کے ٹکڑے پھینکتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ یہ کیا کر دیا آغا بھائی نے

بی کی بے پناہ محبت بھی اُنھیں متاثر نہ کر سکی۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ جب خالہ جان کا اصرار تھا صنوبر کی شادی آغا سے ہوگی۔ صنوبر کے پیدا ہوتے

خالہ جان نے آغا کے لئے صنوبر کو مانگ لیا تھا یہ کسی کو بھی معلوم تھا بڑے ہو کر آغا ساری روایتوں سے بغاوت کر دیں گے۔ یہ تو جب کی بات تھی،

آغا بھی دودھ پیتے تھے بڑے ہوتے تو خیالات باغی ہو گئے۔

"نہیں امی میں اپنی پسند کی شادی کروں گا۔ ماموں جان کی وصیت کے لئے میں اپنے خیالات تو نہیں بدل سکتا۔"

"کیسے خیالات! خالہ جان مایوسی سے کہتیں۔

"یہی۔ بغیر ملے جلے شادی فضول سی بات ہے مجھے نہیں معلوم وہ کیا سوچتی ہے؟"

"اسے بلو لے۔ کیا ہماری شادی دیکھ بھال کے ہوئی تھی۔ اب دیکھ پہلے جو شادیاں ہوتی تھیں، کیا وہ کامیاب نہیں ہوتی تھیں۔ پھر میرے بچے

دان سے باہر ابتک ہمارے ہاں شادی نہیں ہوئی۔ گھر کی بیٹی گھر کو لگ جائے تو اچھا ہے۔"

مگر آغا پر خالہ جان کی ان دلیلوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ ہم سب نے بہتیرا سمجھایا۔ ہم جو شادی کو صرف جسمانی تعلق کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ اس لیے ہم سے

ی کوششیں ہو سکیں کیں۔ آغا نے خود کو چاروں طرف گھرا ہوا پایا۔ تو ہاں کر دی۔ شادی ہو گئی۔ بھابی بڑی مطمئن تھیں۔ انہوں نے آغا کو پا کر گویا سب کچھ پالیا

نا جو پیدائش سے لیکر ابتک اُن کے لیے دیوتا بنے رہے۔ خالہ جان اپنی جگہ خوش تھیں۔ گھر کی بیٹی گھر کو لگ گئی۔ چند دن بعد جب رومانی زندگی نے عملی

ندگی میں قدم رکھا تو بھابی مرجھا گئیں۔ کیا دکھ تھا۔ کیا روگ تھا کسی کو پتہ نہ چلا۔ ایک دن بھابی بیٹھی چھت کی کڑیوں کو بے مقصد گن رہی تھیں ۔

غا بھائی باہر سے آئے۔

"صنوبر کل میں جا رہا ہوں۔"

"کہاں!" بھابی چونک پڑیں۔

اُن کی گھبراہٹ دیکھی مسکرا کر کہنے لگے۔

"پریشان ہو گئیں۔ مجھے دفتر کی طرف سے بھیجا جا رہا ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم میں کب آؤں گا۔ ہاں میں لندن جا رہا ہوں۔"

سکوت چھا گیا۔ سب حیران تھے کیوں اچانک یوں چلے گئے۔ صنوبر کے بھائی جان نے بتایا۔ دفتر سے نہیں بھیجا گیا، دفتر میں ایک یورپین ملازم

تھی۔ اس سے عشق ہوا اور شاید وہ لے گئی۔ اللہ کیسا المناک انکشاف تھا۔ خالہ جان اس صدمے کو نہ سہہ سکیں اور چل بسیں۔

صنوبر جو ماں بننے والی تھیں۔ آنے والے کا انتظار کرتیں اور رو دیتیں۔ عرفی پیدا ہو گیا۔ میں سمجھتی تھی اب بھابی رونا دھونا چھوڑ دینگی عرفی

لو آغا سمجھ کر خود کو فراموش کر دیں گی۔ مگر نہیں وہ اب بھی رو رو کر پوچھتیں۔

"شاہد عرفی بڑا ہو کر کیا سمجھے گا میرا باپ کون تھا۔ دیکھو تو کتنے دن ہو گئے جانے وہ کیسے ہونگے!"

"عرفی بھی سب سمجھ جائیگا۔ وہ بھی اچھے ہی ہوں گے۔ مگر تم رو رو کر ہلکان کیوں ہوتی جاتی ہو۔ خالہ جان کے بعد تم ساجد کی ماں ہو دیکھتی

نہیں کیسا اُداس اُداس پھرا کرتا ہے اپنے بچے کی طرح تمہیں ساجد کا بھی خیال کرنا چاہیے۔" انہوں نے آنسو پونچھ ڈالے۔ نئے عزم سے کہنے لگیں۔

"تو ٹھیک کہتی ہے شاہد۔ کہیں ساجد کا مستقبل تباہ نہ ہو جائے وہ بھی میرا بچہ ہے میرے آغا کا بھائی۔"

اور اپنے سینے میں ہزاروں غم چھپائے وہ خود کو معروف رکھتیں۔ حالانکہ یہ اداسی یہ مایوسی انھیں اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہی تھی۔ میں سب کچھ سمجھتی بھابی کا سفید ہوتا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے نئے نئے اندیشے گھیر لیتے ۔ ساجد نے امتحان دیا، رات رات بھر ساجد کے ساتھ جاگتیں، جبتک ساجد گھر میں نہ آجاتا کھانا نہ کھاتیں۔ عرفی سے زیادہ ساجد کا خیال رکھتیں اور ساجد جب تک گھر میں رہتے بھابی کے پاس بیٹھے رہتے۔ کبھی لطیفے سنا سنا کر ہنسا رہے ہیں۔ تو کبھی بھابی کے حسن کی تعریف کر کے بھابی کی کھوئی جنس کی تسکین کی ناکام کوشش کرتے۔ وہ دونوں ایکدوسرے میں ضم ہو گئے تھے ۔میری تنہائیوں کے احساس ہر لمحہ بڑھ رہے تھے جو نسرین آن پہونچی ساجد کی پھوپی کی لڑکی بڑی ہی شریر بات بات پر قہقہے لگانے والی ہم سب خوش تھے چلو اب یہ اُداسیاں نہ رہیں گی۔ مگر ادھر نسرین آئی اُدھر بھابی بیمار پڑگئیں۔ اندر ہی اندر جو بیماری بھابی کو گھن کی طرح چاٹ رہی تھی وہ اپنا رنگ دکھانے لگی۔ مسلسل غموں کا بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے تھک گئی تھیں گر پڑیں۔ نسرین ساجد کے ساتھ تاش لیکر بیٹھ جاتی۔ دونوں ملکر قہقہے لگاتے تو بھابی بھی ہنس پڑتیں۔

"تاش کھیلو بھابی۔"

"نہیں نسرین میں نہیں کھیلتی تم دونوں کھیلو۔ آغا بھی مجھ سے کہتے تھے میں اُن کے ساتھ تاش کھیلوں مگر یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ان کھیلوں میں تو زندگی ہے بھابی لو ہم تمہیں پتے چھانٹ چھانٹ کر دیں یہ لو بیگم یہ رہا بادشاہ۔"

وہ جو ابھی ہنس رہی تھیں پھر اُداس ہوگئیں۔ "بادشاہ لیکر کیا کروں گی وہ تو کبھی کا چلا گیا۔ اب تو صرف بیگم رہ گئی ہے۔"

اس پر نسرین ہنستے ہنستے دوھری ہوگئی۔ میں اور ساجد آنکھوں میں آنسو نہ روک سکے۔

"نسرین ہم بھی تاش نہیں کھیلیں گے۔" ساجد نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں آنسو چھپائے باورچی خانے میں بھاگ گئی۔ نسرین اور ساجد بھی میرے پیچھے اُٹھ آئے۔ میں روٹی پکا رہی تھی ساجد بیٹھے غور سے کمرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جہاں برآمدے اور کمرے کے درمیان مسہری پر بھابی لیٹی تھیں۔ کھٹ سے دروازہ کھلا۔ عرفی اسکول سے آگیا۔ ساجد نے ہاتھ پھیلا دیئے۔

"بتاؤ بیٹا کیا پڑھا آج۔"

"چچا۔ اُستانی جی کہہ رہی تھیں۔ تم بیمار ہو۔ اپنے ابّا کو لانا۔ ان سے بات کریں گے۔ ابّا کہاں ہیں چچا۔"

چھن سے توے پر آنسو گرے۔ ساجد نے عرفی کو بے تحاشا چومنا شروع کر دیا۔

"ہم چلیں گے تمہاری اُستانی کے پاس۔ ابا! وہ تو بڑی دور گئے ہیں۔ وہ نہیں آسکتے جاؤ امی سے مل لو۔ مگر دیکھو عرفی امی سے سے کہنا نہیں اُستانی نے کیا کہا ہے۔"

ساجد پھر وہیں تکنے لگے۔ نسرین گھبرا گئی۔

"کیا دیکھ رہے ہو ساجد۔"

"بھابی کو دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا کبھی دیکھا نہیں۔"

"دیکھا کیوں نہیں مگر دیکھ رہا ہوں۔ یہ وہی ہیں جو اپنے حسن کی بدولت مشہور تھیں۔ آج مردہ ہو کر پلنگ کو لگ گئیں یہ کیا کر دیا آغا بھائی نے۔ موتی پھینک کر پتھر بھر لئے جھولی میں۔"

اب اُٹھتے بیٹھتے بھابی کا یہی سوال تھا۔

"ڈاک آگئی ؟"

بار بار ساجد ہلکے سے "نہیں" کہہ کر وہاں سے کھسک جاتے۔ حسب معمول نسرین بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ ساجد چپ چاپ بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔ بھابی غیر متوقع طور پر بول پڑیں

"ایک بات پوچھوں ساجد ؟"

"پوچھیے ؟"

"آجکل تم کیا کر رہے ہو۔ گھر کا خرچ کہاں سے چلتا ہے ؟"

"گھر کا خرچ !" ساجد چونک پڑے۔

"گھر کا خرچ چل ہی جاتا ہے ؟"

"تم پڑھتے نہیں ؟"

"نہیں بھابی پڑھنا چھوڑ دیا۔"

"پڑھنا چھوڑ دیا ! مجھ سے کہتے ؟"

"تم سے کیا کہتا بھابی۔ ایک ایک کرکے تمہارے سارے زیور بک گئے اب تم سے کیا کہتا۔ اب میں جوان ہو گیا ہوں۔ یہ میرا کام ہے ؟"

"تو جوان ہو گیا" بھابی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گئیں۔

ساجد پھر گہری سوچوں میں غرق ہو گئے۔ جو نسرین بولی۔

"میر کا یہ شعر کتنا اچھا ہے ساجد ؟"

"کونسا !" وہ بیزاری سے بولا۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں ٭ ساری مستی شراب کی سی ہے

"ہوں" ساجد نے کوئی جواب نہیں دیا، مگر بھابی بے قرار سی ہو گئیں۔

"کیا کہا نسرین۔ میر ان نیم باز آنکھوں میں ٭ ساری مستی شراب کی سی ہے۔ آغا کو یہ شعر کتنا پسند تھا۔ ایک رات شاید شادی کی پہلی رات ؟"

"بیچ میں نہ بولا کرو بھابی" ساجد بیساختہ چیخ پڑے۔

پہلی بار بھابی سے ساجد کا یہ انداز تکلم میں کانپ گئی۔

"کتنا دلچسپ موڈ تھا تم بیچ میں بول پڑیں کبھی تو ہنسنے دیا کرو ؟"

"بُرا مان گیا پگلا۔ میں تو یونہی کہہ رہی تھی" بھابی نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں ابھی رو دو ابھی تو آنسو بہانے کی کسر رہ گئی ہے ؟"

"میرے رونے سے ڈرتا ہے۔ اچھا اب نہیں رو دو نگی۔ میں تیری ماں ہوں ساجد میری باتوں کا بُرا مانتا ہے ؟"

"میرا کوئی نہیں ہے"

ساجد آج لڑنے پر آمادہ تھے۔ برسوں سے بھرا ہوا لاوا پھٹ پڑا تھا۔

"تیرا کوئی کیوں نہیں ہے۔ اور میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !" بھابی نے کھسیانی ہنسی ہنسکر پوچھا۔

"نہیں جہاں ماں چلی گئیں جہاں باپ چلے گئے تم بھی وہیں جانے کا انتظار کر رہی ہو۔ میں بھی مر جاؤں تم بھی"

"ساجد!" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اُن کے منہ پر ہاتھ رکھدیا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو شرم نہیں آتی" وہ میرا ہاتھ جھٹک کر باہر چلے گئے۔

"ساجد گیا؟" بھابی نے نیم مردہ آواز میں پوچھا۔

"ہاں!"

"باؤلا مجھ سے ناراض ہوگیا۔ اب کیسے منے گا" آنسوؤں کی مسلسل دھار بھابی کی ویران آنکھوں سے بہہ رہی تھی۔ یہ ساجد نے کیا کیا آخر تو آغا کا بھائی ہے۔ میں غموں سے پھٹتے ہوتے سینے کو دبائے بھابی کے برف کی طرح ٹھنڈے پیروں کو دبا رہی تھی جو دروازہ کھلا۔ ساجد پھر اندر آگئے۔

"بھابی! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھابی!" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیقرار ہوکر اپنا سر بھابی کے سینہ پر رکھدیا۔

"مجھ سے روٹھو نہیں بھابی مجھ سے غلطی ہوگئی"

"ارے نہیں پگلے۔ معافی مانگنے کی کیا بات ہے روٹھا بھی تو اپنے ہی سے جاتا ہے ناز نخرے کرنے کیا تو باہر جائے گا" وہ دونوں مل کر مسکرا پڑے۔ جانی بھائی بڑے گھبرائے ہوئے آتے۔

"شاہد! ۔ ۔ ۔ آج ذرا گھر کی صفائی تو کر لینا"

"کیوں!"

"آج آغا آرہے ہیں مگر صنوبر کو پتہ نہ چلے"

میرا دل خوشی سے بند ہونے لگا۔

"کب آرہے ہیں کیوں آرہے ہیں؟"

"کیوں کیا اُن کا گھر ہے"

میں مردہ دلی سے گھر کی صفائی میں لگ گئی۔ مگر بھابی کی نگاہوں نے بھانپ لیا۔

"کیوں شاہد آج کون آرہا ہے"

جی چاہا فوراً کہدوں وہ جن کا تم برسوں سے انتظار کر رہی ہو۔ ساجد نے میرے کان میں کہدیا ہم ایئرپورٹ جا رہے ہیں اب دیکھو کیا صورت رہتی ہے۔

"کاش تنہا آئیں!"

"بھابی بھی آج صبح سے بڑی بیقرار تھیں۔

"دعا کرو شاہد۔ وہ آجائیں میرے لئے نہیں اپنے عرفی کے لئے۔"

میری آنکھوں سے بے تحاشا آنسو اُمنڈ رہے تھے۔

"دعا کرو تم بھی بھابی۔" جی چاہا کہہ دوں تم دعا کرو۔ آج وہ آئیں تمہارے لیے محبت کے خزانے لیکر آئیں مگر کہہ نہ سکی۔

ہارن کی آواز آئی وہ اکیلے نہیں تھے۔ میرے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ انتظار کا یہ نتیجہ!

"جانی بھیا اب کیا ہوگا۔"

"ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ کچھ دن کے لئے آیا ہے پھر اس نے تار دیکر ہمیں مطلع کر دیا تھا۔ اب جو بھی ہو۔ آؤ میں منوبر کو بتا دوں۔"

جاؤ میں تم سے نہیں بولتی۔ بھابی نے اپنے بھائی کو دیکھتے ہی ناز سے منہ پھیر لیا۔"

کیوں نہیں بولتی۔"

"دو تین دن سے کہاں تھے۔ بہن بیمار ہے خبر بھی نہیں لیتے۔"

"ہاں منوبر۔ مگر تو میری بڑی بہادر بہن ہے۔ ایک بات . . . . . ایک بات . . . . ." الفاظ اُن کے حلق میں اٹکنے لگے۔

"صنوبر گھبرا گئیں۔ "کیا ہوا بھیا!"

"آغا آئے ہیں!"۔

"آغا آئے ہیں! . . . . . . کہاں ہیں وہ۔"

"مگر سنو تو!" . . . . . . جانی نے خود پہ قابو پاکر کہا۔

"نہیں نہیں مجھے اُن کے پاس لے چلو۔" بھابی میں نہ جانے کہاں سے بلا کی طاقت آگئی تھی۔ وہ بے تحاشا صحن کی طرف دوڑیں۔ جہاں وہ عرفی کو گود میں لیے کھڑے تھے۔ ان کے پاس ان کی نوجوان بیوی یا محبوبہ بیٹھی ہوئی۔ غور سے مضمحل ساجد کو تک رہی تھی۔ بھابی نے ان کو اور اُن کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا۔ جس تیزی سے آئی تھیں اسی تیزی سے دھم سے پلنگ پر گر گئیں۔

"تم آغا! . . . . تم . . . . . . اور یہ"

آغا کوئی جواب نہ دینے پائے تھے جو عرفی بول پڑا۔

"امی یہ کہہ رہے ہیں یہ ہماری نئی امی ہیں"

"نئی امی! . . . . . . نہیں عرفی تمہاری امی میں ہوں یہاں آجاؤ۔ میری گود میں . . . . . عرفی . . . . . تم بھی ہمیں بھولنے لگے۔"

ہم سب آبدیدہ تھے آغا ساکت بیٹھے تھے۔

"اتنی دوڑ کر آئی تھیں اب وہ ساری قوت کہاں گئی ؟۔"

"تمہیں دیکھ کر سب قوت ختم ہو گئی آغا۔"

"تم سے دیکھا نہیں جائیگا چلو اندر چلو بھابی!" . . . . ساجد نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں تمہارا ہوں عرفی تمہارا ہے۔"

"اوہ! تو یہ ہنگامے ہیں۔"

سب چونک کر آغا کو دیکھنے لگے۔ جانی اور ساجد غصے سے کانپنے لگے۔ بھابی کے ہونٹ لرزے مگر کچھ کہہ نہ سکیں۔

"ہاں تم تو لاڈلے ہو میری کیا [illegible] ہے۔"

"یہ تو ...... یہ تو میری ماں ہیں۔"

"ارے گھبرا کیوں رہے ہو۔ صاف کہتے ہوئے کچھ ڈر لگتا ہے۔"

"مگر میری باتوں پر تو کہتی تھی۔ میں کلب میں ناچ نہیں سکتی آغا یہ بہت بُرا ہے۔ مگر خیر۔"

"بھیا!" ...... ساجد چیخ پڑے۔ مگر آنسوؤں نے اُن کی آواز روک دی۔ بھابی کمرہ بند کیے پڑی رہیں۔ ساجد پھر بھائی تھے۔ اپنے تمام تر غصے کو پی کر انہوں نے پوچھا۔

"بھابی میں کیا بُرائی ہے بھیا!"

"بُرائی! کوئی نہیں۔ مگر شادی تو اماں نے کی تھی۔ وہ انھیں چھوڑ کر کیوں مر گئیں۔ تم بھی لندن چلے آؤ، وہاں قدم قدم پر زندگی ہے مجھے دیکھو کیسے مزے سے گزرتی ہے۔"

"میں پوچھ رہا تھا بھابی میں کیا برائی ہے؟"

"ساجد ایک عورت سے آخر اسقدر پیار کیوں۔ جب قدم قدم پر محبتیں مل سکتی ہیں، ایک جسم سے کیسے لپٹے رہیں جبکہ ہر بار نیا جسم ذرا سے اشارے پر مل سکتا ہے۔"

"لیکن جو تم سے پیار کرے۔"

"ہاں وہ مجھ سے پیار کرتی ہے۔ مگر میرے خیالات ...... میں انھیں کبھی نہیں بدل سکتا۔ وہ قدروں کے پیچھے مٹ رہی ہے۔ اور میں۔ ... نہیں نہیں سب فضول ہے۔"

"وہ آپ سے کتنی محبت کرتی ہے بھیا!۔"

"ٹھیک ہے ساجد مگر زندگی میں تنوع کی ضرورت ہے جو یہاں عنقا ہے۔ تم بھی وہیں چلے آؤ۔"

"مگر میں وہاں نہیں آسکتا۔" ساجد منہ لٹکائے اُن کے پاس سے چلے آئے۔ جب لائے ہوئے تحفے دے رہے تھے تو سب اُن کا منہ تک رہے تھے۔ شاید بھابی کے لیے کچھ دیں۔ جب سب بانٹ چکے تو ساجد نے پھر کہا۔

"اور بھابی کے لیے!" ....

"تم جو موجود ہو۔"

"میں؟"

"ہاں تم۔ شرماؤ نہیں۔ نکاح کے دو بولوں سے کیا ہوتا ہے یہ سب پرانی باتیں ہیں۔"

"بھیا تم مریم پر الزام لگا رہے ہو۔ وہ مریم ہے مقدس مریم!"

"وہ مریم ہے اور تم!" ......

ساجد نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بھابی کے کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

[illegible] دیکھا۔ چند لمحے یہ قدم رکے پھر ساتھ ہی ہوئی ہوئی
کی کمر میں باہیں حمائل کر کے باہر نکل گئے۔ میں اور ساجد آنگن میں کھڑے ہوئے سوچ رہے تھے اب جاکر ان سے کیا کہیں۔ جو ان کے کمرے سے کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی
ہم فوراً دوڑے۔

"یہ کیا کر رہی ہو بھابی؟" ساجد نے گھبرا کر بھابی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"یہ تصویریں کیوں توڑ دیں۔ یہ بیاہ رات کا جوڑا! اسے جلا رہی ہو۔ تم نے تو ساری یادگاریں مٹا دیں اب کیسے جیو گی۔"

"ان یادگاروں کو مٹنے دو۔" ان کے چہرے پر عجیب سی چھائی ہوئی تھی۔ آنسو بھری مسکراہٹ سے ساجد کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ "تم لوگ رو رہے ہو۔ میں مر رہی نہیں۔ وہ میری بے تحاشا محبت سے گھبرا گئے تھے۔"

ہم جو بھابی سے اُداس چہرے چھپائے پھرتے تھے آج پھوٹ پھوٹ کر رُو پڑے۔

"تم رونے لگے۔ اچھا ہوا انتظار ختم ہو گیا اب مجھے تیرے لیے، عرفی کے لیے جینا ہے۔ جو میرا آغا ہے۔ وہ میری روح کے اندر ہے۔ ماضی کی ان یادگاروں کو پھینک دو ساجد۔ میں اب آغا کی صنوبر نہیں ہوں۔ میں اب عرفی اور ساجد کی ماں ہوں۔ ماں جسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو ممتا کی تڑپ کے لیے جیتے جاتی ہے۔"

"ماں!" . . . . . . ساجد نے اُن کی گود میں سر رکھ دیا۔

"میری مقدس بھابی! . . . . میری ماں!" اور وہ دونوں بے تحاشا ہنس پڑے۔

(بقیہ صفحہ ۲۴)

دی ہوئی ایک کڑوی بدذائقہ دوا پینے میں بچوں کا سا پس و پیش کر رہی ہے اور جب میکسی میلین کے کہنے پر وہ یہ دوا پی لیتی ہے تو اس کے بعد مسکراتے ہوئے کہتی ہے:

"تو پھر تم مجھے اس کے عوض لورانس کا قصہ سناؤ گے نا؟"

اور اس کے بعد میکسی میلین مادموازیل لورانس کا قصہ شروع کرتا ہے۔ یہ قصہ بہت طویل ہے اور میکسی میلین حسب معمول اصل قصے سے انحراف کر کے کہیں تو فرانس کے ۱۸۳۰ء والے انقلاب کا ذکر کرنے لگتا ہے کہیں فرانسیسی لوگوں کے اوضاع و اطوار کی ستائش کرتا ہے کہیں پیرس کے "سالونوں" کا ذکر کرتا ہے کہیں وہاں کے رنگین عصرانوں کا نقشہ کھینچتا ہے ایک جگہ . . . موسیقار لی تست کا بھی ذکر ہے جو پیانو بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس قسم کے انحراف کے بعد وہ اصل قصے کی طرف دوبارہ نہایت خوش اسلوبی سے لوٹتا ہے۔ اس دوران میں مادموازیل لورانس کا قصہ اتنا دلچسپ اور جاذبِ توجہ ہو چکا ہے کہ ماریا کو اپنی محویت کے عالم میں کسی اور قصے کی طرف اشارہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی اور نہ میکسی میلین ہی کسی نئے قصے کا اشارہ کرتا ہے یا اسے سنانے کا وعدہ کرتا ہے اور قصے کے اختتام پر یوں پہنچتا ہے۔

"اُس کا (مادموازیل لورانس کا) شوہر بوڑھا بوناپارٹ پسند، اس زمانے میں پیرس کے نواح میں فوج کی کمان کر رہا تھا اور اُس کے فوجی فرائض اُسے صرف دن کے وقت ہی پیرس میں رہنے کی اجازت دیتے تھے۔ وہ میرا بہت گہرا دوست بن گیا تھا اور جب بعد میں اُس نے مجھے الوداع کہی تو خوب رو دیا۔ وہ اپنی بیوی کے ہمراہ جزیرۂ صقلیہ کی سیر و سیاحت کو جا رہا تھا اور اس کے بعد میں نے اُن دونوں میں سے کسی کو دوبارہ نہیں دیکھا۔"

میکسی میلین نے یہ قصہ ختم کرتے ہی جلدی سے اپنی ٹوپی اٹھائی اور چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"فلورنس کی راتیں" کا اس سے بہتر افسانوی اختتام اور کیا ہو سکتا ہے؟

عائشہ ممتاز

... مگر ملکۂ مصر نہیں

وہ حسین بھی تھی اور نوجوان بھی۔ اس کی آنکھیں سیاہ تھیں اور چہرہ کتابی۔ اس کا رنگ صندل کی طرح چمکدار تھا، اور اس کی اداؤں میں نزاکت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جب وہ کسی سے بات کرتی تو یہ سچ ساری کائنات اس کے قدموں پر جھک جاتی۔ جنوبی امریکہ کی اس چھوٹی سی پرسکون بستی میں کتنے ایسے نوجوان تھے جن کے دل کی دھڑکنیں بوڑھے رابرٹ کی اِس حسین اور چنچل لڑکی کے قدموں کی چاپ سے تیز ہو جایا کرتی تھیں۔ لیکن وہ دوشیزہ ہمیشہ ان سے کھنچی کھنچی سی رہی۔ جانے کیوں اپنی بستی کے نوجوانوں میں سے کسی ایک کے لیے بھی اس کے دل میں محبت کا ایک خفیف سا احساس بھی پیدا نہ ہو سکا۔ اس کی پیدائش ایسے ماحول میں ہوئی جہاں غربت اور افلاس کے سائے ہر وقت منڈلایا کرتے۔ بوڑھے رابرٹ کی بساطی کی ایک مختصر سی دوکان ہی اس خاندان کی کل کائنات تھی۔ دوکان کی آمدنی سے بمشکل گھر کا خرچ پورا ہوتا تھا۔ صبح سے شام تک اس کا بیشتر وقت دوکان میں بیٹھ کر ایک ایک پیسے کے لیے گاہکوں سے تکرار میں گزرتا۔

وہ اپنی تین ماؤں اور کتنے ہی بہن بھائیوں کے ساتھ شب کا کھانا کھانے کے بعد اپنے بستر پر جا کر لیٹتی تو اس کے گرد و پیش اُمیدوں اور آرزوؤں کے لاتعداد چراغ روشن ہو جاتے۔

شاید یہ لانبی اور تاریک راتیں بیت جائیں۔

اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ خواہش شدت سے بیدار ہو جاتی۔

کاش کوئی شہزادہ مجھے اغوا کر لے۔

شاید شعوری طور پر اغوا کی شدید خواہش ہی اس کے مستقبل کی جرائم پیشہ زندگی کی پیش رو تھی جس نے اُس حسین دوشیزہ کو عورت سے کسبی اور کسبی سے قاتل بنا دیا۔

اس کی جرائم پیشہ زندگی کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے۔

بستی سے کچھ فاصلے پر سنگلاخ پہاڑیوں اور وادیوں کے درمیان شام ڈھلنے سے ذرا پہلے ان لوگوں نے اپنے خیمے نصب کر دیئے تھے۔ تین آدمیوں کا یہ گروہ قیمتی معدنیات کی تلاش میں جنوبی امریکہ کے اس دور دراز علاقے میں پچھلے دو ماہ سے سرگرداں تھا دوسرے دن صبح پورے گاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ بستی کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا ہے، لیکن گاؤں کے بوڑھے لوگوں نے صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے مناسب سمجھا کہ

ان لوگوں سے بات چیت کرنی چاہئے۔ اور پھر ایسا ہی کیا گیا۔

دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ یہ نیویارک کے سیاح ہیں۔

لیکن اصل حقیقت یہ نہ تھی۔

سیاحوں کا یہ گروہ دراصل نیویارک کے اس سرمایہ دار ڈاکوؤں اور قاتلوں کا گروہ تھا جس نے گذشتہ چالیس برس میں کتنی ہی دولتمند نوجوان اور بوڑھی بیواؤں کو اُن کی دولت کے لیے موت کی گمنام وادیوں میں پہونچا دیا تھا۔ ان کی دولت سمیٹنے کے بعد ہر بار یہ گروہ اپنی شاطرانہ چالوں کے باعث قانون کی گرفت سے بچا رہا۔

نتیجہ کیا ہوا ؟

عصمتیں لٹتی رہیں اور حادثوں کی تعداد بڑھتی رہی۔

قانون کے محافظوں کو جیسے نیند آگئی ہو۔

پانی کی تلاش میں دوپہر کی تپتی ہوئی دھوپ میں مسافر بستی کی طرف آنکلے، چھوٹی سی دوکان کے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے چیونگم کے جار پر نظر پڑتے ہی اُن میں سے ایک نوجوان دوکان کی طرف بڑھا، یہ خوبصورت نوجوان ڈاکوؤں کے اس گروہ کا قائد ڈیوڈ مالیسن تھا، جس کا دل جیتنے کے لئے نیویارک کے شبانہ کلبوں میں رقص کرنے والی بیسیوں رقاصاؤں نے کالج اور یونیورسٹی کے نوجوان طالب علموں اور تجارت پیشہ لوگوں کی محبتوں کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا تھا لیکن ان قربانیوں کے باوجود ڈیوڈ کے دل پر حکمرانی کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے۔ کلبوں کی حسین و نازک رقاصاؤں کے مقابلے میں اس کا دل آیا بھی تو کس پر .... دیہات کے ایک تنک مزاج بوڑھے بساطی کی اَن پڑھ لیکن الھڑ اور خوبصورت لڑکی پر، وہ چیونگم لے کر دوکان سے باہر آگیا لیکن اس کی آنکھیں متواتر اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے دل میں کسک سی محسوس کی۔ اُسنے بوڑھے بساتی کی لڑکی میں جین سے پہلی ملاقات کے بعد شدید ذہنی اور قلبی تاثرات کا انکشاف ڈائری کے چند اوراق میں ان لفظوں میں کیا ہے۔

> زندگی بعض ایسے لمحات چھوڑ جاتی ہے جب رات کے بیکراں سناٹے اور کائنات کی پُراسرار خاموشی میں دو اجنبی ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور یہ سرگوشیاں بڑھتے بڑھتے دائرے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جس سے نکلنا عملی زندگی میں ناممکن نہ سہی تو بلاشبہ دشوار ضرور ہے۔ ریگزاروں میں بھی قدرت کے بنائے ہوئے اتنے حسین شاہکار پیدا ہوسکتے ہیں۔ اس بارے میں میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

زندگی میں پہلی بار خوبصورت جین کے خیالوں میں کشمکش پیدا ہوئی جس نے اُسے کئی دن تک بے چین اور مضطرب رکھا۔ وہ دن میں کئی بار جین سے اس کی دوکان پر آکے ملا کرتا۔ ہر روز اس کے ساتھی آگے بڑھنے پر اصرار کرتے لیکن وہ اگلے دن پر ٹال دیا کرتا۔

ملاقاتیں بڑھتی رہیں اور فاصلے دور ہوتے گئے۔

آخر کار بیس پچیس روز کے پڑاؤ کے بعد اجنبی مسافروں کا یہ گروہ شام کے دھندلکوں میں آگے بڑھ گیا۔ جین نے کئی دن کی ذہنی کشمکش کے بعد یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ساری بندشوں کو توڑ کر بہرحال مجھے ان مسافروں کے ساتھ اغوا ہونا ہے۔ گروہ کی روانگی کے وقت ایسا ہی ہوا جب رات بھیگ گئی اور وہ دوکان سے گھر واپس نہ پہونچی تو سارا گھر گہری فکر میں ڈوب گیا۔ صبح ہوتے ہی سنگلاخ پہاڑیوں اور

دردوں میں اس کی تلاش کی گئی، اسوقت تک وہ قافلہ اسّی میل سے بھی آگے نکل چکا تھا۔

یہ اس کی زندگی کا پہلا سفر تھا۔

اسے خود بھی خبر نہیں تھی کہ اُس کی منزل کہاں ہے۔

رواں دواں قافلہ آگے بڑھتا رہا۔ ہر آنے والی منزل کے ساتھ ہی گذری ہوئی منزل کے نقوش خود بخود مٹ جاتے۔ چوتھے روز یہ لوگ امریکہ کے خوبصورت ترین شہر نیویارک پہونچ گئے نیویارک پہونچنے کے بعد ڈیوڈ مارلیسن اور جین کے علاوہ سارے ساتھی ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ ڈیوڈ کی اپنی ذاتی قیام گاہ شہر کے خوبصورت علاقہ میں تھی لیکن وقت کی مصلحتوں کے پیش نظر اُسنے مناسب یہی سمجھا کہ اپنی نئی نویلی دلہن کو فی الحال ہوٹل ہی میں رکھے۔ امپیریل اسٹیٹ ہوٹل کی سر بفلک عمارت میں نئے شادی شدہ جوڑے کو ٹھہرے ہوئے ساتواں روز تھا۔ دوپہر کے کھانے پر جب اس کا شوہر اپنی گاڑی پر ہوٹل واپس پہونچا تو خلاف معمول اس کے ساتھ تین دوست بھی تھے۔ ان تینوں کو دیکھ کر جین ایک لمحہ کے لیے جھجکی لاشعوری طور پر کسی خوف کے احساس سے اس کا چہرہ بجھ کے رہ گیا۔ کھانے کے دوران اس کے دوستوں نے کہا۔

"تمہیں اسقدر حسین بیوی کو نہیں لانا چاہیے تھا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ اس شہر میں کتنے ہی ایسے دیوتا ہیں جو عورتوں کو اُٹھا کر لے جایا کرتے ہیں خصوصًا حسین وجمیل عورتوں کو تو کسی طرح نہیں چھوڑتے، لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ اپنی رفیقۂ حیات کی نگرانی ونگہداشت بڑی احتیاط سے کرو۔"

اس واقعے کے دوسرے دن دوپہر کو جین نے کھانے کے بعد اپنے شوہر سے کہا "کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم کسی دوسرے شہر میں چلکر اپنا گھر بسائیں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔" ڈیوڈ نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔ "لاکھوں ڈالر کا میرا کاروبار پھیلا ہوا ہے اسے چھوڑ کر میں یہاں سے کیسے جاسکتا ہوں۔ جین کی طرف سے ان خدشات کے اظہار نے اسے فوری طور پر احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اسی وقت اس نے طے کر لیا کہ جذبۂ عشق کو بالائے طاق رکھ کر مجھے جین کو اس آخری آرامگاہ میں فورًا پہونچا دینا چاہیئے جہاں اس جیسی ایک سو اٹھارہ دیہاتی دوشیزائیں دن بھر کے تھکے ہارے دولتمندوں کی جنسی تسکین کے لیے دوپہر ہی سے اپنے عشرت کدوں میں بچھے ہوئے نرم وگداز بستروں کو سینٹ کی خوشبوؤں سے بسانا شروع کر دیتی ہیں۔ جین سے متعلق یہ فیصلہ کر لینے کے بعد اُسنے کپڑے تبدیل کئے اور تیار ہو جانے کے لئے کہا۔

گاڑی اپنی پوری رفتار کے ساتھ جا رہی تھی۔ ایک گھنٹے تک وہ مسلسل چلتے رہے۔ بانسوں کے جنگل کی دوسری طرف عورتوں کی بات چیت کی دلکش آواز سنائی دی اسی کے ساتھ پر مسرت اور سحر انگیز قہقہے بھی رہ رہ کر بلند ہو رہے تھے۔ حد نظر تک شاداب اور گھنے درخت قطار در قطار ایستادہ تھے اور ان کے درمیان نایاب پھولوں کے پودے جھوم رہے تھے۔ یہ جگہ الوہی رقص ونغمہ کی جنت معلوم ہو رہی تھی۔ جین اور ڈیوڈ گاڑی سے اُتر کر ایک وسیع اور کشادہ عمارت میں داخل ہوئے۔ تین سال قبل یہ عمارت سینی ٹوریم کے لیے استعمال کیجاتی تھی لیکن اب یہی عمارت خوبصورت جسموں کے کاروبار کے لیے وقف ہے اسے مقامی سرمایہ داروں کی ایک جرائم پیشہ جماعت نے نیلام میں خریدا تھا۔ درجنوں عورتیں نیم عریاں لباسوں میں ملبوس آپس میں ایکدوسرے سے ہنسی مذاق میں مصروف تھیں۔ ڈیوڈ اور جین کو دیکھتے ہی ان کی ہنسی پھیکی پڑ گئی۔ ریشم کے ایک دیو قامت دروازے سے گزر کر ڈیوڈ نے تین بڑے کمرے اندر سے جھانک کر دیکھے۔ ایک کمرے میں ریشم کے گدے تکیئے دیوار سے لگے ہوئے رکھے تھے۔ سنگھار اور آرائش کی ساری چیزیں سلیقہ سے رکھی ہوئی تھیں دیواروں پر نیم عریاں تصاویر لٹک رہی تھیں۔ جین یہ چیزیں دیکھ کر کچھ بھی نہ سمجھ سکی اُس نے پوچھا یہ سب کیا ہے؟ ڈیوڈ نے سرگوشی کے سے انداز میں اس سے کہا۔ "تمہیں اب یہیں رہنا ہوگا۔" یہ کہتے ہی وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

ہر روز اس کے جسم کی نمائش ہوتی اور کئی ہزار ڈالر کے عوض ایک شب کے لیے اس کا جسم خرید لیتے۔ وہ اپنی موجودہ زندگی سے چند ہی [illegible] اکتا گئی

دونوں میں جیسے مطمئن سی ہوگئی۔ پورے تین مہینے بعد ڈیوڈ کو عصمت فروشی کے اس خفیہ اڈے کے خیال کے ساتھ ہی جین کی یاد نے بُری طرح ستایا۔ شام کو جسوقت وہ یہاں پہونچا، جین بنی سنوری اپنے کمرے کی چوکھٹ پر کھڑی آج کی شب کے گاہک کا انتظار کر رہی تھی۔ اُسنے بیحد گرمجوشی سے ڈیوڈ کا استقبال کیا۔ جین کے اس طرز عمل نے اسے حیرت میں ڈال دیا۔ آج کی شب ایک ساتھ بسر کرنے کے لیے کھانے سے فارغ ہوتے ہی کمرے میں بند ہوگئے ڈیوڈ اپنے تئیں محتاط ہونے کے باوجود مطمئن بھی تھا۔ جین نے تند و تیز شراب کے جام پر جام بھرنا شروع کر دیئے۔ نصف شب گزرنے کے بعد اپنی جگہ سے ہلنے کی بھی اس میں سکت باقی نہ رہی تھی۔ جین نے ایک تیز چاقو سے اس کی گردن کاٹ کر الگ ڈال دی اور خود رات کی خاموشی میں فرار ہوگئی، آہنی پھاٹک میں قفل اہنک لگا ہوا تھا اور ہر شخص حیرت میں تھا کہ وہ کیونکر باہر نکل گئی۔

شام کے وقت نکلنے والے اخباروں میں ڈیوڈ مارسین کے پُراسرار قتل کی سرخیاں لگی ہوئی تھیں۔ نیویارک کے بینک اسکوائر میں ملازمین اپنے بازوؤں پر سیاہ ماتمی پٹیاں باندھے پھر رہے تھے اس وقت جین شکاگو پہونچ چکی تھی۔ نیویارک سے فرار ہونے کے بعد کئی ماہ تک وہ شکاگو میں مقیم رہی، اس عرصہ میں اس نے خود کو نہ صرف ڈیوڈ کے گروہ کے دوسرے افراد کی نظروں سے بچائے رکھا بلکہ دوسری شادی بھی کرلی۔ اس کا شوہر ایک مقامی ہوٹل میں کاؤنٹر کلرک تھا۔ کامیابی اور ناکامی کی سخت آزمائشوں سے بچنے کے لئے زندگی کو ایک ایسی نہج پر ڈال لینا جہاں گھٹن کے سوا اور کچھ نہ ہو اس کے لیے دشوار ترین مرحلہ تھا۔ ذہنی طور پر اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن ضرور تھی لیکن رات کی نیند اور دن کا چین نہ لوٹ سکا۔ ایک طرف اس کا اولین محبوب تھا اور دوسری طرف اس کی اپنی محبت جو اسے محبوب سے بھی زیادہ عزیز تھی۔

اس کا موجودہ شوہر معصوم بچوں کی طرح والہانہ انداز میں اس سے محبت کرتا تھا اس کی آنکھیں جن سے پیار اور خلوص ٹپکتا ہر وقت اس کے تعاقب میں لگی رہتیں، شادی کو پورا ایک سال بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ زندگی کو پہلے سے بھی زیادہ سنگین صورتحال سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ ایک روز اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں اس کے پرانے خطوط میز کی دراز سے نکال کر دیکھنے لگی ان خطوط میں وہ اپنی ماں کا خط دیکھ کر گہری سوچ میں ڈوب گئی، یہ خط کئی برس پہلے اس کے شوہر کے نام بھیجا گیا تھا یکے بعد دیگرے کئی خط ٹٹولنے پر اسے ایک گروپ فوٹوگراف ملا جس میں خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ اس کا وہ بھائی بھی بیٹھا ہوا تھا جسے آج سے پندرہ سال قبل باپ نے سزا کے طور پر گھر سے نکال دیا تھا اسوقت اس کی عمر صرف سات برس کی تھی اب یہ یقین کرنے میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی کہ دوسرا شوہر اس کا اپنا سگا بھائی ہے جس کے ساتھ ازدواجی زندگی کے تقریباً دس ماہ بسر کئے جا چکے ہیں۔ اس اذیت ناک حقیقت کے انکشافات کے ساتھ ہی اس کے جسم میں قاتل کی روح ایک بار پھر جاگ اٹھی۔

اور اس نے کلوپطرا ملکۂ مصر کی طرح اپنے شوہر — اپنے حقیقی بھائی کو زہر کا پیالہ پلا دیا اور شکاگو چھوڑ کر ٹوکیو چلی گئی۔ طیارے نے آہستہ آہستہ ٹوکیو شہر کا فضائی چکر کاٹا، جہاز کے ہوائی اڈے پر اترتے ہی ٹوکیو میٹروپولیٹن پولیس کا انسپکٹر ہتھکڑی لیے ہوئے جہاز کی کھڑکی کھلنے سے پہلے اندر داخل ہوچکا تھا آنکھ جھپکتے ہی واضح اور روشن راستوں کی جگہ نیم واضح اور نیم روشن دھندلکوں نے لے لی جہاں ریشمی سائے، زخمی دریچے اور پُراسرار اجنبی، قدم قدم پر راستہ کاٹتے ہیں۔

بقیہ صـ۱۹

سیاست کے مدعی اور قیادت کے دعویدار ہیں۔ دورۂ سندھ کی دعوت دی ہے تاکہ آنے والے ہنگامہ انتخاب میں عامل صاحب اپنے موکلوں اور ہمزادوں کے ذریعے ان سجادہ نشین کے نامزد کردہ امیدواروں کو کامیاب بنائیں بہ تحقیق معلوم ہوا ہے کہ صاحب خانقاہ نے منت مانی ہے کہ اگر ٹڈے میاں کی مدد سے وہ آنے والے انتخابات میں کامیاب ہوگئے تو گونڈا کرائیں گے اور عمر بھر حضرت کی عقیدت کے راگ گائیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب!

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

تہذیب و تحریر مجتبیٰ حسین

مکتبہ افکار رابسن روڈ کراچی

مجتبیٰ حسین صاحب کی تصنیف تہذیب و تحریر کا نام پڑھتے ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب میں ارتقائے تہذیب اور تحریر و کتابت کے باہمی رشتے کو واضح کیا گیا ہوگا لیکن یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے ہمارے مصنفین میں کتابوں کے نام اور مضامین کے عنوان قائم کرنے کا ابھی تک سلیقہ پیدا نہیں ہوا۔ آجکل عام طور پر صوتی مناسبت کو ملحوظ رکھ کر کوئی ایک نام یا عنوان تجویز کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً رنگ و آہنگ۔ حرف و حکایت سنبل و سلاسل، شعلہ و شبنم اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے ذہنی محرکات کتنے حقیر اور کم مایہ ہیں۔ اپنے اسلوب سے خود مصنف کا لطف اندوز ہونا تخلیقی عمل میں ایک خاص کردار ادا کرتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ خود مصنف کی لذت کشی اور لطف اندوزی کا معیار کیا ہے کہ یہ معیار ہی مستقبل میں اس کے اسلوب کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے اگر معیار یہ ہے کہ لکھنے والا شیشے کے ساتھ تیشہ استعمال کر کے خوشی میں جھوم اٹھے تو ظاہر ہے کہ یہ بڑی پیچ اندیشی ہے بہرحال تہذیب و تحریر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں پندرہ مضامین شامل ہیں۔

اس مجموعہ میں اہم ترین پہلے حصہ کے تین مضامین ہیں۔ "ادب اور اعتبار" میں مجتبیٰ صاحب نے ادب، ادیب اور قاری کے مثلث پر عجیب انداز میں بحث کی ہے۔ ادیب اور قاری کے باہمی رشتے اور ادب کے سلسلے میں ادیب کی ذمہ داریوں پر اعتبار کو ایک بنیادی تصور قرار دے کر غور کیا ہے۔ اور اس بحث سے انہوں نے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ادبی شخصیتوں کا سوال ادب میں اولیں اہمیت رکھتا ہے۔ یہ شخصیتیں ایک دو دن میں یا ایک دو چیزیں لکھ کر تعمیر نہیں ہوتیں۔ مجتبیٰ صاحب کو نئی نسل سے یہی شکایت ہے کہ اس میں ادبی شخصیتیں نہیں پیدا ہو رہی ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کا مطلب یہ ہے کہ نئی نسل کے ادیبوں کے پاس وہ انفرادی رنگ نہیں ہے۔ جو ان کو اپنے دوسرے ہمعصروں سے ممیز کر سکے۔ آج کے قاری سے انہیں یہ شکایت ہے کہ وہ بہت جلد نوعمر اور ناپختہ کار ادیبوں پر اعتبار کر بیٹھتا ہے جبکہ ان میں سے زیادہ تر بے حد مختصر عرصہ کے بعد اپنی تخلیق پر تالے ڈال دیتے ہیں۔ شاعروں کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ۔ " ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم۔ صرف چند غزلوں پر اکتفا نہ کریں اور اس تخلیقی تسلسل کا انتظار کریں جو اعتبار پیدا کرتا ہے "۔

قاری کی اس "زود اعتباری" کے سباب کی فکر مجتبیٰ صاحب کو تنقید کی طرف لے آتی ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ ناقد کا فرض ہے کہ قاری کو بے جا اعتبار یا بے اعتباری سے بچائے۔ لیکن وہ آج کے تنقید نگاروں سے بھی مایوسی کا اظہار کرتے ہیں اور پھر اس مجموعی مجہولیت اور "بے دلی" کا سبب موجودہ دور کی تجارتی ذہنیت میں ڈھونڈ لیتے ہیں۔

ادب اور اعتبار کے آخری پہلو کے طور پر مجتبیٰ صاحب نے ادیب اور معاشرے کے رشتہ پر غور کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ موجودہ دور کی ادب دشمنی کو ادب کے "اپنی نظر میں ایک جنس نامعتبر ہو جانے کا سبب قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں آج ادیب کا معاملہ یہ ہے کہ "دل کچھ کہتا ہے، زبان کچھ کہتی ہے، مصلحت کچھ کہتی ہے"

اس صورت حال میں پیدا ہونے والے ادب کو وہ ادب کی شکست قرار دیتے ہیں۔ مرض کی تشخیص کے بعد مجتبیٰ صاحب اس کا علاج بھی بتاتے ہیں اور وہ یہ کہ زندگی کی برکتوں پر ادیب کا اعتبار ضروری ہے:

"ادب اور اعتبار" کے ضروری نکات کا خلاصہ اوپر کی سطور میں پڑھ لینے کے بعد ہم اس مضمون کی خوبیوں اور خامیوں کی طرف آتے ہیں مضمون کی حیثیت سے اس میں بڑی خوبیاں ہیں۔ مجتبیٰ صاحب نے اپنے نقطۂ نظر کو بڑے منطقی تسلسل کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ وہ اپنے موضوع اور بنیادی تصور یعنی "اعتبار" سے کہیں بھی منحرف نہیں ہوئے۔ لیکن تنقیدی مضامین کی سب سے بڑی آزمائش ظاہر ہے۔ کہ فکر کے مرحلہ پر ہوتی ہے یعنی یہ کہ مضمون نگار نے مضمون میں کیا کہنے کی کوشش کی ہے یہ مضمون پڑھ کر اس سلسلے میں بطور خاص بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ جس صورت حال کا تجزیہ مجتبیٰ صاحب نے اپنے اس مضمون میں کیا ہے وہ اس سے پہلے بھی مختلف ادوار کے اور اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادب اور ادیبوں کو درپیش رہی ہے۔ ان کی نظر میں موجودہ ادب کی نامعتبری کی پہلی وجہ آج کے قاری کی نذر اعتباری اور ادبی شخصیتوں کی عدم موجودگی ہے۔ یہ کوئی نئی بات ہرگز نہیں ہے۔ ہر دور کے ادب میں کئی ادیب ایسے ضرور مل جائیں گے جو وقتی طور پر قاری کے ذہن پر بری طرح چھا گئے ہیں۔ لیکن بالآخر جیت پائدار ادب کی ہی ہوئی ہے۔ مضمون کے شروع ہی میں انیس کے مرثیے کی مثال دی گئی ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے صاحبزادے رئیس کو "نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری" والا مرثیہ کہہ کر دیا اور قاری صاف پہچان گئے کہ یہ رئیس کا نہیں انیس کا مرثیہ ہے مجتبیٰ صاحب نے اس سے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ یہ انیس کی ادبی شخصیت کا اعتبار ہی تھا جس نے قارئین کو مرثیہ کی صحیح نسبت سے آگاہ کر دیا۔ لیکن یہاں وہ یہ بھول گئے کہ یہ ادبی شخصیت ایک دو دن نہیں بقول خود انہی کے "برسوں کی محنت شاقہ، مطالعہ، مشاہدہ اور ہزاروں صفحے لکھ کر کاٹنے" کے بعد بنتی ہے۔ اگر وہ یہ بات نہ بھولتے تو ۴۷ء کے بعد کے ادب پر یہ الزام ہرگز نہ لگاتے کہ وہ "جنس نامعتبر" ہے۔ یہاں مجتبیٰ صاحب اعتبار کا وہ پہلو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کر گئے جو اولین شہرت اور کامیابی کے مرحلہ پر ہر ادیب کے پیش نظر ہوتا ہے جیسے ہی کسی ادیب کو یہ احساس ہوتا ہے کہ قاری کو اس کی تخلیق پر اعتبار آتا جا رہا ہے تو اس کے لئے شعوری یا لاشعوری طور پر ایک مسئلہ یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ قاری کے اس اعتبار کو معتبر سمجھے یا نامعتبر۔ بالفاظ دیگر اس کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ یا تو وہ قاری کے اعتبار کو صحیح مان کر اپنے تخلیقی ارتقار کو روک دے یا اسے "نامعتبر" سمجھ کر اس سے اثر لئے بغیر کسی ادبی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے تخلیقی سفر کی دوسری منزلوں کی طرف چل کھڑا ہو۔ چھوٹے ادیب کی پہچان یہی ہے کہ وہ اس منزل پر آ کر رک جاتا ہے اور اسی سنگ میل پر ایک شہر آباد کر لیتا ہے۔ "۴۷ء کے بعد کا ادب" ابھی اسی مرحلے میں ہے۔ اور ادیبوں کی یہ "نئی نسل" ابھی اسی کشمکش میں ہے کہ انجانی راہوں پر سفر شروع کر دیا جائے یا سنگ میل پر بیٹھ کر زندگی گذار دی جائے۔ ظاہر ہے کہ تیرہ سال کی قلیل مدت اس قسم کے فیصلوں کے لئے بیحد کم ہے۔ بقول خود مجتبیٰ صاحب کے "یہ بنیاد رفتہ رفتہ پڑتی ہے ادب کو جلد بازی سے بیر ہے"۔ اس صورت حال سے زیادہ خوفزدہ ہونے کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ زندگی کے اور شعبوں کی طرح خود ادب کے پاس بھی آزمائش و خطا کا ایک طریقہ کار ہے۔ اور ادبی آزمائش کو خاصی طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ وقت کا قافلہ صرف ان لوگوں کو اپنے ساتھ لیجاتا ہے جن میں اس کے ساتھ چلنے کی سکت ہوتی ہے۔ کمزور چند قدم چل کر خود ہی لڑکھڑا جاتے ہیں۔

آگے چل کر مجتبیٰ صاحب آج کی تجارتی ذہنیت اور معاشرے کے عدم تعاون کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ "تجارتی ذہنیت" کے سلسلے میں انہوں نے جن حالات کا تذکرہ کیا ہے ان کا سدباب آسان نہیں ہے۔ یہ حالات کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں ہیں، ان کی جڑیں ہمارے معاشرہ کے بنیادی تضادات میں ہیں۔ مکمل سدباب کے لئے ایک اور طرح کے معاشرے کی ضرورت ہے جس کے خواب بھی اس معاشرے میں بے حد مہنگے ہیں۔ جہاں تک ادیب سے معاشرہ کے عدم تعاون کا سوال ہے مجتبیٰ صاحب مضمون کے شروع میں اس کے برعکس شکایت کر چکے ہیں۔ آج کے ادیبوں کو معاشرہ کے ذہنی سہارے میسر ہیں اس لئے کہ مجتبیٰ صاحب کے قول کے مطابق "آج کا قاری بے حد نذر اعتبار واقع ہوا ہے"۔ میرے خیال میں یہ نذر اعتباری بجائے خود معاشرے کے تعاون کی آئینہ دار ہے۔ اس کو ہم

ذہنی سہارے کے علاوہ اور کیا نام دے سکتے ہیں۔

دوسرا مضمون "ادب اور مذہب" ہے جو میرے خیال میں اس مجموعہ کا بہترین مضمون ہے مجتبیٰ صاحب کا کہنا ہے کہ "مذہب انسانی زندگی کی م
متعین کرتا ہے مگر ادب سراپا سفر ہے"۔ ماقبل تاریخ کے انسان سے آج کے انسان تک انسانیت نے جو عظیم راستہ طے کیا ہے مجتبیٰ صاحب نے اس کی منزا
نظر ڈالتے ہوئے ادب اور مذہب کے رشتہ کو واضح کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ "مذہب اور ادب کا رشتہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ وہ اس سے متاثر ہوا بھی ہے
نہیں بھی"۔ وہ کہتے ہیں کہ ادب "مذہب کی طرح اٹل، واضح، متعین، مرتب اور مضبوط نہیں ہے۔ اس کی گرفت مذہب کے مقابلہ میں ڈھیلی ہے"۔ بجہ
اسی سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ "ان تمام اختلافات اور کشیدگی کے باوصف ادب اور مذہب دونوں وہاں جا کر مل جاتے ہیں جہاں
کو راہ نجات دکھانے کا سوال اٹھتا ہے"۔

یہ مضمون مجتبیٰ صاحب کا شاہکار ہے۔ اس میں انہوں نے نہ صرف نتائج کی صحت کا پورا خیال رکھا ہے بلکہ انشا پردازی۔۔۔ کی ایک بڑی اچھی مثال
کی ہے۔ ہر اعتبار سے یہ مضمون حاصل مجموعہ ہے۔

پہلے حصہ کا تیسرا مضمون "ادب کا مستقبل ہے"۔ جو موضوع کے اعتبار سے بے حد غور طلب اور اہم ہے یہ مضمون کے اوائل میں مجتبیٰ صاحب نے
کہ انگلستان، امریکہ، فرانس اور روس میں آج عظیم ادب نہیں پیدا ہو رہا ہے۔ نہ صرف نئے بلکہ پرانے ادیب بھی کمتر درجہ کی تخلیقات پیش کر رہے ہیں
جائزہ کے بعد انہوں نے اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ سائنس اور ادب کے بنیادی تضاد اور آج کے معاشرے میں سائنس کی اولیت نے
کو سراسیمہ کر دیا ہے اور ادب کا مستقبل تشویشناک نظر آتا ہے ان کا کہنا ہے کہ "دنیا کو خوبصورت اور آرام دہ بنانا، انسان کو مادی اشیاء سے لطف اند
جذبات اور فکر کو نئے راستوں پر لگانا اب ادب و شعر کے بس کا نہیں رہا"۔

اس سلسلے میں کہ مغربی ممالک کے ادب کا جائزہ ہمیں کیا بتاتا ہے ہم کوئی قطعی رائے رکھنے سے احتراز کریں تو مناسب ہے اس لئے کہ بقول خو
صاحب کے "جلدبازی سے ادب کو بیر ہے"۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ آج مغرب میں ادب کم مائگی کا شکار ہے تو اس کا سبب ہمیں ان کے معاشرہ میں سائنس کی
ہوئی اولیت نہیں بلکہ ان کی زوال پذیر تہذیب میں تلاش کرنا چاہیئے۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ سائنس کی روزافزوں برکتوں کے باوجود مغرب کا معاشرہ ایک
پراگندگی کا شکار ہے جو ان کی جذباتی شکست سے عبارت ہے۔ یہ جذباتی شکست سائنس اور ادب کے اس "تضاد" کی پیداوار ہرگز نہیں ہے جس کو مجتبیٰ صا
فرض کر کے چلتے ہیں۔ کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جس سے ثابت کیا جا سکتا ہو کہ ادب اور سائنس میں کوئی بنیادی تضاد ہے سائنس اور ادب میں کوئی تضا
ہے سوائے اس کے کہ معاشرے میں ان کے کردار مختلف ہیں۔ اگر آج کچھ ادیب اس تضاد کے دھوکے میں سائنس سے احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں
تضاد کی واقفیت کا نہیں ان ادیبوں کی کم فہمی کا ثبوت ہے۔ اس بات سے تو مجتبیٰ صاحب بھی مشکل ہی سے انکار کریں گے کہ معاشرہ میں سائنس اور ادب
کردار بالکل مختلف ہیں۔ ادب کے فرائض میں یہ کبھی شامل نہیں تھا کہ وہ "دنیا کو خوبصورت اور آرام دہ" بنائے اور "انسان کو مادی اشیا سے لطف اندو
ادب کے فرائض اپنی اصل میں جذباتی ہیں اور کسی معاشرہ کی تہذیبی تکنیک CIVILIZATIONAL TECHNIQUE کے
ردعمل ہی کا نام ادب ہے۔ یہاں لفظ "جذباتی" کا استعمال اس کے ہمہ گیر اور وسیع تر معنی میں ہے۔ "جذباتی" کی یہی وسعت ہے جس کی روشنی میں مجتبیٰ صا
نے "ادب اور مذہب" میں ادب اور مذہب کے رشتہ کو بڑی خوش اسلوبی سے واضح کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب اور اس کی طرح مذہب کو اپنے
کے بارے میں جو خطرہ لاحق ہے۔ وہ سائنس کے بڑھتے ہوئے غلبے سے نہیں بلکہ اس رفتار سے ہے جس سے سائنس آج معاشرہ کو تبدیل کر رہی ہے اس تہ
نے انسان کی جذباتی شخصیت کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ مغرب کے لئے تو اب اس خلیج کو پر کرنا تقریباً ناممکن ہو چکا ہے لیکن شاید مشرق سے یہ امید کی جا سکتی

اکہ

کی روبہ زوال تہذیب سے اس کی سائنسی تکنیک اخذ کرنے کے ساتھ ہی وہ اپنی جذباتی شخصیت کو زیادہ طاقتور بنائے گا ۔ اس امید کی بنیاد اس فکری طرزِ عمل پر ہے جو ہمیشہ مشرق کا شعار رہا ہے یعنی مابعد الطبیعیاتی مجتبیٰ صاحب کو ادب کے مستقبل کے بارے میں جو تشویش لاحق ہے وہ مغرب کے لئے صحیح ہو تو ہو لیکن مشرق کے بارے میں ابھی کچھ کہنا اس لئے قبل از وقت ہے کہ صنعتی دَور اور سائنس نے مشرق کے ذہن کو تو درکنار ، اس کی زندگی کو بھی پوری طرح متاثر نہیں کیا ہے ۔

فہرست کی ترتیب کے مطابق حصّہ " ب " میں مجتبیٰ صاحب کے تین اور مضمون ہیں ۔ " ذوقِ سلیم " ہمارے ناقد اور عمل تنقید ، " کچھ لہجہ کے بارے میں " پہلے مضمون میں انہوں نے " ذوقِ سلیم " کے وہبی اور اکتسابی نظریوں کے تضاد کا تجزیہ کرکے اکتسابی نظریہ کے حق میں فیصلہ دیا ہے ۔ اس کے سلسلے میں ان کے اخذ کئے ہوئے نتائج اور دلائل وزنی ہیں ۔ اور ان سے اتفاق ناگزیر ہے ۔ دوسرے مضمون میں انہوں نے ہماری موجودہ تنقید کی " بے عملی کی شکایت کی ہے جس میں وہ قطعی طور پر حق بجانب ہیں ۔ " کچھ لہجہ کے بارے میں " اچھا خاصا مضمون ہے لیکن اس سے پہلے کے مضامین کی سطح تک نہیں پہنچا ۔

حصّہ ج " میں چار مضامین غزل اور اس کے مسائل کے بارے میں ہیں ۔ " تغزل کیا ہے " میں انہوں نے تغزل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ۔ " کیا غزل کی اہمیت ختم ہو چکی ہے " ۔ اور " دورِ حاضر اور غزل " دونوں میں غزل کے امکانات اور آج کی اُردو شاعری میں غزل کی طرف عام رجعت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے " حالی اور ترکِ غزل " میں حالی کی اہمیت اور ان کے " پختہ اور حری شعور " کی وضاحت کی گئی ہے ۔

آخری حصّہ " د " میں اکبر ، حسرت ، آرزو ، فانی اور ظریف پر مضامین ہیں ۔ جن میں مجتبیٰ صاحب نے ایک حد تک اور صرف ایک حد تک عملی تنقید کے اس تقاضے کو پورا کیا ہے جو انہوں نے " ہمارے ناقد اور عملی تنقید " میں کیا ہے ۔ مجتبیٰ صاحب کے طرزِ نگارش پر کچھ کہنا ضروری ہے ۔ ان کے کئی مضامین میں فکری سہل انگاری کا ثبوت ملتا ہے لیکن ہر بات کے باوجود وہ بڑی شگفتہ نثر لکھتے ہیں ۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں پرزور اور اچھی زبان میں کہہ سکتے ہیں ۔

" تہذیب و تحریر " کے بارے میں مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے ۔ کہ اس کے مضامین الگ الگ چند خاص نقطہائے نظر کو سامنے لاتے ہیں لیکن ان سے کوئی مربوط اور ہم آہنگ اندازِ نظر اخذ نہیں کیا جا سکتا ۔ اس طرح ان کا یہ خیال بالکل درست ثابت ہو جاتا ہے کہ " آج کل تنقید کم مایہ نظر آتی ہے " ۔

کتابت کی طباعت دیدہ زیب ہے ۔ اور گردپوش جاذبِ توجہ ۔ طباعت میں حسن کاری مکتبہ افکار کا امتیاز رہی ہے ۔

جذباتِ بھاشا نیاز فتحپوری

ادارہ ادب العالیہ کراچی

بھاشا کی شاعری کے ترنم اور اس کی موسیقی کی نظیر کسی اور زبان کی شاعری میں مشکل ہی سے ملتی ہے ۔ بھاشا کی شاعری کا غالب رجحان عورت کی طرف سے اظہارِ عشق ہے ۔ اور اس میں عورت اپنے کئی کرداروں میں سامنے آتی ہے ۔ مثلاً بہن ، سہیلی ، وغیرہ ۔ ساتھ ہی یہ ضروری نہیں ہے کہ گفتگو براہ راست محبوب ہی سے ہو ۔ ماحول کے مختلف لوگوں سے اپنے عشق کی باتیں کی جاتی ہیں اور اس طرح عشق کے معاملے میں بھاشا کی شاعری کئی اعتبارات سے اور زبانوں کی عشقیہ شاعری کی نسبت وسیع تر بن جاتی ہے ۔

علامہ نیاز فتحپوری نے اسّی صفحات کی اس کتاب میں بھاشا کے منتخب اشعار کا تاثراتی مطالعہ کیا ہے ۔ عبدالرحیم خانخاناں ، بہاری لال وغیرہ کے اشعار کو سمجھنے سمجھانے کی یہ کوشش کامیاب ہے ۔ اور اسے نیاز صاحب کے نسبتاً کم حیثیت کے کارناموں میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔

مزید حماقتیں

شفیق الرحمٰن

مکتبہ جدید لاہور

"مزید حماقتیں"، شفیق الرحمٰن کی اور کتابوں کی طرح آج کی مقبول ترین کتابوں میں ہے اور اس سے پہلے بھی کئی بار چھپ چکی ہے لیکن اس بار مکتبہ جدید نے اسے سستے ایڈیشن میں چھاپا ہے۔ پہلی طباعتوں میں اس کی قیمت چھ روپے تھی۔ لیکن اب... صرف تین روپے ہے۔ اردو کتابوں کی عام گرانی کے پیش نظر مکتبہ جدید کا قدم لائق تحسین ہے۔ امید ہے کہ یہ ادارہ ہمت سے کام لے کر اردو کے کلاسیکی ادب کو بھی سستی طباعتوں میں پیش کرے گا۔

ماہنامہ ندیم ڈھاکہ

جون، جولائی

ندیم کا یہ شمارہ نذرالاسلام سے مخصوص ہے۔ اس میں نذرالاسلام پر آٹھ مضامین نذرالاسلام کا ایک افسانہ کا ترجمہ اور چند منتخب نظموں کے تراجم شامل ہیں۔ یونس احمر کا "نذرل۔ ایک مطالعہ" اچھا مضمون ہے۔ وفا راشدی اور اسدالحق کے مضامین "نذرالاسلام اور اردو" اور "نذرالاسلام کی غزل گوئی"، اہم مضامین ہیں۔ نظموں کے تراجم میں سید ذوالفقار علی بخاری کا "جوہر" اور "حقی" صاحب کا "شاعر" اچھے ترجمے ہیں۔ "خطاب" اور "باغی" نذرالاسلام کی اہم ترین نظموں میں سے ہیں لیکن یونس احمر کا ترجمہ اچھی نظم میں نہیں ہے اور راقم الحروف کے لئے پوری کا ترجمہ "باغی" نثر میں ہے۔

نذرالاسلام اردو میں خاصے عرصے سے متعارف ہیں لیکن ندیم کے نذرالاسلام نمبر کی وساطت سے ہم ان کے اور بھی قریب آجاتے ہیں۔ ترتیب و تدوین قابل مبارکباد ہے لیکن طباعت اور کتابت اب بھی توجہ کی طالب ہیں بہرحال ڈھاکہ میں اتنا کام بھی بہت بڑا کام ہے۔ ارشد کاکوی اور ان کے رفقاء کی ہمت اور کارکردگی کے لئے اردو پڑھنے والے ان کے احسان مند رہیں گے۔ ندیم دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ارشد ایک پرکار شاعر ہی نہیں۔ زبان و ادب کے ایک کارطلب مجاہد بھی ہیں۔

سالنامہ تیج دہلی

اس وقت تیج کا خوبصورت سالنامہ پیش نظر ہے۔ چودہ مضامین، ۷ افسانے، سولہ غزلیں، دو نظمیں اور چار ریڈیائی فیچر اس سالنامہ کی زینت ہیں۔ خوبصورت اور دیدہ زیب ٹائیٹل، اعلیٰ طباعت و کتابت اور جاذب توجہ انداز پیش کش نے اس کو ایک اعلیٰ صحافتی کارنامہ بنا دیا ہے۔ مضمون نگاروں میں ڈاکٹر رادھا کرشنن، راج گوپال اچاریہ، صدر ناصر جیسے نام نظر آتے ہیں۔ افسانہ نگاروں میں خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، اور رام لال موجود ہیں۔ منظومات میں فراق گورکھپوری، سردار جعفری، جوش ملسیانی، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، خمار بارہ بنکوی کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس سالنامہ کا معیار کس سطح پر ہے۔ صحافت اور ادب کے اس دلکش امتزاج کے لئے ادارہ تیج قابل صد مبارکباد ہے۔ ناانصافی ہوگی اگر یہاں سمت پرکاش شوق کی غزل کا ذکر نہ کیا جائے یہ غزل حصۂ منظومات کی جان ہے۔

جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے

سید محمد تقی ۔ کراچی

عزیز گرامی!

اگست کی اشاعت میں آپ نے جناب شان الحق حقی کا ایک بڑا ضروری مراسلہ اور ایک غزل شائع کی ہے۔ حقی صاحب ملک کے ان گہری نظر رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں میں شامل ہیں جو سطحی افسانہ طرازیوں اور غزل بازیوں سے بچ کر ادب کے ٹھوس، فکری اور تحقیقی مفاہیم سے دلچسپی لیتے ہیں۔ حقی صاحب نے بڑا اہم سوال اٹھایا ہے یعنی یہ کہ اردو میں عربی اور فارسی الفاظ کے علاوہ دوسری زبان کے لفظوں سے جو مرکبات بنتے ہیں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ اس سلسلے میں انہوں نے جو یہ رائے پیش کی ہے کہ ایسے مرکبات کو ادبی استناد حاصل ہونا چاہیئے میرے خیال میں بالکل درست ہے۔ یہ بحث آگے چل کر ایک وسیع اطلاق حاصل کر لیتی ہے۔ اب مثلاً سماجیات کو لیجئے سماج عربی زبان کا لفظ نہیں لیکن سوشیالوجی کا ترجمہ سماجیات سے جس بہتر طور پر کیا جاسکتا ہے عمرانیات سے نہیں ہوسکتا، اسی طرح مرکنٹائلزم کو لیجئے میرے خیال میں مرکنٹائلیت اس کا بہترین ترجمہ ہے۔ اسی طرح سامراج فلم سازی، فلم بینی یا جینیات (جینیٹکس کا ترجمہ) ایسے بے شمار الفاظ ہیں جنہیں باسانی اردو میں رائج کیا جاسکتا ہے اور رائج کیا گیا ہے اور جو ادبی استناد کا پورا حق رکھتے ہیں۔ میں حقی صاحب اور ان لوگوں سے جو نئے علوم کا دباؤ اور جدید زندگی کی ضرورتوں کو سمجھتے ہیں یہ عرض کروں گا کہ وہ اس معاملے میں ادبی بغاوت کے لئے منظم ہو جائیں اس لئے کہ اگر حرف پرستی اور لفظی عصبیت کا مقابلہ نہ کیا گیا تو اردو کو "گیتوں بھری کہانیوں" کے درجے سے بلند کرنا ممکن نہ ہوگا۔ الفاظ کی الوہیت اور ادبی تقدس کے فرسودہ نظریے سے چھٹکارا حاصل کرنا ہماری زبان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یارانِ محفل تو خیر جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ بیچاری اردو کو بولی کے درجے سے کسی طرح اونچا نہ اٹھنے دیں گے لیکن اپنے دیار میں ابھی انسانوں کا قحط تو نہیں جو ان از کار رفتہ دماغوں کے خلاف کوئی بغاوت کامیابی حاصل نہ کرسکے۔

فیبر شور علیگ ۔ لائلپور

مکرمی ۔ تسلیم

میں عرصے سے ڈاکٹر حسنین کاظمی صاحب کے مقالات کا بڑی گہری دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کر رہا تھا، اس ماہ کے شمارے میں کاظمی صاحب

کا کوئی مقالہ نہ دیکھ کر محسوس ہوا، غالباً مقالات کا یہ لطیف اور قابلِ قدر سلسلہ منقطع ہو گیا ؎

غم چیزی رنگ جہان را خراشد — کہ گاہی باشد و گاہی نباشد

کاظمی صاحب نے ادبِ اردو کے قارئین کو نہ صرف یہ کہ ایران کی موجودہ شاعرات سے متعارف کرایا بلکہ اس سلسلہ میں کام کرنے والوں کے لئے بہت سی اہم معلومات بھی فراہم کر دی ہیں، بیسویں صدی کی ان ایرانی شاعرات نے افکار کا تجزیہ ایران کی ایک لطیف صنفِ ادب کے جن پہلوؤں کو اجاگر کر دیتا ہے اُن کی اہمیت واقعیت اور فن کے توازن میں مخفی ہے۔

اس سلسلے میں میں خانم پروین کے کلام سے سخت متاثر ہوا، خانم پروین کے احساسات کی خود رفتگی، خلوص، شدت اور گیرائی اُن کو اُن کی ہم عصر شاعرات میں ایک ایسے مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں وہ سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں ؎

پی عبرا ز خویش بخود آمدم — باز ندانم بکجامی روم

خانم پروین کی شاعری کے داخلی رخ کے علاوہ ان کے فن کا (OBJECTIVE ASPECT) خارجی رخ انکے احساس کی وسعتوں کا آئینہ دار ہے، ان کی فکر و نظر کی یہ وسعت اُن کے معاصرین میں اُن کا مقام اور بلند کر دیتی ہے ؎

دیر گاہی شد کہ در بازار دہر — غم خریدم خویشتن بفروختم

خانم پروین کے آرٹ کی روح میں زندگی کی جو صداقت محسوس ہوتی ہے وہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے آرٹ کا پیار بھی اتنا ہی حسین ہے ؎

غنچۂ دل سوختہ بر شاخسار — در طلب باد صبا می روم

رشتہ ہائی در نایاب امید — بر قبائی نامرادی دوختم

یہ اور اس قسم کے متعدد شعر اُن کے کلام میں عام ہیں جن سے اُن کے فن کی چابکدستی اور تردستی کا پتہ چلتا ہے، اس نوعیت EXPRESSIONISM اظہار فنکار کی انفرادیت کو اُس کے معاصرین میں متعین کر دیتا ہے۔

کاظمی صاحب کے یہ مقالات اپنے ایجاز کے باوجود قارئین اردو کے لئے ایران کے شعری ادب کا ایک قابلِ قدر تحفہ ہیں۔

پروفیسر جہاں بانو نقوی۔ حیدرآباد دکن

برادرِ محترم! تسلیم

آپ کے جریدہ کے کیا کہنے۔ جو دیکھتا ہے اس کے معنوی و صوری حسن کو سراہتا ہے۔ کوئی ایک چیز ہو تو کوئی تعریف بھی کرے یہاں تو یہ حال ہے ؎ سراپا پہ جس جا نظر کیجئے — وہیں عمر اپنی بسر کیجئے

سید زوار حسین۔ بہرائچ۔ یوپی

آپ کو خط لکھتے ہوئے سب سے پہلا مرحلہ تو القاب و آداب کا سامنے آتا ہے۔ شفاعت حسین کو میں اد راہ پدری شفقت کہتا ہوں وہ آپ کو جو کچھ کہتا ہے پھر آپ ہی بتلا دیجئے کہ میں کیا لکھوں۔

بہر حال دعائیں اور پُر خلوص دعائیں۔

رسالہ کی بابت کیا تحریر کروں، خامہ انگشت بدنداں ہے کہ اسے کیا لکھیے، جو کچھ بھی کہا جائے ہو تحسین تیر نا سکنے کی کیا ضرورت، جو کچھ لکھنے والوں کو حیرت ہے کہ جون کی جو ... اسے ... کی حیرت پر حیرت ہے۔ ابھی تو یہ رسالہ جون کی خاندانی روایات کے پیش نظر بہت ہی بہت ہے۔ بہتر LAST BUT NOT LEAST کا مصداق ہے۔

زبانِ حال تنگیٔ وقت کے پیشِ نظر اسی قدر عرض کرنے کا کہ پاکستان ... [illegible] ... اور میں خاص پاکستان ہندوستان اور اسلام کے ... [illegible] ...

اب اپنا ملک کتنی دور رہ گیا۔
گذشتہ شمارہ میں آپ کا اداریہ ایک بحث چند سوال بہت شوق سے پڑھا۔ اور اس کے متعلق فرصت کے پہلے لمحہ میں اظہار
خیال کروں گا۔ یہ وقت کا سب سے ضروری سوال ہے۔

رب ردولوی ۔ لکھنؤ

برادرم جون ۔ سلام و نیاز

قرۃ العین کی نظم بہت عرصہ کے بعد نظر آئی لیکن اس نے پچھلی خاموشی کا کفارہ ادا کر دیا بڑی مترنم بحر اور مترنم الفاظ میں بڑی خوبصورت
نظم کہی ہے: "روشنی سے پردہ" بھی بہت اچھی نظم ہے لیکن میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ سوال کہیں ذاتی
نہ ہو جائے پھر بھی ہمیں اپنے شاعر اور ادیب سے اس کے پوچھنے کا حق پہنچتا ہے کہ یہ نظم آپ نے کیوں کہی ۔ ؟ آپ اتنے اداس
کیوں ہیں؟ "روشنی سے یہ گریز کس لئے نظم بڑی پر اثر اور مکمل ہے لیکن میں خود اس کو پڑھ کر اداس ہو گیا اور بہت دیر تک نہ
جانے کیا کیا کچھ سوچتا رہا۔ اسی لئے اتنے سب سوال کر ڈالے۔
مضامین سبھی اچھے ہیں حسنین کاظمی صاحب کے طفیل پروین سے ملاقات ہو گئی۔ کاظمی صاحب واقعی بہت محنت کر رہے ہیں۔
ان مضامین کی افادیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ پروین کی شاعری میں ایک سنجیدہ ٹھہراؤ اور دروں بینی ہے جس نے
اس کی شاعری میں ایک پر وقار عظمت پیدا کر دی ہے۔
آپ سے ایک بات اور عرض کرنے کو جی چاہتا ہے انشاء میں صحافت کا انداز زیادہ بڑھتا جا رہا ہے اسکو معتدل ہی رکھئے۔

جمال پاشا ۔ ماہنامہ اودھ پنچ ۔ لکھنؤ

مائی ڈیر جون ۔ آداب!

تم جو پرچہ نکال رہے ہو صرف اس کے سرورق کے لئے میرا دعویٰ ہے کہ یہ اردو کے تمام رسائل میں یکتا ہے اور اپنی ندرت،
سلیقہ، حسن اور کشش کے اعتبار سے سب کے کان کاٹ چکا ہے۔ اور رسالہ کے اندر جس قدر معیاری ترین مواد ہوتا ہے
اس کے لئے صرف یہ کہنا کافی ہو گا کہ بھائی اس میں فارسی بہت ہوتی ہے۔ مگر یہ فارسی ایسی ہوتی ہے جیسے کہا جائے کہ پنجاب
میں پنجابی بہت ہیں۔

محمد خان خانخیل ۔ ہوتی ضلع مردان

مکرمی تسلیم!

انشاء ہند و پاک کا واحد رسالہ ہے جس نے ادبی دنیا میں ایک ہیجان پیدا کیا۔ اس رسالہ میں ادبی معلوماتی
سیاسی اور کئی ایک مضامین چھپتے ہیں اور یہی چیزیں انسانی ذوق کا باعث ہوتی ہیں ہم دلی خلوص سے آپ کو مبارکباد
دیتے ہیں اور انشاء کے لئے دعا کرتے ہیں پچھلے شمارے میں جرمن جاسوسہ اور ڈیگال بہت پسند آئے۔

سید محمد علی ۔ کراچی

محترم ۔ تسلیم

انشاء ہر ماہ ایک عالمگیری انداز پیش کرتا ہے، ستمبر کے شمارے میں قمر نفیس کا افسانہ "برات چلی گئی" بہت پسند
آیا ــــ طرز تحریر کے ساتھ اس کے بنیادی خیال میں ایک اصلاحی پہلو بھی ہے۔
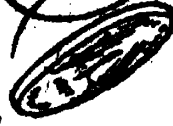
اکتوبر ۶۰

جی ہاں ۔ بہت ہی پیارا اور نہایت تندرست ! کیوں نہ ہوتا ماں کی ممتا ، اس کی نگہداشت اور آسٹر ملک کی خوبیاں کارگر ہیں۔ دانشمند مائیں اِسی لئے اپنے بچوں کی پرورش آسٹر ملک سے کرتی ہیں۔ خواہ ماں کا دُودھ چھٹ جانے پر دیا جائے یا اِس کی کمی پُوری کرنے کے لئے آسٹر ملک ماں کے دُودھ کا بہترین بدل ہے۔
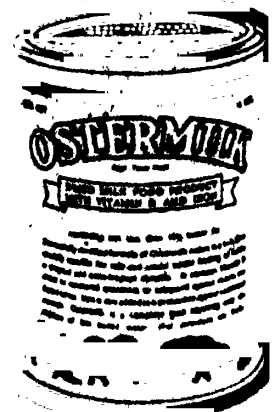
آسٹر ملک اعلیٰ اور خاص قسم کے دُودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اِس میں فولاد مِلایا گیا ہے تاکہ بچوں میں خون کی کمی نہ ہونے پائے ، اور ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے وٹامن 'ڈی' بھی شامل کیا گیا ہے۔

جی ہاں ! یہی وجہ ہے کہ مائیں پُورے اعتماد کے ساتھ بچوں کو آسٹر ملک دیتی ہیں۔

دیر تک
دلفریب
دلربا
تازگی
لکس
ٹالکم پاؤڈر
بھینی بھینی مہک والا لکس پاؤڈر تھوڑا سا چھڑکئے اور سارے جسم میں دیر تک ایک دلفریب و
دلربا تازگی کے احساس سے محظوظ ہوجیئے۔ اس کی آرام دہ ٹھنڈک بے حد فرحت بخش ہے۔
لکس ٹالکم پھول کی پنکھڑیوں کی طرح ایک نرم و نازک پاؤڈر ہے جو آپ کے جسم کو دن بھر ایک دلربا
تر و تازگی میں بسائے رکھتا ہے۔ اس کی حسین خوشبو آپ کو دن بھر ایک لطیف مہک میں لپیٹے رکھتی ہے
دن بھر کی تر و تازگی اور مسرت کے احساس کے لئے
لکس ٹالکم پاؤڈر

عوام تنگ آجاتے ہیں ○ انسانی گوشت تاریخ کی روشنی میں

مندر میں وحشیانہ رسم ○ عالمی سیاحت کے تیس ۳۰ دن

”مونالزا“

لیونارڈو ڈاونچی کو اسکے ھمعصر جادوگر کہا کرتے تھے کیونکہ وہ بیک وقت فلسفی سائنسداں ماہر هیئت مصور اور نجانے کیا کچھہ تھا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا یہ عظیم اور جامع انسان عجیب و غریب کا مالک تھا۔ ”مونالزا“ اس کا ایک غیرفانی شاھکار ھے جسکی پراسرار مسکراھٹ میں لیونارڈو آجتک زندہ ھے۔
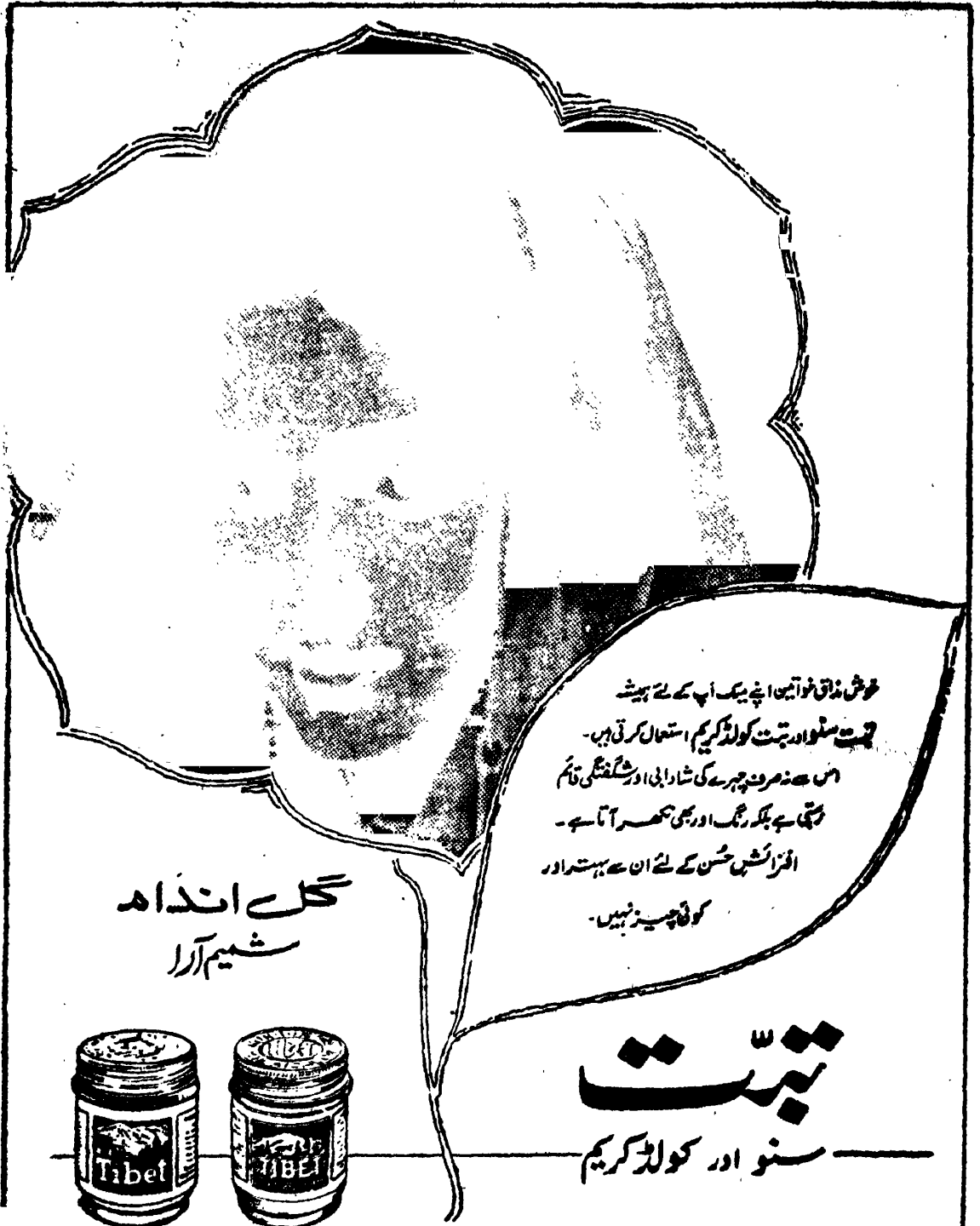
خوش مذاق خواتین اپنے میک اپ کے لیے ہمیشہ
تبت سنو اور تبت کولڈ کریم استعمال کرتی ہیں۔
اس سے نہ صرف چہرے کی شادابی اور شگفتگی قائم
رہتی ہے بلکہ رنگ اور بھی نکھر آتا ہے۔
افزائش حسن کے لئے ان سے بہتر اور
کوئی چیز نہیں۔
گل اندام
شمیم آرا
Tibet
TIBET
تبت
سنو اور کولڈ کریم
کوہ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ کراچی۔ ڈھاکہ
آرائش جمال کی معیاری مصنوعات اور عمدہ صابن بنانے والے

چہرہ نما

انشاء

فروری سنہ ۱۹۶۱ء

مُدیر
جون ایلیاء

ادارہ ذہن جدید
۹۲ نیو کلاتھ مارکیٹ بندر روڈ
کراچی
فون نمبر
۳۰۸۹۷
۳۴۴۳۳

فلسفہ — شیطان کا شعار	جون ایلیاء
جان نذر دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے	ارباب انشاء
شرم تم کو مگر نہیں آتی؟	زکی عباس
سوچ کی قربان گاہ پر ایک وحشیانہ رسم	سیدہ شاہ زماں
عالمی سیاست کے تین دن	محمد مہدی
محبت! کون، کسے اور کیوں؟	آدم افرودیسی
نیاز نگاہ	پروفیسر ارشد کاکوی
گریز	سحر انصاری
تکرار تمنا	رحمان کیانی
اردو کا پہلا نقاد حالی	ممتاز حسین
گلابی — ایک چہرہ دو آئینے	محمد علی صدیقی
نشستند و گفتند و برخاستند	سحر انصاری
جب عوام تنگ آ جاتے ہیں	رئیس امروہوی
انسانی گوشت — تاریخ کی روشنی میں	ایم۔ کے ناظمی
غزل	شیر افضل جعفری
٥	نازش حیدری
لال کرہ	ایچ، جی، ویلز / سید مختار علی خاں
رات تاریک تھی	یونس سنر
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا	نشیان

قیمت ۶۲ پیسے
سالانہ -/۷

شمارہ ۲
جلد ۵

جون ایلیاء

فلسفہ ـــــ شیطان کا شعار

انشائیہ

جنوری میں کراچی یونیورسٹی کے زیر اہتمام پاکستان فلسفہ کانگریس کے سالانہ اجتماعات منعقد ہوئے جن میں بعض بیرونی فلسفیوں نے بھی شرکت کی، پاکستان فلسفہ کانگریس ملک کے علمی اور ثقافتی اداروں میں سب سے اہم ادارہ ہے۔ اس لئے کہ پاکستان کی ذہنی تعمیر و تشکیل کی اصل ذمہ داری اُسی پر عائد ہوتی ہے۔ اُس کا فرض ہے کہ وہ فلسفیانہ افکار و نظریات کی اشاعت کے ذریعے قوم میں ایک فکری انقلاب برپا کرے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اُس نے اپنی اس ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا۔ اس وقت پاکستان کا دانشور طبقہ مختلف سوالات سے دوچار ہے یہ سوالات خالص تاریخی اور علمی نوعیت کے حامل ہیں ان متعدد سوالات میں سے ایک سوال یہ بھی ہے کہ گزشتہ چند صدیوں سے ہم جس فکری انحطاط اور ذہنی زوال سے دوچار ہیں اس کے اسباب کیا ہیں ـــ ؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب پاکستان فلسفہ کانگریس ہی کو دینا چاہئے اس سوال کے غالباً دو ہی جواب ہو سکتے ہیں یعنی یا تو اس کی ذمہ داری عقیدے پر ہے یا عقل پر۔ اب ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ ہم نے اپنے اخلاقی، سیاسی تہذیبی اور ذہنی زوال کی اس طویل مدت میں عقیدے کی بات مانی ہے یا عقل کی ہمیں اس مسئلے میں پوری وضاحت سے کام لینا چاہئے۔ بات یہ ہے کہ ہم نتائج تک پہنچتے ہوئے جھجکتے ہیں اور یہ بڑی ناانصافی ہے فلسفہ کانگریس کے طریق کار سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں فیصلہ کرنے کی جرأت نہیں مجموعی طور پر پاکستان کے اہل علم کا اندازہ کچھ یہی ہے ان میں ایسے افراد کی اکثریت ہے جو عقل کو عقیدے کے زیر اثر رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ رجحان قرون وسطیٰ کے کلیسائی ـــــ فلسفے سے ماخوذ ہے۔ قرون وسطیٰ کا کلیسائی فلسفہ اس بات پر مصر تھا کہ ایمان عقل پر مقدم ہے اور فلسفے کو عقیدے کا خادم بنکر رہنا چاہئے اس دور کا سارا فلسفہ عقیدے اور عقل کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کا نام ہے اس کوشش نے تاریخ فکر کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تفصیل بڑی المناک ہے یہی وہ منطق تھی جس کی عدالت میں انسانیت کے عظیم مفکروں اور فلسفیوں کو موت کی سزائیں سنائی گئیں سینٹ انسلم جو مدرسیت پر جوشیلا اور مبہم جو معلم گزرا ہے کہتا ہے کہ "میں ایمان لاتا ہوں تاکہ میں سمجھوں" ـــــ یہی انداز نظر ماضی میں ہمارے یہاں بھی اختیار کیا گیا کاش ہمارے لئے اس کی تفصیل پیش کرنا مناسب ہوتا۔ ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ اس کی شہادت صفحات

تاریخ سے طلب کی جائے۔ بہرطور اس کا جو انجام ہوا وہ مشرق کے فکری انحطاط اور ذہنی بانجھ پن کی صورت میں ہمارے سامنے ہے آج بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں وہی باتیں آج بھی کی جارہی ہیں البتہ انداز میں ذرا "جدیدیت" پیدا ہوگئی ہے بڑے لطیف طریقے سے عقل و فکر کی مخالفت جاری ہے اور ان شخصیتوں کو زندہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جنہوں نے اپنے عہد میں تفکر و تعقل کی ہر طرح مزاحمت کی اور اکابر فکر کو ملزم و مجرم قرار دیا۔ یہ سب کچھ علم و تحقیق کے نام پر کیا جارہا ہے اور ان لوگوں کو پوچھنے والا کوئی نہیں جو تاریخ فکر کے محسن ہیں جن کی عظیم و محترم شخصیتوں نے مشرق کو سربلند کیا۔ — قرون وسطی کی مدرسیت کے عقل دشمن انداز نظر کے خلاف بیکن نے اعلان کیا تھا کہ "مذہب کے آسمانی اسرار کو انسانی عقل کے مطابق بنانے کی کوشش فضول ہے۔" ہمارے یہاں بھی صدیوں سے یہ انداز نظر اپنی اعجوبہ آفرینیوں میں مصروف ہے لیکن کون ہے جو بیکن کی اسبات کو دہرا سکے۔! دیکھا جائے تو یہ فرض فلسفہ کانگریس ہی پر عائد ہوتا ہے اس کے نمائندوں کو محسوس کرنا چاہئیے کہ وہ فلسفے کے عظیم الشان ادارے سے وابستہ ہیں وہ اس تحریک سے تعلق رکھتے ہیں جس نے سقراط، برونو اور شہاب الدین مقتول کو جنم دیا جو افلاطون، ارسطو، شیخ الطائفہ فارابی، شیخ الرئیس ابن سینا اور ابن رشد سے منسوب ہے۔ فلسفہ انسانی ذہن کی انتہائی جرأت کا نام ہے کیا پاکستان فلسفہ کانگریس کے اکابر اس سے اختلاف کریں گے — ؟ تھی سی ڈیڈس کی تحریروں میں ہمیں یہ جملے ملتے ہیں "ہم حسن کے دلدادہ ہیں لیکن اپنے مزاج میں سادہ ہم اپنے ذہنوں کو ترقی دیتے ہیں لیکن ہماری جرأت میں کوئی کمی نہیں ہوتی" ———— لیکن ہمارے یہاں ذہنی ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ جرأت فکر قطعاً مفقود ہو جائے۔ اس وقت پاکستانی قوم اپنے اساسی عہد میں ہے قوم کے دانشوروں کو اس وقت اپنے فرض میں کوتاہی سے کام نہیں لینا چاہیئے وہ فرض کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ عقلیت پرستی کے رجحان کی ترویج اور جذبات زدگی کی مزاحمت کی جائے اور اس کے لئے جرأت فکر کی ضرورت ہے۔ فلسفہ قومی، نسلی اور عقیداتی اعتبارات سے بلند ہو کر حیات و کائنات کو سمجھنے اور سمجھانے کی بے لوث اور غیر جانبدارانہ کوشش و کاوش کا نام ہے۔ مناسب ہے کہ ہم یہاں فلسفے سے تعلق کچھ وضاحتیں پیش کریں، فیلوسوفیا (فلسفہ) کے لغوی معنی عشق حکمت یا دانش دوستی کے ہیں۔ ابتدا میں یہ لفظ اپنے وسیع ترین مفہوم کے لحاظ سے ذہنی ترقی اور ان تمام کوششوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا جو کسی تازہ علم کو حاصل کرنے کے لئے کی جائیں یہ لفظ ہمیں سب سے پہلے ہیروڈوٹس کی کتابوں میں ملتا ہے "کری سس" ایک جگہ سولن سے کہتا ہے کہ "ہم نے تیری حکمت اور ان مسافرتوں کے بہت سے قصے سنے ہیں جو تو نے حکمت کی محبت اور دنیا کو دیکھنے کی خواہش میں اختیار کیں" دیکھا جائے تو لفظ فلسفہ کے اصطلاحی تعین سے بہت پہلے ہی اس کا مفہوم متعین ہو چکا تھا چنانچہ اس سادہ اور غیر اصطلاحی عبارت میں وہ تمام مفاہیم موجود ہیں جن کی تفصیل و توضیح بعد میں ہوئی۔ اس کے ذریعے ہم فلسفے کے کردار کو بھی سمجھ سکتے ہیں اور اس کے اصطلاحی مفہوم کو بھی، سقراط اپنے آپ کو۔ سوفسطہ یعنی حکیم کہلوانے کے بجائے از راہ انکسار فیلسوف یعنی حکمت دوست کہلوانا پسند کرتا تھا افلاطون اور ارسطو نے اس لفظ کو خالص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا چنانچہ ارسطو نے سائنس سے تعبیر کیا ہے یہاں ہمیں رواقی مفکروں کو فراموش نہیں کرنا چاہئیے۔ جنہوں نے اس کو ایک بالکل متعین اصطلاح کی حیثیت دینے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے بسمرد کی رائے میں فلسفہ زندگی کی ترتیب و تنظیم کا فرض انجام دیتا ہے۔ وہ نیکی کا دوست اور بدی کا دشمن ہے۔ کرسچین ولف کے نزدیک وہ تمام اشیائے موجودہ کا امکانی علم ہے کانٹ کہتے ہیں کہ فلسفہ

عقلی علم ہے جو تصورات سے ماخوذ ہو۔ ہے، جی فشٹے کی رائے ہے کہ فلسفہ علم کا علم ہے اور ہیگل اسے مطلق کا علم قرار دیتے ہیں۔ فلسفے کی جو بھی تعریف ہو بہر طور وہ انسانی فکر کا علم ہے اس سے قطع نظر کہ فکر کرنے والا کس عقیدے سے تعلق رکھتا ہے۔ بس ہمیں چاہیئے کہ اسے انسانی ذہن کی ایک غیر جانبدارانہ فعلیت سے تعبیر کریں۔ فلسفے کو اپنے جذبات اور اپنی خواہشوں کا تابع بنانا اسے فنا کر دینے کے برابر ہے۔ پاکستان کے فلسفیانہ حلقوں کو چاہیئے کہ وہ اس کی اصل معنویت کو ذہن نشین کرکے اپنے اُن عظیم الشان فرائض کو انجام دینے کی کوشش کریں جو قوم کے ذہنی نمائندوں کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتے ہیں۔ ہم کیا چاہتے ہیں ۔ ؟ ہم کچھ بھی چاہتے ہوں لیکن علم وہ سب کچھ بھی چاہتا ہے یا چاہ سکتا ہے جو ہم نہیں چاہتے۔ اس نکتے کو ملحوظ رکھ کر ہی ہم مسائل و معاملات کے ساتھ عملی اور نظری طور پر انصاف کر سکتے ہیں اور اگر ہم اس کے لئے تیار نہیں تو پھر ہمیں فلسفے کے نام کو رسوا کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ ہم نے جس انداز نظر کی اب تک مخالفت کی ہے اس کی ذمہ داری در اصل پاکستان فلسفہ کانگریس پر نہیں ہے بلکہ ان لوگوں اور ان اداروں پر ہے جو عقلیت پرستی کے خلاف تبلیغ میں مصروف ہیں اور عقل کو شیطان کا شعار قرار دیتے ہیں۔ البتہ فلسفہ کانگریس پر یہ ذمہ داری ضرور عائد ہوتی ہے کہ وہ اس گروہ کے خلاف ایک زبردست محاذ بنائے اس لئے کہ وہ عقل کے سب سے زیادہ اہم ادارے یعنی فلسفے کی نمائندگی کرتی ہے۔

اُردو یونیورسٹی

پاکستان میں ایک ایسی یونیورسٹی کے قیام کی شدید ترین ضرورت ہے جس میں قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت حاصل ہو در اصل یہ وہ کم سے کم مطالبہ ہے جو قوم کی طرف سے پیش کیا جا سکتا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ مغربی پاکستان کی ہر یونیورسٹی کو اردو یونیورسٹی ہونا چاہیئے۔ اردو یونیورسٹی کی تحریک تقریباً دو سال سے جاری ہے اور بابائے اردو اس سلسلے میں برابر کوشاں ہیں خوشی کی بات ہے کہ اب قوم کے نوجوان طبقے میں بھی اس اہم بیحد اہم مسئلے سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ اردو کالج کے باشعور اور قوم پرست طلبہ اور طالبات نے بابائے اُردو کی سرپرستی میں کام شروع کر دیا ہے۔ اردو یونیورسٹی کے قیام کی اس تحریک میں پاکستان کے تمام طلبہ ان کے ساتھ ہیں۔ ان قابل احترام نوجوانوں کو یہ جاننا چاہیئے کہ اگر انہوں نے اس عظیم کام میں کامیابی حاصل کر لی تو ایک تاریخی کارنامہ انجام دیں گے اور پاکستان کی تاریخ میں اُن کا نام جلی حروف سے لکھا جائے گا۔ امید ہے کہ وہ اپنی مساعی کو خلوص اور عزم کے ساتھ جاری رکھیں گے۔

سرورق
ایک مغربی تصویر جو
مشرقی انداز یاد دلاتی ہے۔

جالِ نذرِ دلفریبی عنواں کئے ہوئے

میں آپ کے اس حق کیلئے ہمیشہ لڑتا رہوں گا کہ آپ مجھ سے اختلاف رائے کر سکیں
(والٹیر)

غلام عباس ۔ ہاؤسنگ سوسائٹی ۔ کراچی

جناب جون ایلیا صاحب ۔ السلام علیکم

جنوری کے انشا میں پاکستان رائیٹرز گلڈ کراچی کے اجلاس کی روئداد نظر سے گزری۔ اس سلسلے میں دو ایک غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ منٹو کے ذکر میں میں نے موپاساں کا نہیں بلکہ سومرسٹ ماہم SOMERSET MAUGHAM کا نام لیا تھا۔ شاید آپ صحیح طور پر سن نہ سکے[1]۔ موپاساں کہانی کا جگت استاد ہے۔ اور میں نے بارہا اسی حیثیت سے اس کا ذکر کیا تھا۔

۲۔ جس اطالوی ادیب کا میں نے ذکر کیا تھا اس کا نام "پنڈ دلیو" نہیں بلکہ پیران ڈیلو ہے۔ پورا نام انگریزی میں یوں ہے۔ Luigi Peran dello

۳۔ آپ نے افسانے کی جو تعریف مجھ سے منسوب کی ہے وہ ادھوری ہے[2]۔ میں نے تو کہا تھا۔

"ہر وہ بات جو آپ کے مشاہدے میں آئی ہو۔ اور آپ نے اس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا ہو۔ یا زندگی کا کوئی ایسا رخ جو آپ نے دیکھ لیا ہو۔ مگر جو عام طور پر لوگوں کی نظروں سے پنہاں رہتا ہو۔ اس کو بس اسی طرح لکھ ڈالیے جس طرح آپ نے دیکھا یا محسوس کیا ہو۔ اور افسانہ مکمل ہے۔"

بنیاد حسین زیدی پیکر داسلی ڈائرکٹر نیشنل سیونگز خیرپور میرس

محترم جون ایلیا صاحب

نومبر کا "انشا" نظر نواز ہوا۔ اختر انصاری اکبر آبادی صاحب کی ایک غزل شائع ہوئی ہے جس کا مطلع ہے۔

دل کو ہے سکون سا کچھ دعا کے ساتھ ساتھ ؎ اجنبی سا ہے کوئی آشنا کے ساتھ ساتھ۔ پہلے اور دوسرے مصرعے میں لفظ "سا" کی تکرار کی گئی ہے لیکن ان معنوں میں وہ بجائے تکرار ملیح کے تکرار قبیح کی صورت میں نمودار ہوئی ہے۔ پہلے مصرعے میں لفظ "کچھ" محض حشو ہے اور دونوں مصرعوں میں دو لختی کا بھیانک عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں اجنبی اور آشنا کے لفظی تضاد سے دل اور دعا میں وجہ تشبیہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن دونوں مصرعوں کو پڑھ کر انتہائی تلاش کے باوجود ثبوت تشبیہ کہیں نظر نہیں آتا

---

[1] مذکورہ روئداد جناب سحر انصاری نے لکھی ہے۔ ایلیا

[2] یہ غلطی دراصل مجھ سے سرزد ہوئی کہ میں نے کچھ سطریں کم کر دی تھیں۔

اور شعر قطعاً بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ پہلے مصرعے میں لفظ سکون میں نون کا اعلان قطعاً خلافِ قواعد ہے۔
دورِ حاضر میں نوجوان شعرا زیادہ تر جگریت سے متاثر نظر آتے ہیں۔ تضادِ الفاظ کے ساتھ ساتھ وجہ شبہ پیدا کرنا اس اسکول کا خاص موضوع ہے لیکن آرٹ کی اس صنف میں ایک اختراعی اور انفرادی عنصر قطعاً مفقود ہوتی ہے جس کی وجہ سے غزل محض کورانہ تقلید ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس غزل کا دوسرا شعر ہے۔

رخ پہ بھی ہیں سرخیاں دست دِپا کے ساتھ ساتھ خوں مل رہے ہو کیا تم حنا کے ساتھ ساتھ

دوسرے مصرعے میں "حنا ملنے" کا محاورہ شاید "تیل ملنے" کی مناسبت سے "خون ملنے" کے ساتھ ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے ورنہ اہلِ زبان "مہندی لگانے" کے علاوہ "مہندی ملنا" بھی کبھی نہیں بولتے۔ شعر کا مفہوم یہ ہوا کہ محبوب اپنے ہاتھ اور پاؤں پر مہندی لگا رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا۔ عاشق دل خوں گشتہ اس سے پوچھتا ہے کہ "تم خون میں گھول کر حنا تو نہیں مل رہے ہو؟ دست دپا کو خون آلودہ کرنے سے چہرے پر سرخی پیدا ہونے میں کوئی رابطہ نہیں۔ یہ دور واقعیت اور منطقی استدلال کا ہے اور اس قسم کے خون پانی ایک کر دینے والے اشعار کی طرف توجہ قطعاً مبذول نہیں ہوتی۔ تیسرا شعر ہے۔

دور تک ہے خواجگی دور تک ہے بندگی نقشِ سر ہیں دور تک نقشِ پا کے ساتھ ساتھ

دونوں مصرعوں میں لفظ دُور کی تکرار تین بار کی گئی ہے اور شعر ثقالت گرانی اور نقص روانی کی وجہ سے کہیں دور جا پڑا ہے۔ دوسرے مصرعے میں "نقش سر" کی ترکیب قطعاً مہمل اور بے معنی ہے اہل زبان ہمیشہ نقشِ جبیں یا نقشِ سجدہ لکھیں گے۔ چوتھا شعر ہے۔

سینکڑوں خداؤں سے گو نجات مل گئی آج کل خدائی ہے ایک خدا کے ساتھ ساتھ

پہلے مصرعے میں لفظِ "گو" کا واؤ کھینچ کر پڑھا جاتا ہے جو قطعاً خلافِ فصاحت ہے۔ دوسرے مصرعے میں حرفِ ثبوت مگر کا آنا ضروری تھا۔ چھٹا شعر ہے۔

رُخ پہ موجِ رنگ ہے موجِ رنگ میں عتاب جانستانیاں بھی ہیں دل ربا کے ساتھ ساتھ

دوسرے مصرعے میں "دل ربا" کے بجائے "دل ربائیوں" کے ساتھ ساتھ کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ بہ صفت شکل قافیہ لایا گیا ہے جس کی پہلے مصرعے کے لوازمات۔ کوئی توصیفی مناسبت نہیں شعر مستعار تراکیب اور تکرارِ الفاظ کا ایک مکروہ مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ موجِ رنگ اور نقابِ رنگ جیسی ترکیبوں کا بے محل استعمال اکثر شعرا کی غزلیات میں دیکھنے میں آتا ہے۔

رئیس امروہوی صاحب کی غزل بھی بہ لحاظِ جدت مضامین اپنے اندر کوئی جاذبیت نہیں رکھتی۔ "توعبث عذرِ خواہ ہے پیارے"، جیسی پامال اور فرسودہ زمینوں میں شعر کہنا رئیس صاحب کے شایانِ شان نہیں خصوصاً جبکہ قافیے اور ردیف میں تنافر کی شدید جھلک پائی جاتی ہے۔ "عشق سے دلبری کی داد نہ چاہ عشق خود داد خواہ ہے پیارے"۔ لفظ "چاہ" اور "خود داد خواہ" پر غور کیجئے۔ تنافر اور ثقالت بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ عبدالعزیز خالد کی نظم یونانی فنونِ لطیفہ کا ایک دلچسپ شاہکار ہے۔ موجودہ دور کا ہنستا بولتا انسان دو ہزار سال قبل مسیح کے طلسمی ماحول میں پہنچ جاتا ہے۔ فی زمانہ زبان کو "تیغ ہند" اور "ذلارام رطب البیان" جیسی تراکیب کی ضرورت نہیں۔ ایک مصرعے پر تشنگی کی بھی رہ گئی ہے "پھول ہے نامسالہ نہ ہی عطر آلود پانی کا ظرف" زبان اور بیان پر شاعر کو مکمل عبور نہیں۔ اس قسم کی

دیو مالائی نظمیں نہ شائع کی جائیں تو بہتر ہے

...ود - کراچی

محترمی جون صاحب!

"کراچی کی ادبی سرگرمیاں" (جو بیک وقت مضمون، رپورتاژ، طنزیہ اور سحر انصاری صاحب کے روزنامچے کے پریشان اوراق کا مجموعہ ہے اور جسے غالباً آپ کا قسطوں میں چھاپنے کا ارادہ ہے) دیکھ کر ہمت بندھی کہ کیوں نہ میں بھی اپنے نام کو پکی سیاہی سے چھپوانے کے شوق کو پورا کر کے ادیبوں کی صف میں شامل ہو جاؤں۔ دراصل ہر فن کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں۔ اور ہر فنکار کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان کو جانے، سمجھے اور ایک حد تک ان پر عمل پیرا ہو۔ خواہ وہ شاعر ہو یا بت تراش، افسانہ لکھتا ہو یا رپورتاژ، تنقید نگاری کرتا ہو یا طنز نگاری۔ جہاں تک اس آخری صنف کا تعلق ہے۔ یہ تو بڑی ہی کٹھن ہے۔ اگر وسیع النظری اور ایمانداری نہ ہو تو صرف ایک جملہ بات کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے۔ مانا کہ جانچنے والا ہر چیز اور ہر شخص کو اپنے معیار سے جانچے گا۔ مگر کچھ عام اور عالمگیر معیار بھی ہوتے ہیں۔ اور ان کو آسانی سے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس لمبی چوڑی تفصیل کی ضرورت اس لئے پڑی کہ بدقسمتی سے میں بھی کراچی میں رہتا ہوں اور ادب کا طالب علم ہونے کی وجہ سے ان انجمنوں کی نشستوں میں جاتا ہوں جن کی روداد سحر صاحب نے لکھی ہے۔ اگر سحر انصاری صاحب اس مضمون کا عنوان "کراچی کی سرگرمیاں اور میں" رکھتے تو مجھے اس خامہ فرسائی کی جرأت نہ ہوتی۔ اور اسے ایک نیا تجربہ کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا تھا لیکن موجودہ صورت میں اس مضمون کو اتنی آسانی سے نظر انداز کر دینا کراچی کی ادبی انجمنوں اور خود سحر صاحب کے ساتھ ناانصافی ہوگی اس لئے موزوں ہوگا کہ میں سحر صاحب کے اقتباسات ہی سے کچھ نتائج فراہم کروں۔ حقیقت کو چھپا کر باتوں کو اس انداز سے لکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ شریف آدمیوں کی پگڑی اچھلے۔ مثلاً موصوف لکھتے ہیں "سجاد باقر رضوی اچھی نظمیں کہتے ہیں، ادبی حلقوں میں بہ حیثیت شاعر متعارف ہیں لیکن اس دن مقالہ پڑھ کر وہ نقادوں کی صف میں بھی آ گئے" سبحان اللہ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ سجاد باقر رضوی کل کا لونڈا شعر وعر تو کہتا ہی تھا۔ اب نقاد بھی بن گیا۔ اور تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سحر صاحب سے دست بستہ صرف یہ عرض ہے کہ بھائی خاموش رہنے میں آدمی کا بھرم قائم رہتا ہے۔ آپ کو حکیم نے نسخہ میں تو نہیں لکھا کہ شعر کہنے کے ساتھ ساتھ نثر کی طرف بھی متوجہ ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ محنت سے مطالعہ کریں اساتذہ اور کلاسیکی ادب کا پڑھنا تو ان سے بہت بڑا مطالبہ ہوگا۔ اگر وہ صرف اپنے علاوہ دو چار سال پہلے ہی کی چیزوں کو پڑھ لیتے تو اس قسم کے جملوں سے احتراز کرتے۔ یہ بالکل الگ سی بات ہے کہ سجاد باقر کس حیثیت کے نقاد ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ ان کا پہلا مضمون تو نہیں۔ اس کے بعد موصوف کا تبصرہ ملاحظہ ہو: "اقبال کے بارے میں کہے گئے آخری الفاظ بڑے دلچسپ تھے۔" اور پھر "مجھے ذاتی طور پر اس مقالے میں کئی باتوں سے اختلاف تھا۔ اور بعض باتیں تو بہت عجیب سی لگیں۔ مثلاً بڑا شاعر الفاظ سے پنجہ کشی کرتا ہے۔ اصغر کی شخصیت ان کے اشعار میں نمایاں نہیں" وغیرہ۔ اب کون سحر صاحب سے کہے کہ مولانا آپ کے اختلاف یا اتفاق سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور اس قسم کے سرسری سے جملے تو سب ہی کہتے ہیں۔ اگر اپنے متعلق آپ کو کوئی غلط فہمی ہے تو اصغر کو باقاعدہ پڑھ کر سجاد باقر رضوی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے آپ بھی ایک مضمون لکھ لیجئے۔ ادب کا میدان ہے یہاں قاری بازی گری سے مرعوب نہیں ہوتا

اور آپ کی ذاتی رائے اُس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

اس کے بعد موصوف نے حلقہ ارباب ذوق کی روداد بڑے افسانوی انداز سے پیش کی ہے جس کا مرکزی کردار شروع سے آخر تک وہ خود ہیں۔ "میں اور س۔م۔ مولت پاکستان آرٹ کونسل کی عمارت میں پہنچے" "ہاں صاحب" میں نے کہا۔ اور پھر یہ کہ "ہم اگر اس بات پر بحث کریں کہ ججوں نے صرف نثر ہی کو انعام کا مستحق کیوں قرار دیا تو یہ بحث بھی بالکل بے معنی ہوگی۔ اس لئے کہ وہ ججوں کی اپنی پالیسی ہے اور ہم سب اس سے قطعی طور پر ناواقف ہیں کہ وہاں کن حالات اور کن اسباب کو پیش نظر رکھ کر انعام دیا گیا ہے" جہاں تک میری سماعت (جس پر مجھے ضرورت سے زیادہ بھروسہ ہے) اور حلقہ اوباب ذوق کی کارروائی کا تعلق ہے۔ یہاں بھی موصوف نے بات کو غلط انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے صادق مدہوش صاحب کی ابھی خاصی معقول بات کو توڑ مروڑ کر خواہ مخواہ مضحکہ خیز بنایا ہے صرف اگلے جملے کو ہم تک پہنچانے کے لئے کہ انہوں نے خود کیا کہا۔ ویسے بھی مدہوش صاحب نے کافی سمجھداری کی بات کہی تھی۔ کہ ہم بہ حیثیت قاری آدمجی پرائز پر گفتگو کریں اور پھر اسکے بعد موصوف کی یہ بات کہ وہ ججوں کی پالیسی سے ناواقف ہیں کچھ مہمل ہی ہے۔ مجھے پتہ نہیں کہ موصوف کی صادق مدہوش صاحب سے پرانی لاگ ہے یا نہیں بہرحال اگر ہو بھی تو یہ جگہ دل کی بھڑاس نکالنے کی نہیں تھی۔ ان کی پُرجوش آواز کا ذکر بڑے ڈرامائی انداز سے کیا گیا ہے۔ جس کا اُس نشست سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ مدہوش صاحب نے بڑے حسین انداز میں لذتیت کی تشریح کی تھی اور اسی ضمن میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی کتاب "لیڈی چیٹرلیز لور" کا حوالہ بھی دیا تھا کہ وہ کتاب جو تیس سال سے فحش مانی جاتی تھی آخر کار فحش نگاری کے الزام سے بری قرار دے دی گئی ہے "(اتفاق سے دوسرے دن اخبارات میں نہیں" بلکہ کئی ہفتہ پہلے فیصلہ دیا جا چکا تھا) اور یہ تو پڑھنے والے کے ذہن پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کا اثر کیسے قبول کرتا ہے"۔ موصوف نے صرف دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کو اپنے نام سے منسوب کرنے اور کچھ باتوں کی اختراع پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ آخر میں چلتا ہوا جملہ بھی مدہوش صاحب کے سر چپکا کر فرمائشی قہقہہ لگوا دیا۔

جون صاحب کہیں کہیں میرا لہجہ سخت ضرور ہو گیا ہے جس کی معذرت چاہوں گا۔ صادق مدہوش یا سجاد باقر رضوی صاحب کی طرفداری میرا منشا نہیں۔ لیکن ادبی دیانتداری کی خاطر یہ سطور آپ تک پہنچانا میں نے اپنا فرض منصبی سمجھا۔

رفیعہ قدسی ۔ لاہور

جنوری ۱۹۶۱ء کے شمارے میں جناب امیر امام صاحب کی نظم بڑی فکر انگیز ہے۔ اس کامیاب نظم پر انہیں میری طرف سے مبارکباد پہنچا دیجئے "انشاء" اب واقعی خوب ہوتا جا رہا ہے۔ مضامین کی نیرنگی و رنگارنگی آپ کی جدت فکر کی آئینہ دار ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اتنے خوبصورت سرورق برصغیر میں کسی ادبی ماہنامے نے نہیں پیش کئے۔ عبدالعزیز خالد نے گیتانجلی کا ترجمہ اتنی خوبصورتی سے نظم کیا ہے کہ انہیں بے ساختہ داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ ڈاکٹر شفاعت نقوی کا مضمون "قتل لاشعور کے اشارول" پر بہت دلچسپ ہے میری گذارش ہے کہ ڈاکٹر موصوف اس عجیب و غریب بیماری پر مزید کچھ تحریر فرمائیں۔ ناانصافی ہوگی اگر میں آپکے بلند پایہ فکری و علمی اداریوں کے بارے میں کچھ نہ کہوں۔ آپ خوب اور بہت خوب لکھتے ہیں۔

زکی عباس

شرم تم کو مگر نہیں آتی ؟

تمہارے بزرگوں نے عظیم الشان تحریکیں چلائیں ——— اُن کے فلک شگاف
نعروں سے آج بھی ایوان تاریخ گونج رہا ہے ——— عہد آفریں اداروں، دبستانوں
اور دانش گاہوں کی بنیادیں رکھیں ——— کفن پہن کر رسن و دار سے گزرے ———
اپنے خون میں تیر کر آزادی کی جانکاہ منزل کو سر کیا ——— لیکن قوم کے ہونہار
نوجوانو ——— ! ہمیں تم سے پوچھنا ہے کہ تم نے اب تک اپنا کونسا فرض انجام دیا تم
نے تاریخ کے کتنے قرضے چکائے۔ تم جو زمانے کو صرف کوسنا جانتے ہو ———
اور قوم کی نازنین و عشوہ طراز بیٹیو تم بھی جواب دو کہ تم نے آخر کیا سوچا ہے ——— ؟
تم جو آنے والی نسل کی ماں ہو ——— (ادارہ)

آپ نے اپنے شہر میں بہت سی عورتوں کو ایک عجیب و غریب لباس پہنے دیکھا ہوگا۔ اس لباس کے شوخ رنگ، چست و تنگ بند، نرالی وضع قطع اور باریکی و نزاکت کے مجموعی تاثر کو محسوس کر کے یا تو آپ نے اپنی نگاہیں نیچی کر لی ہوں گی یا پھر ——— !

یہ لباس یوں تو کسی خصوصیت کا حامل نہیں لیکن اس کو دیکھکر ذہن، اس منفی رجحان کی طرف ضرور متوجہ ہو جاتا ہے جو آج مغربی ملکوں کی معاشرتی زندگی کو تہ و بالا کئے ہوئے ہے۔ یہ منفی رجحان، فلموں، راک ان رال اور ٹیڈی بوائیز تحریک جیسے محرکات کی پیداوار ہے درحقیقت یہی وہ منفی رجحان ہے جو امریکی طالبعلموں کو اس امر پہ اکساتا ہے کہ وہ رات کی تاریکیوں میں طالبات کی ——— خوابگاہوں پر شب خون ماریں اور ان کے زیر جامے چرالائیں ——— یہی وہ رجحان ہے جو مغربی ممالک کے فوجیوں کو اس امر پر اکساتا ہے کہ وہ جاپان سے منتقل ہوتے وقت، وہاں کی سڑکوں پر دو لاکھ ناجائز بچّوں کو لاوارث چھوڑ جائیں ——— !

یہ معمولی سا مسئلہ ——— درحقیقت بڑا سنگین مسئلہ ہے ہم سب کو چاہیئے کہ اس موضوع پر ہر پہلو اور ہر نقطۂ نظر سے روشنی ڈالیں تاکہ
بشمن روزادل" کے مطابق اس مہلک ترین رجحان کا خاتمہ کر دیا جائے جو اگر وسعت و ترقی پا گیا تو ہمارے اس رہے سہے قومی تصورِ معاشرت
بجیاں بکھیر کر رکھ دے گا جو ابھی تعمیر و تشکیل ہی کی منزل میں ہے ——— !

"خالی ذہن، شیطان کا گھر ہوتا ہے" ناکارہ ذہن جب راہ فرار اختیار کرتے ہیں تو وہ رد ـــ معجز نمائیاں کرتے ہیں کہ الامان والحفیظ ـــ
یہ نئے نئے شوق، یہ جدت طرازیاں، یہ مفت کی رنگینیاں، یہ نگاہ بازیاں یہ بے مقصد سرگرمیاں کچھ بھی نہیں محض پٹی پٹائی ذہنیت، احساس
ست ابیکاری، محرومی، قنوطیت، ذہنی پسماندگی اور معاشرے سے فرار کا بڑا ابھر کیلا اظہار ہیں، یہ احساس کمتری کا وہ روپ ہے جو احساس
ی کا سہارا لیتا ہے !

ہم میں سے کون نہیں جانتا کہ آہستہ آہستہ ہمارے معاشرے کی معاشی بنیادیں بدل رہی ہیں اور اسی تبدیلی کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے
جی تصورات اور تہذیبی رسم و رواج بھی اپنی پرانی کینچلیاں اتار رہے ہیں۔ بارہا ہماری آنکھوں نے یہ منظر دیکھا کہ ایک تیز رفتار موٹر کا ڈرائیور
منے جانے والے سست رفتار چھکڑے کی سستی برداشت نہیں رہاہے، مغرب زدہ جینٹلمین! اپنے ایک ایسے عزیز کا مذاق اڑا رہے ہیں جنہوں
شرقی ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں، دہلی کے لال قلعے کی طرح برجیوں والا برقع پہننے والی خواتین ——— سڑک پار کرنے کا معرکہ انجام دے رہی
ی، ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے محنت کش، ایک ہی کارخانہ کی چھت کے نیچے کھڑے ہوئے ملکی پیداوار بڑھا رہے ہیں مختصر یہ کہ
را معاشرہ سکڑ رہا ہے، ہمارے رہن سہن، سوچنے سمجھنے، اٹھنے بیٹھنے اور ملنے جلنے میں روز بروز تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور پھر سنہ ۴۷ء کی تقسیم و
قال آبادی نے برصغیر کی انسانی آبادی و معاشرت کو بالکل اسی طرح الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے جس طرح کوئی شوقین مزاج جیٹورا، جامنوں یا
سوں کو دو بڑی بڑی پلیٹوں کے درمیان رکھ کر اور جھٹکے دے دے کر بالکل ہی حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ ہمارے حال میں ماضی کی باقیات اور
نقبل کی توقعات کچھ اس طرح گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ ہم اپنی جدید تہذیبی قدروں کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں۔ ہم حال میں سانس لینے پر
ور ہیں مگر ماضی کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے مستقبل کی جانب پیش قدمی کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اگر آج ہم ماضی کی چند بر خود غلط، رسوم و
دسے چھٹکارا حاصل کر لیں تو مستقبل کی تعمیر کر سکتے ہیں، لیکن ان رسوم و قیود سے تو جب ہی نجات ملے گی جب صدیوں پرانا جاگیردارانہ نظام،
ی تمام برائیوں کے ساتھ یکسر دور کر دیا جائے اور صنعتی نظام کی برکتیں حاصل کی جائیں۔ لکڑی کے ہل کی جگہ ٹریکٹر چلے، مٹی کے دیے کی جگہ بجلی
بلب جلے، گاؤں کا اجڈ گنوار، سائنسی رموز پڑھے، عورت، مرد کا ہاتھ بٹائے، ملک میں کارآمد ہاتھ اور سوچنے والے دماغ بڑھیں، پیداوار بڑھے
نعتی ادارے بڑھیں، شرح ملازمت بڑھے، روزگار کا تحفظ ہو ——— تاکہ ماضی کی تاریکیوں کو چیر کر مستقبل کا سورج اپنی اصلی اور مکمل
کل میں طلوع ہو، اور ہم سب کو ماضی کی فرسودہ قدروں سے نجات ملے ——— لیکن ہماری بدقسمتی اور زمانے کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ ہم اپنی
صلاحیتوں کو ان بنیادی اور حقیقی مقاصد کے حصول کے لئے نہیں بلکہ فروعی نمائشی اور دکھاوے کی باتیں پوری کرنے میں صرف کر رہے ہیں - !

اصلیت یہ ہے کہ آج علمی، معاشرتی، مذہبی، ادبی، سائنسی، اخلاقی اور سیاسی مختصر یہ کہ ہر میدان میں ترقی تو ضرور ہو رہی ہے کہ سماجی
ارتقا اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت ہے لیکن یہ ترقی قابل اطمینان اور کچھوے کی رفتار سے زیادہ نہیں ——— حالانکہ مسئلہ اب یہ ہے کہ اس
لتی ہوئی معاشرت اور تہذیب کی جگہ ہم ایسی تہذیب و معاشرت کو اپنائیں جو مشرقی پسماندگی اور مغربی بیہودگیوں سے پاک ہو، لیکن آج کل
ہم جس تہذیب و معاشرت کو اپنائے ہوئے ہیں کیا وہ واقعی ایسی ہی ہے؟ اس سوال کا صحیح جواب تلاش کرنا ضروری ہے۔ یوں تو سڑکوں پر چلتی پھرتی

لاشوں پر ایک نظر ڈال کر رائے قائم کرلینا بڑا آسان ہے لیکن اس چمکنے دمکنے والے بھڑکدار ماحول کے پس منظر کی تاریکیوں پر نظر رکھنا دوسری بات ہے
اگر ہم واقعی صحیح جواب تلاش کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بحیثیت مجموعی اس نئے معاشرے کا جائزہ لینا پڑے گا جس کے متعلق یہ حقیقت صرف کہنے سننے، یا لکھنے پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ شدت سے محسوس کرنے کی ہے کہ آج وہ قومی کردار ناپید ہے جو پاکستان کی ترقی واستحکام میں ممد ومعاون بنے ——— آج کے بچے اور آج کے جوان ان خوابوں کی تعبیر نہیں ہیں جو ہمارے بزرگوں نے دیکھے تھے ——— !

قوم کے وہ نونہال جنہیں ابتدائی اسکولوں میں بنے ہوئے باغوں کی خوبصورت روشوں پر چہل قدمی کرنی چاہیئے، گندے اور بوسیدہ گلی کوچوں میں دن بھر کانچ کی گولیاں اور گلی ڈنڈا کھیلنے، گالیاں دینے اور کسی فلم کا پروگرام بنانے میں مصروف رہتے ہیں، وہ بچے، جو قدرتاً معاشی الجھنوں سے بے پرواہ رہنے چاہئیں ہمارے اور آپ کے سامنے فٹ پاتھ اور سواری کی بسوں میں مٹھائی کی گولیاں کنگھے، اخبارات، ماچس اور غبارے وغیرہ بیچ کر اپنا پیٹ بھرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

وہ طلبا جنہیں بڑھتے ہوئے ملکی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے دن رات مطالعہ کرنا چاہیئے یا تو طالبات کی درسگاہوں کے دروازوں پر کھڑے ہوئے اس بات کے منتظر ہیں کہ چھٹی کے بعد طالبات کو بس اسٹینڈ یا اگر ممکن ہو تو درِ دولت تک پہنچا کر آئیں یہ نہیں تو خود کالج کی حدود میں کسی ستم پیشہ کا دامن پکڑ کے اور آنکھوں میں آنسو بھر کے مائل بہ کرم کر۔تے پر تُلے ہوئے ہیں، وہ طالبات جنہیں ہر دم اور ہر لمحہ بڑھتی پھیلتی اور بدلتی ہوئی دنیا میں ایک ایسی نسل کی تعلیم وتربیت کرنی ہے جو پاکستان کو صف اول کی مملکتوں میں جگہ دلائے، اپنا فرض منصبی ادا کرنے کے بجائے ——— دوپٹہ کی علت اور اس کے استعمال سے قطع نظر اُسے رسی کی طرح بل دے کر سر کے ارد گرد یا گردن کے چاروں طرف افعیٔ زہرناک کی طرح لپیٹے ہوئے ہیں گویا زلفوں کا مارِ سیاہ ان حسینوں کے جذبۂ خودنمائی کی تسکین کے لئے کافی نہ تھا جو بیچارے دوپٹے کی یہ گت بنی ! میرا مدعا یہ نہیں کہ صرف دوپٹہ ہی عفت وعصمت اور تہذیب وشائستگی کی نشانی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ نئے دور کی وہ عورت جو پائیلٹ، ڈرائیور، نرس، ڈاکٹر، کھلاڑی، تیراک یا اداکارہ بنے وہ دوپٹہ اوڑھے ہی اوڑھے یا وہ غرارہ اور قمیص پہنے ہی پہنے ——— لیکن پہناوا یا ملبوس ——— انسان کی نفسیات، فکر اور رجحان طبع کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کسی لباس سے بناوٹ، اتراہٹ تصنع، اور ایک حد تک بے ضمیری کی عکاسی ہونے لگے تو لباس کی افادیت ظاہر اور مقصد معلوم !

اور تو اور خدا جھوٹ نہ بلوائے، نئی نسل کی ہونے والی ان نگہبانوں کو تو میری چشم گنہگار نے گھنٹوں آئینے کے سامنے بیٹھ کر درسگاہ جانے کے وقت اپنی پیشانی کے آگے زلف بکھیرنے کے لئے اتنا محو ومصروف دیکھا ہے کہ یا تو چھوٹی قینچی سے کٹتے کٹتے بیچاری زلف پُرپیچ کو ہی درجۂ شہادت مل گیا یا پھر درسگاہ جانے کا وقت ختم ہوگیا ——— اور اگر محنت و ریاضت کرتے کرتے مہارت حاصل ہوگئی ہے تو چشم زدن میں فرح اسٹائیل کے بال بنا کے ملکہ فرح دیبا اور پونی ٹیل بنا کر گھوڑی بننے سے تو کوئی روک ہی نہیں سکتا ——— اب رہ گئی چہرے کی لیپا پوتی ——— تو بس کچھ نہ پوچھئے طبیعت مکدر ہو کر رہ جاتی ہے ؎

یہ غازہ، ذوقِ زیبائش کا ساماں ہی سہی لیکن — یہ غازہ حسن کے بے جان جلووں کا جنازہ ہے

مجھے علم جمالیات کی باریکیوں سے انکار نہیں۔ میں انسان کی جمالیاتی حس کا اقرار کرتا ہوں، لیکن میرے نزدیک لباس کی وہ چمک دمک اور اجوبہ پن قابل مذمت ہے جو بذات خود زیبائش کے مقصد ہی کو ختم کردے ——— وہ میک اپ قابل نفرت ہے جس سے چہرہ تو مسخ ہو جائے یا پھر ترغیب محض بن جائے ——— اگر خواتین کے بٹووں کے اندر پورا سنگاردان موجود ہو اور مردوں کا یہ فرض بن جائے

وہ دیدارِ حسن کے لئے کعبۂ حسن کا طواف کرتے رہیں تو ایسے احساسِ جمال سے توبہ ہی بھلی۔

حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلآرام را

ابھی پچھلے دنوں میں صدر کے چوراہے پر کھڑا پالش کرا رہا تھا کہ اتنے میں کچھ گڑبڑ سی ہوئی مڑ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ دو عورتیں عجیب وضع قطع کا لباس پہنے جا رہی تھیں۔ ایک محترمہ نے پتلی موری کا پتلون اور چست و تنگ جرسی پہن رکھی تھی اور دوسری صاحبہ کا لباس تھا تو مشرقی لیکن اس لباس کی باریکی کا یہ عالم تھا کہ اس پر "ہوا کے لباس" کا گمان ہوتا تھا۔ دونوں عورتیں کچھ اس انداز سے چل رہی تھیں جیسے کوئی حلوائی جلیبیاں توڑ رہا ہو مستی کا یہ عالم تھا کہ اب نہیں تو جب ان کا ایک ایک انگ الگ الگ ہو جائیگا سڑک پر ایک ہجوم ـــ پولیس والے بھی محو تماشا ـــ پالش والا، پالش کرنے سے غافل ـــ نہ جانے وہ عورتیں کن بدقسمت بچوں کی مائیں، کن بدتمیز شوہروں کی بیویاں، کن بے غیرت بھائیوں کی بہنیں اور کن بے حس ماؤں کی بیٹیاں تھیں کہ یوں عورت ہو کر ـــ عورت کی تذلیل کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بیکار و آوارہ مردوں کا غول، توبہ توبہ ـــ اس تفصیل کی ضرورت اس لئے پڑی کہ آپ اس پس منظر میں ان چند نوعمر بچوں اور بچیوں کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگائیں جو اپنے ننھے منھے ہاتھوں میں کتابیں سنبھالے ـــ پھٹی پھٹی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں ـــ کیا یہ بچیاں اپنی سادہ اور پر عظمت یونیفارم کا تقدس ـــ اور اپنی فطرت کی پاکیزگی برقرار رکھ سکیں گی؟

وہ نوجوان بھلا کیا کریں گے جو اس روح فرسا ماحول میں کسی بھی قسم کی صحت مند ـــ سرگرمیوں سے یکسر محرومی کی وجہ سے ایسی ایسی گندی اور عریاں تصویریں خریدتے ہیں کہ اگر کوئی جمالیاتی ذوق رکھنے والا ان تصویروں کو دیکھ لے تو اسے مرد و عورت کے صحت مند ازدواجی تعلقات ہی سے نفرت ہو جائے جب ملک و وطن کے کوچہ و بازار میں ہر دوکان اور ہر ٹھیلے پر لگے ہوئے اشتہاری بورڈوں پر عورت کو عریاں سے عریاں انداز میں پیش کرنے پر کوئی قانونی یا سماجی پابندی نہیں ہے تو عورت کے لئے احترام کا جذبہ کہاں سے آئے؟ جب کسی درسگاہ کا معلم اعلیٰ اپنی نوعمر طالبہ کو نہ جانے کیا کچھ منتر پڑھا کر رام کر لینے کی مثال پیش کرے تو کیا اس کے شاگرد اس کی تقلید نہ کریں گے؟ جب جوان و صحت مند اور تندرست و توانا جسم جہالت کی بدولت نیک و بد میں تمیز کرنے اور بیکاری کی بدولت گھریلو زندگی گزارنے کے قابل نہ ہوں تو ان کے جسموں میں پکنے والے گرم گرم لاوے کی نکاس کس طرح ہوگی؟

یہ سوال بڑے عجیب ہیں، بڑے انوکھے ہیں مگر انہیں عجیب اور انوکھے سوالوں کے صحیح یا غلط جوابات پر ہماری تہذیب، ہمارے اخلاق اور ہمارے معاشرہ کے امن و سکون کا دارومدار ہے! معاشی تنگدستی، معاشرتی پستی، ذہنی کم مائیگی اور جنسی گھٹن کو اگر دور نہ کیا گیا تو معاشرہ اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا چلا جائیگا ـــ ہمارے یہاں صحت مند تعلیمی، اور سماجی تفریحات اور سرگرمیاں نہیں، اجتماعی تقریبات کا نام و نشان نہیں، ڈرامائی، ادبی، فنی اور ذہنی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع نہیں۔ تہذیبی مراکز اور ثقافتی محل نہیں بھٹکے ہوئے ذہنوں کو راہ راست پر لانے والی کوئی عظیم شخصیت یا کوئی معاشرتی تحریک نہیں تو پھر یہ خالی الذہن انسان اندھی اور اوٹ پٹانگ حرکتیں نہ کریں گے تو پھر آخر کیا کریں گے۔؟

اگر ہمیں اپنے معاشرہ میں پھیلنے والی ان وباؤں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے تو باقاعدہ قومی اور ملکی بنیادوں پر سوچنا اور منصوبہ بنانا پڑے گا۔ تہذیبی اور معاشرتی میدان میں ہماری ضرورتیں اور خواہشیں صرف اسی وقت پوری ہو سکتی ہیں جب سماجی ڈھانچے کا مرکز یعنی معاشی نظام ملکی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ اس طرح تشکیل و ترتیب دیا جائے کہ ہمارے تعلیمی، معاشرتی، سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی مسائل کا حل پیش کر سکے جس میں معاشرے کا ہر فرد اپنی صلاحیت کے مطابق ملک و قوم کی خدمت کرنے کا موقع حاصل کر سکے جس میں معاشرے کے ہر فرد کو اپنی اپنی مخصوص صلاحیتوں

فروری ۷۶ء

کراچی

سیدہ شاہدہ زمانی

سورج کی قربان گاہ پر

ایک وحشیانہ رسم

یہ لوگ سورج کو پوجتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک انتہائی وحشیانہ رسم جاری ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ مہینے میں ایک بار بستی کی سب سے زیادہ حسین دوشیزہ کو سورج کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔

کچھ سال پہلے کی بات ہے کہ امریکہ کے چند فوجی افسر اس کام پر مامور ہوئے کہ جنوبی امریکہ کے افسانوی اور طلسماتی شہر ال دورادو کا سراغ لگائیں چنانچہ یہ لوگ کوہ انگازیا کی طرف روانہ ہوئے۔ اس فوجی مشن کی تحقیقات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عجیب و غریب شہر کے بارے میں جو کہانیاں جنوبی امریکہ میں ایک زمانے سے مشہور چلی آرہی ہیں انہیں غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یوں تو بہت سے سیاح اور مہم جو انگازیا کی پہاڑیوں کو عبور کر کے ال دورادو کا مشاہدہ کرنے میں کامیاب ہوئے مگر ان میں صرف ایک ہی ایسا خوش نصیب شخص تھا جو اس خاص علاقے تک پہونچا جہاں ال دورادو کے قبیلے آباد ہیں اور پھر وہاں سے صحیح و سالم واپس آگیا۔ اس نے واپس آکر اس شہر کے بعض حیرت ناک اور وحشت انگیز واقعات بیان کئے ہیں۔ یہ شخص ڈاکٹر سیسل لونٹ ہے۔

ڈاکٹر لونٹ ال دورادو کی تحقیق و تفتیش کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے ان کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ اس علاقے پر سے پرواز کرتے ہوئے گزر جائیں اور صرف یہ معلوم کر سکیں کہ آیا اس عجیب و غریب شہر کی کوئی اصلیت ہے بھی یا نہیں ـــ؟ جس وقت ان کا طیارہ کوہسار اندیز کے جنگلوں پر پرواز کر رہا تھا تو بالکل اتفاقی طور پر اس کے ساتھ حادثہ پیش آگیا۔ ڈاکٹر لونٹ اور ان کے رفیق انجینئر البرٹ میلر جنگل کے وسط میں گر پڑے قسمت اچھی تھی۔ جو ڈاکٹر لونٹ بچ گئے مگر انجینئر البرٹ ہلاک ہو گئے۔

ڈاکٹر کو اس حادثے کے نتیجے میں جو مشکلیں برداشت کرنا پڑیں وہ ناقابل بیان ہیں۔ وہ بیچارے کئی دن یکہ و تنہا ان ہولناک جنگلوں میں حیران و پریشان پھرتے رہے انہیں کئی دن بھوکا اور پیاسا رہنا پڑا۔ آخر کئی دن کی جاں کاہ محنت و جستجو کے بعد جنگل سے نکلنے کا راستہ نظر آیا وہ اسی راستے پر طویل ترین مسافت قطع کر کے ایک اجنبی بستی کی سرحد پر جا نکلے اور بستی میں داخل ہو گئے اب وہ پوری طرح سمجھ چکے تھے کہ میں اسی پُر اسرار شہر میں چل رہا ہوں جس کے قصے جنوبی امریکہ کے بچے بچے کو یاد ہیں۔

ڈاکٹر لونٹ بیان کرتے ہیں کہ یہ شہر ایک بہت بڑی پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ پہاڑی کے اوپر ایک عظیم الشان مندر بنا ہوا ہے جس کا گنبد خالص

سونے کا   ہے اور دور سے نظر آتا ہے۔ مندر کے اطراف میں بستی آباد ہے جس کا سلسلہ پہاڑی کے دامن میں دور تک چلا گیا ہے۔ یہاں کے باشندے بے حد حسین، صحت مند اور بلند قامت ہیں ان کے لباس پر عموماً سونے کے بیل بوٹے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ سورج کو پوجتے ہیں۔ روزانہ ظہر کے وقت اپنے گھروں پر یا مندر جاکر سورج کی عبادت کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں بڑی ہی وحشت ناک رسمیں پائی جاتی ہیں۔ ان رسموں میں سب سے زیادہ مہیب رسم کنواری لڑکیوں کو ذبح کرنا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ چھ مہینے میں ایک بار بستی کی سب سے زیادہ حسین اور صحت مند دوشیزہ کو بڑے مندر میں سورج کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے قربانی کے دن سورج نکلنے سے پہلے بستی کے تمام باشندے مندر کے باہر جمع ہوتے ہیں اور سورج نکلتے وقت ایک خاص قسم کی عبادت شروع ہوجاتی ہے۔ ظہر کے وقت عبادت اور دعاؤں کی آوازیں بہت بلند ہوجاتی ہیں اور عین اس جوش و خروش کے عالم میں ایک کنواری لڑکی جو حسن و دلکشی میں ساری بستی کا مول ہوتی ہے مندر کے اندر لائی جاتی ہے اور اس کے بعد مندر کا سب سے بڑا کاہن آتا ہے اور قربانی کے فرائض انجام دیتا ہے۔

ڈاکٹر لونٹ سیسیل نے اس وحشیانہ رسم کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ دوپہر کے بعد مندر کے باہر جب پوجا کرنے والوں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئیں تو میں نے دیکھا کہ چند قوی ہیکل لوگ ایک حسین ترین لڑکی کو پکڑے ہوئے لائے اور ہجوم کے درمیان سے گزرتے ہوئے مندر میں داخل ہوگئے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انسانوں کی سرزمین پر کسی اتنی حسین دوشیزہ کے ساتھ بھی ایسا ظالمانہ برتاؤ کیا جاسکتا ہے ——!

وہ لڑکی ان کے پنجے سے نکلنے کی کوشش کررہی تھی بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص گہری نیند کے عالم میں باربار چونک اٹھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ جان بچانے کی جو کوشش کررہی ہے وہ صرف فطری تقاضے پر مبنی ہے۔ تحفظ حیات انسان کی فطرت ہے البتہ جہاں تک ارادے اور شعور کا تعلق ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کے اس عمل میں ارادے اور شعور کا دخل نہیں تھا۔ وہ گویا غنودگی کے عالم میں تھی۔ بات یہ ہے کہ بستی کی صدیوں پرانی رسم کے مطابق تمام حاضرین (جن میں اس کے ماں باپ اور عزیز و اقارب بھی شامل تھے) اور خود اس کے نزدیک یہ واقعہ غیر معمولی اور خلاف توقع نہیں تھا اور گویا یہ ایک ایسی بات تھی جسے ہر صورت میں ہونا ہی تھا وہ تقاضائے فطرت کے مطابق اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتی رہی مگر نتیجہ بالکل ظاہر تھا۔ وہ قوی ہیکل لوگ اسے پکڑے ہوئے سنگ مرمر کے چبوترے پر لے گئے اور زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اسی وقت مندر کا بڑا بوڑھا کاہن جو اپنی ہیئت اور حلیے سے بہت مہیب نظر آتا تھا چبوترے پر نمودار ہوا اس کے ہاتھ میں ایک چوڑے پھل کا چمکدار خنجر تھا۔ دعاؤں کا شور برابر بڑھتا جارہا تھا۔ اس شور کے عالم میں کاہن لڑکی کی طرف بڑھا۔ ایک بجلی سی چمکی اور خنجر کا پھل لڑکی کے سینے میں تیر گیا۔ اب اس شور میں اس کنواری کی دو ایک دردناک چیخیں بھی شامل تھیں۔ اس کے بعد کاہن نے اس کا دل خنجر کے ذریعہ پہلو سے جدا کیا، دل میں ابھی تک حرکت باقی ہے جو اُسے نکال کر سورج کی شعاعوں میں رکھ دیا گیا تاکہ آفتاب پرستی کی یہ رسم مکمل ہوجائے۔

یہ ایک ایسے قبیلے کا ذکر ہے جسے ہم اور آپ وحشی کہتے ہیں لیکن ان لوگوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے جو اس عہد میں تہذیب و ترقی کے پروردگار قرار دیئے جاتے ہیں۔ تہذیب کے یہ خداوند انسانوں کو تباہ اور ہلاک کرنے کی جو کچھ تیاریاں کررہے ہیں کیا دنیا کا کوئی بھی وحشی ترین قبیلہ اس کی مثال و نظیر پیش کرسکتا ہے۔ جنوری میں امریکہ کے سابق صدر آئزن ہاور نے ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۲ء کے لئے اپنا جو آخری بجٹ پیش کیا ہے اس میں بیالیس ارب اکانوے کروڑ ڈالر جنگی سروسامان اور تیاریوں کے لئے رکھے گئے ہیں۔ یہ رقم کل بجٹ کے پچاس فیصدی حصے سے بھی زائد ہے۔

جنوبی امریکہ کے ایک قبیلے کی یہ رسم یقیناً اتنا ہولناک حادثہ نہیں ہے جتنا کہ امریکی حکومت کا یہ جنگی اہتمام۔

ڈاکٹر لونٹ جب اس طلسم خانۂ وحشت سے واپس ہوئے تو ان کے ساتھ زر و جواہر کا ایک انبار تھا۔ واپسی پر انہوں نے وہاں کے جو چشم دید حالات اور قصے بیان کئے انھیں سُن کر لوگوں کو وحشت بھی ہوئی اور اس عجیب بستی میں جانے کی خواہش بھی اس لئے کہ ڈاکٹر لونٹ کے

محمد مہدی

عالمی سیاست کے تیس ۳۰ دن

اِس ماہ عالمی سیاست پر ایک تبصرہ پیش کیا
جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

(ادارہ)

۲۹ دن ——— الجزائر کا مقدمہ ——— کانگو ———

لاؤس ——— کیوبا ——— کروڑپتی صدر ———

۲۹ دن

انتیس دن ا——— سنہ ۱۹۶۰ء بھی تمام شمسی سالوں کی طرح ۳۶۵ دن کا تھا۔ ان ۳۶۵ دنوں میں تین سو چھتیس ۳۳۶ دن معمولی حیثیت کے دن تھے۔ ——— عام دن ——— البتہ پچھلے سال کے ۲۹ دن ضرور ایسے تھے ——— جو بین الاقوامی تعلقات اور عالمی سیاسیات کی دنیا میں اگر صدیوں نہیں تو برسوں یقیناً یاد رہیں گے اور مختلف طریقوں سے مختلف موقعوں پر ان بیتے ہوئے دنوں کا تذکرہ کیا جائے گا۔ پہلے ان انتیس ۲۹ دنوں کے نقشے پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ !

۲۴ جنوری سنہ ۱۹۶۰ء الجزائری وطن پرستوں کا ڈی گال کی حکومت کے خلاف عام جہاد

۱۳ فروری صحارا کے میدان میں فرانسیسیوں کا پہلا ایٹمی تجربہ جس نے تمام افریشیائی علاقوں میں سنسنی پھیلا دی۔

۲۱ مارچ افریقی نیگروز کی بغاوت

۹ اپریل جنوبی افریقہ کے سفید وزیر اعظم پر قاتلانہ حملہ۔

۲۵ اپریل سنہ ۱۹۶۰ء چین کے خلاف نہرو کا پہلا مخالفانہ اعلان

۲۷ اپریل کوریا کے امریکہ پرست صدر ریی کا صدارت سے استعفا۔

۵ مئی خروشیف کا اعلان کہ امریکہ کے طیارے U.2 کو روسی سرحدوں میں گرا لیا گیا ہے امریکہ کا انکار

۷ مئی ماسکو سے امریکہ کے U.2 ہوائی جہاز کے ہواباز فرانسس پاورز کی گرفتاری کا اعلان۔

۱۶ر مئی سنہ ۱۹۶۰ء U.2 طیارے کے حادثے کے سبب پیرس میں چار بڑوں (خروشیف۔ آئزن ہاور۔ ڈی گال اور میکمیلن) کی کانفرنس کی ناکامی۔

۲۳ر مئی — اسرائیلی حکومت کا اعلان کہ لاکھوں یہودیوں کے قاتل "آئشمین" کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

۲۷ر مئی — ترکی میں فوجی انقلاب!۔ جلال بایار اور عدنان مندریس کی حکومت کا خاتمہ۔

۱۶ر جون — آئزن ہاور کے دورۂ جاپان کی منسوخی

یکم جولائی — روسیوں نے امریکہ کے ایک اور جاسوسی طیارے (RB-47) کو مار گرایا۔ کانگو کی آزادی کا اعلان

۶ر جولائی — نوآزاد شدہ کانگو میں فوجی بغاوت

۹ر جولائی — اگر امریکہ نے کیوبا پر حملہ کیا تو روس راکٹ استعمال کرے گا۔ (خروشیف)

۱۴ر جولائی — کانگو کی خانہ جنگی میں یو این کی مداخلت

۸ر اگست — لاؤس (ہند چینی) کی مغرب نواز حکومت کے خلاف عوامی بغاوت۔

۱۹ر اگست — امریکہ کے U.2 طیارے کے ہواباز پاورز کو روسی عدالت کی طرف سے دس سال کی سزا۔

۵ر ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء — محب وطن لومومبا کے خلاف مغرب نواز صدر کاساووبو کی بغاوت۔ لومومبا کی برطرفی۔

۱۴ر ستمبر — کانگو میں کرنل موبوتو کی فوجی حکومت کا قیام۔

۱۹ر ستمبر — یو۔ این کے اجلاس میں خروشیف کی شرکت

۲۰ر ستمبر — تیرہ افریقی ریاستوں کی یو این میں شمولیت

۲۲ر ستمبر — نیم ترقی یافتہ ملکوں کو مزید مالی امداد دی جائے گی۔ (یو این میں آئزن ہاور کا اعلان)

۲۳ر ستمبر — یو۔ این کے سکریٹری جنرل ہیمرشولڈ کی برطرفی کا مطالبہ (خروشیف)

۱۹ر اکتوبر — کیوبا کے خلاف امریکہ کی اقتصادی جنگ

۱۶ر نومبر — امریکی تجویز: نیم ترقی یافتہ ملکوں کی امداد میں تخفیف

۲۰ر نومبر — جاپان میں برسراقتدار پارٹی کی انتخابات میں کامیابی

۹ر دسمبر — الجزائر میں ڈی گال کا دورہ اور الجزائری مسلمانوں اور فرانسیسی نوآبادکاروں میں خونریزیاں۔

۳۰ر دسمبر — لاؤس میں شمالی ویت نام کی طرف سے کمیونسٹوں کی یلغار اور لاؤس کی خانہ جنگی کا نقطۂ عروج۔

یہ ہیں وہ ۲۹ دن — جو عالمی سیاسیات کی تاریخ میں بہت دنوں تک سنہ ۱۹۶۰ء کی یاد تازہ رکھیں گے۔ آپ ان یادگار ۲۹ دنوں میں حسبِ [illegible] تاریخوں کا بھی اضافہ کرسکتے ہیں۔ مثلاً ۲ر فروری ۶۰ء کو امریکی نیگروز نے سفید فاموں کے خلاف وسیع پیمانے پر مظاہرے کئے۔ ۲ر مئی ۶۰ء کو دنیا کے مجرم مصنف چیس مین کو بارہ سال کی قانونی کارروائیوں کے بعد موت کی سزا دی گئی یا ۱۳ر جولائی ۶۰ء کو ڈیماکریٹک پارٹی کی طرف سے امریکہ کے عہدہ کے لئے کینیڈی کی نامزدگی پھر ۸ر نومبر کو باقاعدہ صدارتی انتخاب کے بعد نکسن کی شکست اور کینیڈی کی کامیابی۔ جس نے عالمی سیاسیات میں نئے نئے اور نئے اندیشوں کا دروازہ کھولا۔

ان تاریخوں کی روشنی میں ایک مرتبہ پھر سنہ ۱۹۶۰ء کے واقعوں اور حادثوں کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بین الاقوامی کشمکش کے دائرے دور دور پھیلتے جارہے ہیں۔ الجزائر؟ — افریقہ کا دور دراز شمالی مغربی کنارہ۔ کانگو؟ وسط افریقہ سے جنوب کی طرف ہٹا ہوا خطہ اور۔ لاؤس؟۔ ال سے کئی ہزار میل دور مشرقی ریاست۔ بس یوں سمجھئے کہ مغرب اور جنوب مشرق کے کونے میں۔ جو دو براعظموں (ایشیا۔ افریقہ) کو پیٹ میں دبا بیٹھا ہے۔ ٹھنڈے لوہے کی لڑائی جاری ہے اور طاقتور دیو آپس میں الجھ رہے ہیں۔

الجزائر کا مقدمہ

دس لاکھ فرانسیسی مدعی علیہ اور نوے لاکھ سے زیادہ عرب و بربر مدعی۔

مقدمہ یہ ہے کہ فرانسیسی آبادکاروں نے الجزائر کی تمام زرخیز زمینوں پر قبضہ کر رکھا ہے اور عرب و بربر۔ جو زمین کے اصلی بیٹے ہوتے ہیں یا محتاجی پر مجبور ہیں یا فرانسیسی جاگیروں میں کھیت مزدوری پر۔ اس مقدمے کی دو سب سے بڑی شہادتیں زبانی ہیں۔ یعنی دو نعرے۔ ایک نعرہ وہ جو ۹۰ لاکھ مسلمانوں کی زبان پر ہے۔ ویو۔ لی۔ ایف۔ ایل۔ این (vive le F.L.N) یا حزب الاستقلال الجزائر زندہ باد اور دوسرا نعرہ جسے فرانسیسی آبادکار دہرا رہے ہیں۔

الجزائر فرانسیسیوں کے لئے!

چارلس ڈی۔ گال۔ زندہ باد

پانچ سال سے یہ نعرے ایک دوسرے کے خلاف بلند ہو رہے ہیں اور الجزائر کے ہر گوشے میں فرانسیسی آبادکاروں اور مسلمانوں کے درمیان خونریز جھڑپیں جاری ہیں۔ لیکن آخر ڈی گال مجبور ہوا۔ آخر الجزائر میں رائے شماری کرائی گئی۔ رائے شماری میں۔ دو تجویزوں کے متعلق عوام کی رائے معلوم کی گئی تھی۔

الجزائر مکمل طور پر آزاد ہو جائے؟

آزاد الجزائر۔ فرنچ یونین کا جزو ہے؟ ۔

۵۰ فیصدی الجزائری فرانسیسیوں نے ووٹ دیا کہ بے شک الجزائر کو آزادی کا اک موقع دینا چاہیئے۔ مسلمانوں نے رائے شماری میں مجموعی طور پر حصہ نہیں لیا کیونکہ وہ سوچی اور سچی آزادی سے کم اور کسی سمجھوتے پر راضی نہیں۔ تاہم انھوں نے مقدمہ جیت لیا۔ چارلس ڈی گال کی حکومت (پانچویں فرانسیسی ری پبلک) مجبور ہو گئی کہ الجزائری وطن پرستوں (F.L.N) سے ہوشمندی کے ساتھ معاملہ کرے۔ الجزائر شمالی (مغربی) افریقہ کا بڑا وسیع خطّہ ہے۔ جسکے شمال میں طرابلس الغرب (ٹیونیشیا) شمالی مغربی گوشے میں مراقش۔ مغرب میں ویسٹ افریقہ۔ مشرق میں لیبیا۔ مغربی جنوبی گوشے میں نوآزاد شدہ مسلم ریاست ماریطینیا اور جنوب میں نیجر کا خطّہ واقع ہے۔ الجزائر کی جلاوطن حکومت۔ (FLN) کے سربراہ فرحت عباس ہیں۔ جن کی پشت پر ایشیا۔ افریقہ اور جنوبی امریکہ کے دوارب انسانوں کے علاوہ سوویت یونین جیسی طاقتور حکومت موجود ہے!

آزاد الجزائری حکومت کے سربراہ فرحت عبّاس نے جو گذشتہ ہفتے انڈونیشیا کا دورہ کر رہے تھے۔ جنرل چارلس ڈی گال کی حکومت کے سامنے۔ الجزائر کے مستقبل کے سلسلے میں حسب ذیل تجویزیں پیش کی ہیں۔

فرانس کی مقبوضہ فوجیں الجزائر سے واپس بلالی جائیں اور پھر۔ الجزائر کے عوام سے آزادی و استقلال کے بارے میں رائے لی جائے بہر حال یہ بات طے ہے کہ الجزائر کی مکمل آزادی کا لمحہ بہت قریب ہے۔ ۹۰ لاکھ عرب اور بربر پانچ سال سے آزادی کی راہ میں جو قربانیاں دے رہے ہیں وہ رائیگاں جانے والی نہیں۔ خود فرانس کا دانشور طبقہ۔ الجزائری عربوں کے مقصد سے متفق ہے۔ چنانچہ۔ پال سارتر۔ اور دوسرے ادیبوں نے حکومت فرانس کے سامراجی ہتھکنڈوں کے خلاف زبردست احتجاج کرتے ہوئے الجزائر کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا ہے۔

کانگو

کانگو۔ جنوبی افریقہ کا ملک ہے۔ انگولا۔ نائیجریا۔ سوڈان۔ حبش۔ کینیا۔ ٹانگانائیکا۔ جنوبی رہوڈیشیا اور نیاسالینڈ سے گھرا ہوا۔

کانگو کا مسئلہ آخر ہے کیا؟۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں۔ یوروپی آباد کاروں کے گروہ ایشیا اور افریقہ کے وسیع خطوں میں پھیلتے جا رہے تھے۔ ان میں برطانیہ فرانس۔ جرمن۔ پرتگال۔ اسپین۔ اٹلی۔ ہالینڈ اور بلجیم خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ انگریز نے کرۂ ارض کے سب سے بڑے حصے پر ہاتھ مارا۔ فرانسیسیوں نے اپنی کم ہمتی کے سبب "کم" پر اکتفا کی یعنی صرف ۵۰ لاکھ مربع میل پر۔ اسی طرح یورپ کے ہر سامراجی ملک نے کسی نہ کسی کمزور ملک کو ہڑپ کر لیا۔ بلجیم نے جنوبی اور وسطی افریقہ کے علاقے دبا لئے۔ اس طرح پورا براعظم افریقہ پہلی جنگ عظیم سے قبل انگریزوں، فرانسیسیوں، جرمنوں، ہسپانیوں، اطالیوں، اور بلجیمیوں کے درمیان تقسیم ہو چکا تھا۔ بلجیم کا کانگو کا علاقہ نہایت زرخیز اور قدرتی دولتوں سے مالا مال ہے۔ کہا نہیں جا سکتا کہ بلجیم کے سامراجیوں نے کس دل کے ساتھ اس کی آزادی و خود مختاری کی دستاویزات پر دستخط کئے ہونگے۔ بہر حال انکی بدنیتی میں شبہ نہیں۔ کیونکہ کانگو کی آزادی کے پہلے دن (یکم جولائی) سے اب تک یہ بدنصیب ملک خانہ جنگیوں اور طرح طرح کی بیرونی اور اندرونی دشواریوں سے نجات نہ پا سکا۔ اس وقت کانگو میں۔ اقوام متحدہ کی بیس ہزار فوج (جو مختلف ملکوں اور قوموں کے دستوں پر مشتمل ہے) قیام امن کے لئے موجود ہے۔ اس فوج پر اب تک ۵۰ کروڑ روپے کے قریب خرچ ہو چکا ہے۔ سامراجی بلجیم کی مسلسل یہ کوشش رہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح کانگو کے اقتصادی اور معدنی فائدوں سے محروم نہ ہو۔ خود بلجیم کا شمار بھی یورپ کے خوشحال ملکوں میں ہوتا ہے۔ بلجیم کی صنعتیں اعلیٰ درجے کی ترقی یافتہ اور اس کے کارخانوں کے لئے ارزاں کچا مال اس کی افریقی نو آبادیاں فراہم کرتی رہی ہیں۔ مگر اب صورتحال کا نقشہ پلٹ رہا ہے اور بلجیم کی معاشی و صنعتی زندگی پر کانگو کے ہاتھ سے نکل جانے کے اثرات واضح ہونے لگے ہیں۔ چنانچہ صرف پچھلے سال۔ اس کی صنعتی پیداوار میں ۲ فیصدی کی تخفیف ہوئی ہے۔ کانگو کی آزادی کے نتیجے میں سرکاری آمدنی ۲۱۵ ملین ڈالر کم ہو گئی۔ سال گذشتہ بلجیم کی سالانہ آمدنی دس ملین یا دس ارب ڈالر تھی۔ لیکن سنہ ۱۹۶۰ء کے آخر میں اس آمدنی میں ۴ء۵ فی صدی کی تخفیف رونما ہوئی۔ در حقیقت اسی اقتصادی انحطاط کے پیش نظر بلجیم کی کوشش ہے کہ کانگو (خصوصیت کے ساتھ صوبہ کٹنگا) پر اسکی اقتصادی گرفت ڈھیلی

نہ ہونے پائے۔ کرنل موبوتو کی فوجی حکومت جو "لومبا" کو معزول و گرفتار کرکے برسرِ اقتدار آئی ہے خود بھی حیران ہے کہ ان زبردست سیاسی الجھنوں کو کس طرح سلجھائے کانگو کے جمہوری وزیرِ اعظم "پیٹرک لومبا" کے ساتھ کرنل جوزف موبوتو اور صدر کاساوُوبو نے جو سلوک کیا ہے نیز موبوتو کی فوجی حکومت (بلجیم کے اشاروں پر) کانگو میں جمہوریت کی جس طرح مٹی پلید کر رہی ہے اس نے افریشیائی گروپ کو سخت برافروختہ کر دیا ہے بس انتہا ہے اقوامِ متحدہ کا سکریٹریٹ بھی انکے مظالم کے خلاف چیخ اٹھا جو پیٹرک لومبا پر روا رکھے گئے ہیں۔ کٹنگا کا صوبہ اب تک کانگو کی مرکزی حکومت سے کٹا ہوا ہے اور قوم پرست لومبا — الزبتھ ویل کے مقام پر کہیں قید ہیں۔ کانگو کے علاقہ "اسٹن لے ویل" میں لومبا کے حامیوں نے اپنی (نام نہاد) حکومت بھی قائم کر رکھی ہے۔ غرض افریقہ کا یہ نوآباد ملک اپنی ہی آگ میں جل رہا ہے اور اس کی چنگاریاں اڑ اڑ کر دور دور تک جا رہی ہیں۔ اس وقت کانگو کی حیثیت یہ ہے کہ وہ پوری افریقہ کے مزاج کو سمجھنے کے لئے تپش پیما (تھرمامیٹر) کی حیثیت اختیار کر گیا ہے سنہ ۱۹۶۰ء میں ۱۷ نوآباد قومیں افریقہ کے نقشے پر ابھریں انکے مسئلے صاف اور سادے ہیں یورپ کے سامراجی گدھ ان کی لاشوں سے اسوقت اڑے جب سارا گوشت پوست کھرچ چکے تھے۔ اب ہڈیوں کے پنجر باقی رہ گئے ہیں — افریقہ کی نوآزاد قومیں — بھوکی، ننگی، پچھڑی — کسی انجان مستقبل کی طرف رواں دواں —

لاؤس۔

مغربی افریقہ سے کئی ہزار میل دور پورب میں۔ لاؤس کی سرزمین پر بھی خانہ جنگی کا جوالا مکھی شعلے اگل رہا ہے لاؤس کے شمال میں۔ نارتھ ویت نام سے گذر کر ایشیا کی سب سے بڑی کمیونسٹ طاقت۔ سرخ چین۔ واقع ہے۔ مغرب میں برما۔ جنوب مغرب میں تھائی لینڈ (سیام) اور جنوب میں ساؤتھ ویت نام یہاں مشرق اور مغرب کی طاقتیں ایک دوسرے سے الجھی ہوئی ہیں۔ لاؤس تین حصوں میں منقسم ہے کمیونسٹوں کے ہمدرد۔ مکمل آزادی کے خواہش مند اور امریکی امداد پر انحصار کرنے والے — سنہ ۱۹۴۰ء سے قبل۔ لاؤس۔ ویت نام اور کمبوڈیا۔ تینوں ملک فرانسیسی سامراج سے نتھی تھے۔ فرانس کی شکست کے بعد سنہ ۴۲ء میں جاپان نے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ دوسری جنگ عالم گیر (جاپان کی شکست ستمبر سنہ ۴۵ء) کے بعد سوال ہوا کہ ہند چینی کی ان

تینوں ریاستوں (لاؤس۔ ویت نام اور کمبوڈیا) کا حشر کیا ہو؟ فرانس نے کہا کہ یہ علاقے میرے ہیں مجھے واپس کر دو۔ ہند چینی والوں نے جواب دیا کہ نہیں — ہم بھیڑ بکری کے ریوڑ نہیں کہ مختلف چرواہوں کے ہاتھوں میں لوٹ پلٹ ہوتے رہیں۔ آخر فرانسیسیوں اور ہند چینیوں میں کش مکش شروع ہوئی۔ سنہ ۵۴ء میں جنیوا کانفرنس کے نتیجے میں لاؤس کو آزادی ملی۔ ویت نام کے دو حصے کئے گئے۔ شمالی ویت نام کمیونسٹوں کا جنوبی ویت نام قوم پرست جماعتوں کا — کمبوڈیا اور لاؤس میں بھی قومی حکومتیں قائم ہوئیں۔ اور عہدنامہ جنیوا کی شرطوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اک کنٹرول کمیشن کا قیام عمل میں

ممبر۔ انڈیا۔ تھائی لینڈ۔ کمبوڈیا) لاؤس ـــ رقبہ ۸۹۰۰۰ ہزار مربع میل
آبادی ـــ ۳۰ لاکھ۔ گھنے جنگل۔ ناقابل گذر دلدلیں اور چوڑے پاٹ کے دریا۔ امریکہ نے لاؤس کی جغرافیائی اہمیت محسوس کرکے اس کی امداد
ڈالروں کی تھیلیاں کھولدیں چھ سال میں تین سو ملین ڈالر کی امداد لاؤس کو دی گئی (دسمبر ۱۹۶۰ء میں ۴ ملین ڈالر دیئے گئے) اسکے باوجود لاؤس کے
یتھٹ لیو اپنے گوریلا دستوں کے ساتھ امریکی اقتدار کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ اگست ۱۹۶۰ء میں کمیونسٹ ہمدردوں نے کیپٹن کانگ لی کی
یادت۔ لاؤس کی امریکہ دوست حکومت کا تختہ اُلٹ کر۔ لاؤس کی راجدھانی "وِین ٹین" (VIENTIANE) میں پرنس فوما کی حکومت قائم
ی۔ ابھی نومبر ختم نہ ہونے پایا تھا کہ لاؤس کے ایک اور جاگیردار۔ جنرل فومی نوساوان نے۔ امریکہ کی مدد سے جنوبی لاؤس میں بغاوت کا جھنڈا بلند
ہ اس طرح ہند چینی کے اس اضطراب انگیز خطے میں۔ کمیونسٹوں اور غیر کمیونسٹوں کے درمیان وہ تباہ کر دینے والی کشمکش شروع ہوئی جو اس وقت
ج کے نقطے پر پہنچ گئی ہے شمالی ویت نام کی کمیونسٹ حکومت بار بار امریکہ پر یہ الزام لگا رہی ہے کہ لاؤس کی خانہ جنگی میں اس کا ہاتھ ہے۔ بالکل اسی قسم کا
ام امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی طرف سے۔ کمیونسٹ ویت نام۔ سرخ چین اور روس پر لگایا جارہا ہے اور لطف یہ ہے کہ دونوں الزامات۔ صداقت
ی ہیں۔ لاؤس میں امریکی روسی ٹکراؤ کا خطرناک پہلو یہ ہے کہ پاکستان کی طرح لاؤس بھی معاہدہ جنوبی مشرقی ایشیائی (SETO) کا رکن ہے۔ اگر
س کی جنگی صورتحال مزید خراب ہوئی تو حکومت پاکستان بھی (قانوناً) مداخلت پر مجبور ہوگی اور وہ یہ اعلان کر بھی چکی ہے اس وقت (۱۳ر جنوری
)، صورتحال یہ ہے کہ ایک طرف تو کیپٹن کانگ لی اور ان کے گوریلا دستے ہیں اور دوسری طرف مغرب نواز فومی ہیں۔ روس اور امریکہ دور بیٹھے ہوئے اپنے
روں کو لڑا رہے ہیں۔ دونوں طرف سے حریفوں کو فوجی امداد دی جارہی ہے۔ بمبار طیارے۔ میدانی توپ خانے۔ گولہ بارود کی کثیر مقداریں اور دوسرے
ہیار۔ دونوں حریفوں (کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ) کی رہنمائی امریکی و روسی ماہرین جنگ اور ٹیکنیک کار۔ کر رہے ہیں!

یوبا۔

آئیے اب لاؤس سے کیوبا چلیں۔ جنوبی امریکہ کا زرخیز ملک ـــ فیڈل کاسترو کے ہنگاموں کا مرکز ـــ شمال میں ریاستہائے متحدہ امریکہ
شرق میں "ہے تی"، HATI ـــ مغرب میں میکسیکو۔ جنوب میں نی کاراگوا NICARAGUA ـــ امریکہ کے ہاتھ پاؤں مشرق۔ مغرب اور شمال
جنوب کے ہر گوشے میں پھنسے ہوئے ہیں مگر اس کا سب سے بڑا دردِ سر کیوبا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں کیوبا میں فیڈل کاسترو برسر اقتدار آئے۔ ایک
یونسٹ گوریلا کارکن۔

فیڈل کیسترو کے برسر اقتدار آتے ہی روس نے اعلان کیا۔

کیوبا کو ہاتھ نہ لگانا

امریکہ چیخا

ہمیں مت چھونا۔

ہمیں مت چھونا کا مطلب یہ تھا کہ کیوبا میں امریکہ کا جو سرمایہ (شکر اور تیل وغیرہ کی صنعتوں میں) لگا ہوا ہے اس کے تحفظ پر اصرار کیا جائے
لیکن (کیوبا کی) نئی انقلابی حکومت نے برسر اقتدار آکر سب سے پہلے امریکہ ہی کو چھوا بلکہ چھیڑا۔ یعنی یکے بعد دیگرے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تمام
املاک اور صنعتی جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ امریکہ بہت تلملایا۔ لیکن فیڈل کیسترو کی پیٹھ پیچھے کامریڈ خروشیف کھڑے ہیں۔ حکومت ریاستہائے متحدہ
امریکہ کرے تو کیا کرے۔ خروشیف اعلان کر چکا ہے کہ اگر کیوبا کے انقلاب کو تباہ اور آزادی کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو روسی راکٹوں کے بٹن دبا دیئے

جائیں گے۔ کیوبا کی نئی انقلابی حکومت علی الاعلان۔ روس کی حلیف اور کمیونسٹ مقاصد کی حامی ہے۔ روس نے سرد جنگ کو امریکہ کی ناک کے نیچے شمالی امریکہ کی ناک کے نیچے تو ہے ہی) پہونچا دیا ہے امریکہ نے اعلان کیا کہ ہم کیوبا سے تمام سفارتی تعلقات توڑتے ہیں۔ فیڈل کیسترو نے جواب دیا خس کم جہاں پاک۔

ملیشیا (قومی فوج) کے ایک لاکھ رضا کاروں نے کیوبا کے پایۂ تخت ہوانا میں پریڈ کی۔ اور فیڈل کیسترو نے اعلان کیا کہ ریاستہائے امریکہ کا مقابلہ ٹکے سے۔ طمانچے کا طمانچے سے اور گولی کا گولی سے کیا جائے گا۔

اسی موقع پر مجمع میں ایک پٹاخہ چھوٹا۔ فیدرل کیسترو نے اسے ہولناک بم اور امریکہ کے انٹی لی جنس بیورو اور (ایف۔ بی۔ آئی) کی ایک مہیب سازش قرار دیا۔ بہر حال آج بھی۔ کیوبا کی سرزمین پر امریکہ کا ایک سمندری فوجی اڈہ GUANTANAMO میں قائم ہے اور آئزن ہاور یہ اعلان کر کے عہدۂ صدارت سے ہٹے ہیں کہ امریکہ اس اڈے سے دست بردار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا فیدرل کاسترو کی ضد یہ ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو۔ کیوبا کی سرزمین پر امریکہ کا کوئی نقش باقی نہ رہنے دیا جائے گا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

نیا صدر۔ نیا سال۔ نیا اعلان

۸ر نومبر (۶۰) سے ۱۹ر جنوری تک کم و بیش نو ہفتے ہوتے ہیں۔ یہ نو ہفتے امریکہ کے نئے۔ ڈیما کریٹک صدر کینیڈی نے کس طرح گذارے؟ — کن کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے۔ کیسی کتابیں؟

- پریسیڈنشل پاورز (صدارتی اختیارات)
- دی پالیٹکس آف لیڈرشپ (مصنفہ ریچرڈ۔ ای۔ نس ٹاٹ)

اب تک فٹز جیرالڈ نام کے صرف ایک آدمی ہی سے دنیا روشناس تھی۔ ڈاکٹر فٹز جیرالڈ۔ عمر خیام کے مشہور مترجم۔ جنھوں نے رباعیات عمر خیام کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے اس زبان کے رنگا رنگ کلاسیکی لٹریچر میں بڑا شاندار اضافہ کیا ہے۔ اب ایک اور فٹز جیرالڈ میدان میں آیا۔ جان فٹز جیرالڈ کنیڈی John FITZGERALD KENNEDY یہ بیسویں صدی کی سب سے بڑی معاشی۔ سیاسی اور تجارتی طاقت — امریکہ — کا رہ نما ہے سب جانتے ہیں کہ جان۔ ایف کنیڈی بہت بڑی دولت کے مالک ہیں لیکن کتنی دولت؟ اس کا اندازہ کسی کو نہیں۔ خود کنیڈی کو بھی نہیں ۸ر نومبر کو امریکہ کا صدر منتخب ہونے کے بعد کنیڈی نے اپنے تمام سرمائے سے اپنے کو محروم کر لیا۔ اور اس دولت قاہرہ کو (جس کی مقدار معلوم نہیں) پبلک یل اور سرکاری ضمانتوں (بونڈز) میں لگا دیا امریکہ کے نوجوان صدر اس موروثی سرمائے کے علاوہ تین اصلاحی اوقاف کے بھی وارث ہیں جو انکے والد نے ۱۹۲۶ء، ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۹ء میں اپنے متعلقین کے لئے قائم کئے تھے ان اوقاف کی آمدنی کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ سات وارثوں میں ہر ایک شخص کو ٹیکس نکالنے کے بعد سالانہ ایک لاکھ ڈالر کا منافع ملتا ہے۔

تو امریکہ کے ان کروڑپتی صدر نے ۲۰ر جنوری کو قصر سفید میں اس اعلان کے ساتھ صدارت کا حلف اٹھایا ہے کہ وہ دنیا بھر میں بھوک افلاس اور احتیاج کے خلاف لڑیں گے۔

خروشیف نے نئے صدر امریکہ کی اس افتتاحی تقریر پر انھیں مبارکبادی پیام بھیجا۔ اور دنیا بھر کینیڈی کے اس دلیرانہ اعلان سے چونک اٹھی۔ دیکھیں۔ جان۔ ایف۔ کینیڈی کی یہ جنگ کب اور کہاں شروع ہوتی ہے۔ کنیڈی کی صدارت کے بعد روسی امریکی تعلقات میں بہتری کی صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ انکا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ سوویت یونین نے امریکی طیارے R.B-47 کے ہوابازوں کو رہا کر دیا اور کنیڈی نے اعلان کیا کہ امریکہ نے روس پر جارحانہ

ادم فردوسی

محبت [illegible] !

کسے ، [illegible] اور کیسے ؟

حال ہی میں ماہر عمرانیات پروفیسر ورنج کی کتاب "انتخاب" شائع ہوئی ہے، جس میں محبت کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے ——— پروفیسر نے صحیح نتائج تک پہنچنے کے لئے نفسیات، عمرانیات اور اعداد و شمار سے مدد لی ہے ——— اُن کا خیال ہے کہ ——— محبت خود غرضی پر مبنی ہوتی ہے۔

کیا آپ بہت زیادہ مصروف رہتی ہیں ؟ ——— بہت زیادہ مصروف رہتے ہیں ——— ؟

خواہ آپ کتنے ہی مصروف کیوں نہ رہتے ہوں لیکن یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ نے محبت کے موضوع پر غور نہ کیا ہو بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ محبت کے لئے انسان نے جنت کو بھی تج دیا ہے۔ ہم اور آپ مصروف ہی صرف اس لئے ہیں کہ اپنی زندگی میں حسن، مسرت اور محبت کے رنگ بھر سکیں ——— معلوم نہیں کہ محبت کے بارے میں آپ کی اپنی رائے کیا ہے ——— ؟ ممکن ہے کہ آپ اسے ایک لافانی حقیقت سے تعبیر کرتے ہوں اگر ایسا ہے تو آپ خیال پسند شاعروں سے متاثر ہوئے ہیں۔ اُن سے متاثر ہونا بھی چاہیئے یہ بہت ہی شریف، معصوم اور مظلوم لوگ ہیں۔ انہوں نے جو ذمہ داری قبول کی ہے وہ یہ ہے کہ اس ناقص دنیا کی ناقص حقیقتوں کو ان کی اعلیٰ اور کامل ترین شکل میں دیکھیں اور دکھائیں۔ اس لئے انہوں نے محبت کو جو اُن کا محبوب ترین موضوع ہے زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ وہ ایسا کرنے میں حق بجانب بھی ہیں۔ محبت کے علاوہ آخر اُن کے پاس ہے بھی کیا۔

میں تری بارگہِ ناز میں کیا پیش کروں
میری دنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں (جون ایلیاء)

محبت ہی وہ ایک خاکہ ہے جس میں وہ قوسِ قزح کے تمام رنگ بھر دینا چاہتے ہیں یہی نہیں بلکہ اس خاکے میں اُن کا خونِ جگر بھی شامل ہے۔

محبت کے مسئلے میں نظریاتی اعتبار سے زیادہ تر لوگ شاعروں ہی کی تائید کرتے ہیں لیکن عملاً ایسا نہیں ہے عملاً عام لوگ حقیقت پسند ہوتے ہیں۔

اب محبت کے موضوع پر سائنسی انداز میں سوچا جانے لگا ہے اس لئے محبت کی حرمت اور عظمت میں کافی زوال ہو گیا ہے۔ محبت کی وہ معصومیت اور دوشیزگی جس کے تصور سے روحیں سرشار رہتی تھیں اب بڑی حد تک زائل ہو چکی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک المناک بات ہے۔ المناک اس لئے کہ جن معصوم اور

حسین غلط فہمیوں کے سہارے ہم آج تک زندگی گزارتے چلے آئے ہیں وہ دور ہوتی جارہی ہیں۔ اور ان کی جگہ سکون دل کے نئے سہارے ابھی تک وجود میں نہ آئے۔ اور یہ صورت حال دنیا کے چند "عقلمندوں" کو چھوڑ کر تمام انسانوں کے لئے ایک دلشکن حادثے کی حیثیت رکھتی ہے ـــ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں نے اُن کے حسین تصورات کو بہت کچھ مہمل کردیا ہے۔ سائنس اور نفسیات کی روشنی میں محبت کا تقریباً ہر پہلو نمایاں ہوگیا ہے اور وہ ایک واضح اور عیاں حقیقت کے طور پر سامنے آچکی ہے، آپ کہیں گے کہ اگر محبت اتنی ہی واضح سی چیز ہے تو پھر اس کے متعلق خود علمائے نفسیات میں اس قدر اختلاف رائے کیوں پایا جاتا ہے ـــ ؟

اور اب تک اُس کی کوئی جامع تعریف کیوں نہیں کی جاسکی ؟

آپ سگرٹ پیتے ہیں یا نہیں ـــ ؟

اگر پیتے ہیں تو ایک بات بتایئے۔ ! آپ کو سگرٹ پینے میں کس قسم کی لذت محسوس ہوتی ہے ـــ ! ہمیں یقین ہے کہ آپ اس لذت کی کوئی تشریح نہیں کرسکتے ـــ لیکن آپ اس کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ سگرٹ کی یہ لذت عالم بالا سے تعلق رکھتی ہے اگر آپ حقیقت پسند ہو کر سوچیں تو محبت کرنا اور سگرٹ پینا دونوں ایک ہی جیسے عمل ہیں اور دونوں ہی کی ایک سے زیادہ تشریحات پیش کی جاسکتی ہیں کسی چیز کی صرف ایک ہی تشریح پیش کرنا ایک ایسا جہاد ہے جو صرف مولوی ہی کرسکتے ہیں۔

حال ہی میں ایک یونیورسٹی پروفیسر اور ماہر عمرانیات پروفیسر ونچ کی کتاب "انتخاب" شائع ہوئی ہے جس میں محبت کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے یہ کتاب ۲۵ نوجوانوں کا مسلسل کئی سال تک مطالعہ کرنے کے بعد لکھی گئی ہے۔ پروفیسر ونچ نے صحیح نتائج تک پہنچنے کے لئے نفسیات، عمرانیات اور اعداد شمار سے مدد لی ہے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ محبت خود غرضی پر مبنی ہوتی ہے ہم اُسی شخص سے محبت کرتے ہیں جس کی شخصیت کے ذریعے ہماری اپنی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہو اس طرح ہم اپنی خامیوں، کمزوریوں اور محرومیوں کا ازالہ کرلیتے ہیں اور جو اوصاف ہماری اپنی شخصیت میں موجود نہیں ہوتے انہیں ہم اپنے محبوب کی شخصیت کے ذریعے پالیتے ہیں اس طرح دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کے اوصاف میں برابر کی حصہ دار ہوجاتی ہیں پھر ایک بھرپور محبت کا مطلب ہی یہ ہے کہ دو وجود ایک دوسرے کی ضرورت بن جائیں اور ضرورت اسی وقت بن سکتے ہیں جب اُن میں سے ایک شخصیت دوسری شخصیت کی کسی کمی کو پورا کرتی ہو۔ چنانچہ ایک مستقل مزاج سنجیدہ اور بردبار نوجوان ایک الھڑ اور شوخ لڑکی سے محبت کرے گا اسی طرح وہ نازک اور نرم شخصیت کی لڑکی جس کی یہ خواہش رہی ہوگی کہ ہمیں ایک مضبوط مستقل اور ذمہ دار شخصیت کی مالک ہوتی ایک ایسے نوجوان سے محبت کرے گی جس کی شخصیت میں مذکورہ اوصاف پائے جاتے ہوں اور اس محبت کے ذریعے دونوں کی نفسیاتی ضرورتیں پوری ہوجائیں گی پروفیسر ونچ نفسیاتی ضرورتوں کی اس تکمیل کو محبت کی اصل وجہ قرار دیتے ہیں عام طور پر جو یہ خیال پایا جاتا ہے کہ ذوق اور مزاج کی یکسانیت سے محبت پیدا ہوتی ہے وہ اس نظریئے کی روشنی میں غلط ہے۔

جب کوئی مرد ایک ایسی عورت سے محبت کرنے لگتا ہے جو اس سے قطعاً مختلف ہو تو لوگ تعجب کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "آخر اس کو اس عورت میں کیا بات نظر آئی" مگر مذکورہ نظریئے کے پاس اس بات کا جواب موجود ہے۔ ایک نوجوان پروفیسر یہ کہا کرتا تھا کہ میرے نزدیک وہی لڑکی نسوانیت کا اعلیٰ نمونہ ہے جو شرمیلی معصوم اور کم سخن ہو لیکن اس نے شادی ایک ایسی لڑکی سے کی جو بہت ہی شوخ اور شریر تھی۔ اگر ایک ہی جیسا مزاج، ماحول اور ذوق رکھنے والے مرد و عورت مل جائیں تو دو امکانات ہیں یا تو وہ محبت کریں ہی گے نہیں اور اگر کریں تو یہ محبت پروان نہیں چڑھے گی لیکن ایک تیسرا امکان بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس قسم کی محبت ایک بے مثال محبت بھی ثابت ہوسکتی ہے چنانچہ

ای تاریخی شہرت رکھنے والی محبتوں میں اس قسم کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں دنیا کے مشہور فلسفیوں اور شاعروں نے عام طور پر ایسی ہی لڑکیوں سے محبت
جوان کی ہم مذاق تھیں لیکن یہاں ایک بات کی وضاحت کردی جائے اور وہ یہ ہے کہ عظیم شخصیت رکھنے والے لوگ اپنی شخصیت کی تکمیل کیلئے
ا کسی دوسری شخصیت کا سہارا نہیں لیتے بلکہ خود اپنی ہی شخصیت کے مزید امکانات کا سراغ لگاتے ہیں اس لئے ان کی محبت عام طور پر
ت ہی کے لئے ہوتی ہے اور آدرش یا آئیڈیل کا رنگ اختیار کرلیتی ہے آپ دیکھیں گے کہ شاعروں، مفکروں، ادیبوں اور عظیم فنکاروں کے
ں افلاطونی محبت کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں۔ لیکن عام طور پر جو محبت کی جاتی ہے وہ دراصل شخصیت کی تکمیل ہی کے لئے ہوتی ہے لیکن ہم نے
فیوں اور فنکاروں کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی محبت کا تکمیل ذات سے کوئی تعلق ہی نہیں اور وہ بالکل
وث ہوتی ہے ایسا نہیں ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ان کے یہاں محبت کے ذریعے شخصیت کی جس طرح تکمیل ہوتی ہے اس کا مفہوم
مختلف ہے۔

بہرحال اب ہم پھر وہیں آجائیں بات اکثریت کے بارے میں ہو رہی تھی انسانوں کی وہ اکثریت جو زندگی میں سکون اور لذت حاصل
ے کے لئے افکار و نظریات کے بجائے بالکل سامنے کی چیزوں کا سہارا لیتی ہے دنیا کے چند غیر معمولی افراد کو چھوڑ کر تمام انسان اسی دائرے
آتے ہیں، ہم محبت اور تکمیل شخصیت کے متعلق گفتگو کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ محبت کے لئے شخصیتوں کا مختلف ہونا ضروری ہے
ض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک نوجوان اپنی محبوبہ سے شادی کرلیتا ہے ان دونوں کی شخصیت ایک دوسرے سے قطعاً مختلف
تی ہے اور پھر اسے اپنی شخصیت اور معیار کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیتا ہے مثلاً وہ خود ایک سیاسی اور سماجی کارکن ہے اور اس
اپنے ذہن میں اپنی شریک حیات کے لئے بھی یہی معیار بنا رکھا تھا چنانچہ وہ اپنی بیوی کو سیاسیات اور عمرانیات کے درس دینا شروع کردیتا
یا اسے نئی زندگی کی تربیت دی جا رہی ہے اب اگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی شریک حیات اپنی حقیقی شخصیت
ھو کر ایک نئی شخصیت کے سانچے میں ڈھل جائے گی اور "وہ" نہیں رہے گی جس سے شروع میں محبت کی گئی تھی اس طرح اگر کوئی مرد اپنی شوخ
فو شریک زندگی کو متین اور سنجیدہ بنانا چاہتا ہے یا کوئی عورت اپنے بے پروا اور لاابالی شوہر کو بہت ہی قاعدے اور قرینے کا مرد دیکھنا
تی ہے اتنا باقاعدہ اور باقرینہ کہ چیز جہاں سے اٹھائے وہیں رکھدے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایک ایسے
ب کو وجود میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں جو ایک دوسرے کی نفسیاتی اور جذباتی ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکیں گے اور ایک دوسرے
الب میں ڈھل کر آپس میں بالکل اجنبی بن جائیں گے۔

پروفیسر ونچ نے اپنے اس نظریئے کی تصدیق کے لئے کہ محبت کی بنیاد خود غرضی پر ہوتی ہے کافی محنت کی اور ماہرین عمرانیات کی ایک
ت اور گریجویٹ طلباء کی مدد سے انہوں نے نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی کے تمام شادی شدہ طلباء کی ایک فہرست تیار کی اور مطالعے کیلئے
سے پچیس[25] جوڑوں کا انتخاب کیا پانچ مہینے تک ان پچاس نوجوان مردوں اور عورتوں کی ماہرین عمرانیات سے ملاقاتیں ہوتی رہیں یہ
ہے کہ خود پروفیسر ونچ ان جوڑوں میں سے کسی سے نہیں ملے ان میں مختلف قسم کے افراد تھے۔ ان سب کی شادی کو ابھی دو سال سے زیادہ
ہوئے تھے ہر ایک سے تقریباً پانچ گھنٹے تک بات چیت ہوئی اور ان کے نفسیاتی ٹیسٹ بھی لئے گئے چند خصوصیات کا مطالعہ خاص طور
گیا مثلاً مزاج کی سختی۔ بڑے بڑے کام انجام دینے کی خواہش شہرت حاصل کرنے کا شوق وغیرہ ہر شخص کے بارے میں تقریباً ۲۰۰
ت کی ایک رپورٹ تیار کی گئی آئندہ دو سال تک پروفیسر اور ان کے ساتھیوں نے ان پچاس[5] افراد کا بہت تفصیلی مطالعہ کیا اس کے

نتیجے میں ہر ایک کے متعلق وہ تمام تفصیلات معلوم ہوگئیں جن سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ شادی اور محبت کے بارے میں یہ لڑکے اور لڑکیاں کس قسم کے امکانات رکھتے ہیں۔ یہ بات یاد رہے کہ اب تک پروفیسر ونچ بذات خود ان میں سے کسی ایک سے بھی نہیں ملے تھے۔ بہرحال انہوں نے رپورٹوں کا مطالعہ کیا اور اپنے نظریئے کے مطابق صرف قیاس سے ان پچاس لڑکوں اور لڑکیوں کے جوڑے بنائے انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ کون کس کا شوہر یا کس کی بیوی ہے۔ چنانچہ پچیس جوڑوں میں سے بیس جوڑے صحیح نکلے۔

پچیس میں بیس جوڑوں کی مطابقت یا پچیس بار میں بیس بار کسی اندازے کا صحیح ہونا محض اتفاق پر مبنی نہیں ہوسکتا لہذا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ان کا خیال صحیح ہے یعنی یہ کہ

(۱) جو نوجوان سخت کردار، مضبوط قوت ارادی اور بردبار طبیعت کے مالک ہوتے ہیں انہیں نرم کردار کسی قدر لاابالی حساس اور خیال پسند لڑکیوں سے محبت ہوتی ہے۔

(۲) غم پسند اور حساس نوجوان شوخ و شنگ اور ہنگامہ پسند لڑکیوں سے محبت کرتے ہیں۔

(۳) جن افراد کو عظیم الشان کارنامے انجام دینے کی لگن ہوتی ہے وہ ان خواتین سے محبت کرتے ہیں جو اس قسم کی کوئی خواہش نہیں رکھتیں۔

(۴) ہنگامہ پسند کھلاڑی اور فیشن پرست نوجوان سادہ مزاج، سنجیدہ اور باوقار لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔

(۵) ادیب، شاعر، فلسفی اور غیر معمولی فطرت رکھنے والے نوجوان اُن لڑکیوں سے محبت کرتے ہیں جو حقیقت پسند اور عملی ہوتی ہیں۔

(۶) فلموں ڈراموں اور کھیلوں سے ذوق رکھنے والی لڑکیاں خاموش طبع اور علمی مذاق رکھنے والے نوجوانوں کو چاہتی ہیں۔

(۷) ہنگاموں سے الگ تھلگ رہنے والی سیدھی سادی خواتین سیاست پسند ہنگامہ پرور اور پرجوش مردوں سے محبت کرتی ہیں۔

(۸) ادبی اور علمی ذوق رکھنے والی لڑکیاں خالص عملی اور تجارتی قسم کے نوجوانوں سے دلچسپی لیتی ہیں۔

(۹) غم پسند حساس اور خیالوں میں ڈوبی رہنے والی لڑکیاں ہشاش بشاش رہنے والے فیشن پرست مردوں سے محبت کرتی ہیں۔

(۱۰) بردبار، سخت کردار اور کھردری لڑکیاں لاابالی نرم کردار اور معصوم نوجوانوں سے متاثر ہوتی ہیں۔

یہ فہرست آپ نے ملاحظہ فرمائی بہت سے لوگوں کو اس سے اختلاف ہوگا اور وہ یقیناً ایسی بہت سی مثالیں پیش کرسکتے ہیں جن سے اس کی تردید ہوتی ہے خود اس نقطۂ نظر پر بھی اعتراض کیا جاسکتا ہے مثلاً یہ کہ اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ نیک، خوش اخلاق اور شریف نوجوان بداخلاق اور آوارہ مزاج لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں اور نیک طینت شریف اور نیک کردار لڑکیاں بدکردار اور بدسرشت نوجوانوں کو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں پھر بھی یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے کہ محبت کے سلسلے میں مزاج ذوق اور طبیعت کا اختلاف کافی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

(بقیہ صـ ۱۹)

لائے ہوئے جواہر دیکھ کر ان کی آنکھیں چندھیا گئیں تھیں۔ بہت سے لوگوں کو شروع میں اس بستی کے وجود اور وہاں کے حالات کا یقین نہیں آیا تھا لیکن اب وہ یقین کرنے پر مجبور تھے، چنانچہ دولتمند بننے کے کتنے ہی خواہشمند اس خطرناک سفر پر روانہ ہوگئے لیکن ایک مدت گزر جانے کے بعد بھی ان میں سے کوئی واپس نہیں ہوا۔ نہیں معلوم کہ انھیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

ارشد کاکوی

نیازِ نگاہ

مکرِ شاعرانہ تو شیوۂ نیاز رہا ہے مگر کیا آپ یقین کریں گے کہ یہ چند رُباعیاں امتحاناً اور انتقاماً
ایک سراپا ناز نے فی البدیہہ کہلوائی ہیں۔ ع سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں
ان برجستہ رُباعیوں میں روایتی (یعنی رعایتی) عناصر (بزعم خود) نہیں ہیں۔ جتنے نمبر دینے ہوں
اتنے ہی دیجئے۔ کم نہ زیادہ ——— (ا ک)

چہرہ ہے کہ شاداب چمن کا منظر
زلفیں ہیں کہ بادل بھی ہوں پانی پانی
ملتا ہی نہیں سرو سے اُن کا پیکر
عارض ہیں کہ دہکے ہوئے شعلے یکسر

ابرو میں وہ خم ہے کہ چلیں جوں بانکے
گردن پہ صراحی کا گماں ہوتا ہے
لو زخم کے کھلنے لگے اے ارشد ٹانکے
برسوں کی کبھی جس سے گلابی جھانکے

باتوں میں وہ جادو ہے کہ پھیلے خوشبو
نظروں میں وہ تیور ہیں کہ "مر جاؤ تم"
سانسوں میں وہ افسوں کہ چمکے جگنو
آنکھوں میں وہ وحشت ہے کہ بھٹکے آہو

کف ہائے حنائی کا بیاں کیا کیجئے
کس چیز سے تشبیہ انھیں دی جائے
جلتی ہوئی شمعوں کا گماں کیا کیجئے
ملتے نہیں الفاظ جہاں کیا کیجئے

سینے ہیں کہ کہسار پہ حریر و شیفون
جاتی ہیں تو جا کر وہیں رک جاتی ہیں
یا وادیٔ مہتاب میں خوابوں کے فسوں
اللہ رے بے چین لگا ہے دل کا سکوں

رفتار میں شمشیر برہنہ جھلکے
خود اپنی اداؤں سے سمٹ کر چلنا
بلور کی مینا سے گلابی چھلکے
آنکھوں کو چلے جیسے شرابی مل کے

کلیوں کا بکھرنا ہے تبسم ان کا
باتوں ہی میں نغموں کا فسوں ہے ارشد
پھولوں کا مہکنا ہے تکلم ان کا
کیا جانئے کیسا ہوگا ترنم ان کا

وہ آکے جو بیٹھیں تو نہ دیکھا جائے
ہے بات کچھ ایسی کہ بتا بھی نہ سکوں
اُٹھ کر جو چلے جائیں تو دل گھبرائے
اور چپ جو رہوں، منہ کو کلیجا آئے

پھر سازِ شکستہ کو ہوئی ہے جنبش
پھر چاک ہوئی اپنی قبائے تقویٰ
پھر دل کو ہوئی آج "خفی سی لرزش"
پھر آپ سے ہونے لگی اپنی سازش

ہیں اُن سے مری ہجر کی راتیں روشن
نشہ ہے بغیر خم و صہبا طاری
کاغذ ہی کے پھولوں سے بھرا ہے دامن
زلفوں کا تصور ہے کہ رم جھم ساون

گریز

سحر انصاری

!مرے فن کو نہ یوں کرو رسوا

وہ کوئی اور تھی جس کے لئے مرے فن میں
فروغِ گل تو کبھی نغمۂ عنادل تھا
جہاں سفینۂ اخلاص نے سکوں پایا
وہ کوئی اور سمندر تھا، اور ساحل تھا

مجھے قبول کہ میری غزل کی دنیا میں
خزاں کا روپ بھی تھا، جلوۂ بہار بھی تھا
مرے لبوں پہ رہا نغمۂ وصال و فراق
کسی حسیں کا مرے دل کو انتظار بھی تھا

کسی کی زلف کا سایہ ہی رات تھی میری
کسی کا عارضِ تاباں ہی مہرِ عالمتاب
کسی کا لطف و کرم ہی نویدِ عالمِ شوق
کسی کا جور و تغافل ہی روح کو مضراب

تم تو نہیں ہو، مگر وہ تم تو نہیں
!مرے فن کو نہ یوں کرو رسوا

بجا کہ شعلہ بدن بھی ہو سحر کار بھی ہو
تمہارے لب پہ ہیں نغمے تمہارے دل میں گداز
حریفِ نکہتِ گل ہے شمیمِ زلفِ دراز
مجھے قبول کہ تم پیکرِ بہار بھی ہو

مگر بتاؤ یہ تم کس لئے سمجھتی ہو؟
کہ میرے شعر مرے گیت میں ہو تم رقصاں
اس انتہائے توجہ پہ میں نثار کہ ہیں
تمہارے دل میں مرے فن کی عظمتیں پنہاں

مگر وہ شعلۂ نازک مگر وہ شمعِ جمال
کہ جس نے میرے شبستاں کو روشنی بخشی

وہ ایک پہلی نظر جس کی دلنوازی نے
کمالِ عشق ہی کیا، تازہ زندگی بخشی
وہی نہ جب مرا موضوعِ فکر و فن ٹھہری
اسی نے جب مری الفت کا ساز توڑ دیا
وہی نہ جب مرا مضمونِ ذوق و شوق بنی
اسی نے جب مجھے تنہا جہاں میں چھوڑ دیا

تو پھر تمہاری وفاؤں کے عہد کیوں آخر؟
تمہارے اشک اٹھائیں گے دل میں کیا طوفاں
تمہارے لب تو نہیں میری تشنگی کا علاج
مری حیات کو خوش آگیا غمِ دوراں

یہ مرے گیت، مرے شعر اب تمہارے نہیں
یہ اشک اشک ہیں، صرف اشک ہیں ستارے نہیں

مری غزل نہ پڑھو خلوتِ تمنا میں
مری غزل میں نہ ڈھونڈو تم اپنے نقش و نگار
مری غزل میں کسک ہے تو اس کے دم سے ہے
کہ جس نے چھین لیا زندگی کا صبر و قرار

وہ غم تمہارا نہیں ہے وہ غم تمہارا نہیں
تمہاری گل بدنی عشق کا سہارا نہیں
قمر وشو! مرے فن میں نہیں تمہاری ادا
تمہارے در سے مری آرزو نے کیا پایا

کہ میرے فن کے تماشے ہوئے کئی اصنام
حرم نشینوں کی محفل میں ہو چکے بدنام
وہ جب سے روٹھ گئی، جب سے قطعِ ربط ہوا
میں چاہتا ہوں مرے شعر بھی رہیں گمنام

قمر وشو! مرے فن کو نہ اب کرو رسوا
میں چاہتا ہوں مری آرزو نہ ہو رسوا

رحمٰن کیانی

گرانِ خدا

طلسمِ خانۂ انجم، نگار خانۂ گل
یہ ظلمتوں کی جوانی، یہ خار و خس کا شباب
نسیمِ صبح کی راہوں میں حلقۂ سنبل
یہ آگہی کے تقاضوں کو زندگی کا جواب

شعاعِ مہر سے ذروں نے روشنی مانگی
بقدرِ خویش مگر سوزِ مستعار ملا
کشیدِ مے سے مسرت مراد تھی لیکن
بشرطِ تلخیٔ کام و دہن خمار ملا

عصائے راہبری، تیغِ خسروی لیکر
بساطِ دہر پہ لاکھوں مسیح و جم آئے
ہم اپنی آبلہ پائی میں اور کیا کرتے
ٹھہر گئے ہیں جو راہوں میں پیچ و خم آئے

بفیضِ تیشۂ آذر ہزار سنگِ گراں
ہمارے خواب پرستش کی بن گئے تعبیر
عطائے خامۂ مانی کہ سطحِ کاغذ پر
پہن لیا ہے تصور نے جامۂ تصویر

خودی کا آئینہ خانہ خرد کی تھی ایجاد
جب اپنی شکل کو دیکھا صنم بنا بیٹھے
خود اپنے ذوقِ تغیر سے جب ہوئے مجبور
بتوں کو پوجنے والے حرم بنا بیٹھے

طلوعِ مہر سے اہلِ زمیں نے یہ سمجھا
گریز پا ہیں ثوابت، شکستہ پا سیار
بنامِ شاہدِ بے نام ہو گئیں ایجاد
رسومِ گنبد و محراب و سبحہ و دستار

الجھ گیا جو سرِ راہ خار سے دامن
کسی کے دستِ حنائی کو مہرباں سمجھے
حقیقتوں کے فسانے، مجاز کی باتیں
سمجھ گئے ہیں بہت کچھ، مگر کہاں سمجھے؟[۲]

سفر بشرطِ متاعِ سفر مقرر ہے
ہمارے ساتھ اگر کچھ نہیں تو سائے ہیں
کبھی بزعمِ خرد اور کبھی بنامِ جنوں
فریب کھائے ہوؤں کے فریب کھائے ہیں

صنم کدوں سے اٹھا شورِ گریۂ ناقوس
بتوں کے لب نہ ہلے حرفِ مدعا نہ ملا
شہود و شاہد و مشہود ایک تھے لیکن
رسومِ گنبد و محراب میں خدا نہ ملا

طلسمِ خانۂ انجم نگار خانۂ گل
کہیں کبھی نقشِ کفِ پائے یار مل نہ سکا
نسیمِ صبح کی راہوں میں حلقۂ سنبل
بہار کو بھی وہ جانِ بہار مل نہ سکا

[۱] دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا = واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں۔
[۲] ما عرفناک حق معرفتک (حدیث نبوی) کیانی۔

ممتاز حسین

اُردو کا پہلا نقّاد حالی

اصل شے مذاقِ سخن کی پرکھ نہیں بلکہ اس سے زیادہ اہم اقدار کی تنقید ہے ——— مکمل ادبی تنقید وہی ہوتی ہے جو مذاقِ سخن یا ادبی اقدار کے ساتھ ساتھ زندگی کی اقدار کو بھی پرکھتی ہے۔

حالی نے کب اپنے بارے میں کسی قسم کا دعویٰ کیا، کہ میں ان کے بارے میں یہ کہوں کہ وہ اُردو کے پہلے نقاد تھے۔ شاعری اور نقد و نظر کا ساتھ چولی دامن کا
ایسی صورت میں بھلا ایسا سوچنا کیونکر ممکن ہے کہ ہمارے ہاں شاعری تو تھی لیکن تنقید نہ تھی۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ ہمارا ہر بڑا شاعر اپنا اور دوسروں کا نقاد بھی ہے اور یہ سخن سنجی کچھ تذکروں کے تنقیدی کلمات ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اس کا اظہار طرح طرح کی باہمی نوک جھونک میں بھی ہوتا رہا ہے۔ کہیں میر صاحب شاعری فن شریف ٹھہرا کر کسی حجّام کو آئینہ دکھلا رہے ہیں۔ تو کہیں سودا مصحفی سے تو مصحفی انشا سے الجھے ہوئے ہیں اور پھر ہمارے مشاعروں کی گرمیٔ سخن سلامت رہے، مصرعے میں کسی حرف نے کہنی ماری نہیں کہ یاروں نے اسے اٹھایا نہیں، ادھر کوئی لفظ ڈگا نہیں کہ اس پر قہقہہ پڑا نہیں۔
انگلیاں اٹھنے لگیں لو داغ کا داماد آیا۔ ابھی یہ مصرعہ ساحل مرحوم کی زبان سے پورا ادا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ادھر سرِ محفل داغ پر بیچ بیچ انگلیاں اٹھنے لگیں۔ سبحان اللہ ساحل صاحب تشہیر ہو تو ایسی ہو۔ اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے ؎

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

چنانچہ جب ہم اپنے ادب کے اس سارے سرمائے کو سمیٹتے ہیں اور ان رسالوں کو بھی سامنے رکھتے ہیں جو علم بیان اور علم معنی سے متعلق لکھے گئے ہیں تو ایک طرف ان میں بہت سے کام کے تنقیدی اشارے ملتے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کا مذاقِ سخن کیا تھا اور وہ مذاقِ صحیح سے کیا مراد لیتے تھے۔ ہر چند کہ کچھ شاعری تک محدود نہیں ہے لیکن جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس کی پرکھ مذاقِ صحیح کے بغیر ممکن بھی نہیں ہے۔ شاعری کا بھی ایک ویسا ہی مذاق ہوتا ہے جیسے اور گانے کا، زبان کا بھی ایک چٹخارہ ہوتا ہے۔ زبان کا وہی چٹخارہ لذت ہوش و گوش کے ساتھ مل کر مذاقِ سخن کا نام اختیار کر لیتا ہے۔
حالی کے زمانے سے پہلے ہماری ادبی تنقید بنیادی حیثیت سے مذاقِ سخن کی تنقید تک محدود تھی۔ یا پھر خالصتاً فنی تنقید تھی۔ ہمارے میر تقی میر ان دوا

ے ماہر سمجھے جاتے تھے ہرچند کہ اُن کی صحبتیں بھی غضب کی تھیں، اسی طرح میر حسن، مصحفی، غالب اور شیفتہ کو بھی ان چیزوں میں بڑا درک تھا۔ ان میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی سخن سنجی کی تو بڑی دھوم رہی ہے ؎

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بہ ایں ارزش کہ اُو
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

چنانچہ ہمارے حالیؔ بھی ان سے کچھ کم مستفیض نہیں رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اول اول مجھے مبالغہ گوئی سے متنفر کرنے اور اصلیت کی طرف راغب کرنے میں مصطفےٰ خاں شیفتہ کی صحبت کو بڑا دخل رہا ہے۔"

لیکن ان ساری باتوں کے باوجود ہم دورِ حاضر کی اصطلاح میں شیفتہ کو نقاد نہیں کہتے ہیں۔ بلکہ مذاقِ سخن کا پارکھ مانتے ہیں۔

اب آپ پوچھیں گے کہ تنقید کیا ہے؟ اصل چیز تو یہی مذاقِ سخن کی پرکھ ہے بس یہیں آپ سے ذرا اختلاف ہے۔ اصل شے مذاقِ سخن کی پرکھ نہیں بلکہ اس سے زیادہ اہم زندگی کے اقدار کی تنقید ہے جس کی تبلیغ کیا شعر و شاعری اور کیا دوسرے اصنافِ سخن ہر ایک سے ہوتی رہتی ہے۔ خواہ تبلیغ شعوری ہو یا غیر شعوری، بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ۔ کیا چیز کہی گئی ہے یہ بات اتنی ہی اہم ہے جتنی یہ بات کہ وہ کیونکر کہی گئی ہے۔ مکمل ادبی تنقید وہی ہوتی ہے جو ان دونوں چیزوں کا احاطہ کرتی ہے۔ جو مذاقِ سخن یا ادبی اقدار کے ساتھ ساتھ زندگی کے اقدار کو بھی پرکھتی ہے۔ صرف زبان کا چٹخارہ محسوس کرنا یا بیان کو صرف روایت کی کسوٹی پر پرکھنا ہی اہم نہیں ہے بلکہ خیال کو ٹھوک بجا کر دیکھنا بھی اہم ہے۔ اور جسے آپ جذبہ کہتے ہیں وہ بھی زندگی ہی کی ایک قدر ہے بے شک ادبی تنقید میں یہ دونوں کام ساتھ ساتھ ہوتے ہیں، اور ان میں سے کسی ایک کو چھوڑ دینے سے تنقید ناقص رہ جاتی ہے لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب کوئی سوسائٹی بندھے ٹکے خیالات اور زندگی کی روایتی اقدار میں مقید ہو کر رہ جاتی ہے تو پھر اس سوسائٹی کے ادب میں خیال اور زندگی کے اقدار کی تنقید بھی ختم ہو جاتی ہے اور اس وقت صرف وہی زبان کے چٹخارے کی بحث، یا پھر لوگوں کو لفظی شعبدہ بازیوں سے حیرت میں ڈالنے ہی کی بحث رہ جاتی ہے۔ ایسا اس وقت میں ہونا ضروری ہے کیونکہ اس وقت نہ تو کوئی خیال نیا یا اچھوتا رہ جاتا ہے اور نہ زندگی کی کسی بھی قدر کی تبلیغ جاندار رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت تمام تر توجہ اندازِ بیان کی ندرت یا پھر تفننِ طبع کی طرف مائل ہو جاتی ہے اس سے آہستہ آہستہ مذاقِ سخن بگڑتا رہتا ہے۔ لیکن جب وہ معاشرہ اس چھلکے سے نکلنے لگتا ہے اور اس میں نئے خیالات کی لہریں داخل ہونے لگتی ہیں اور زندگی کی نئی قدریں جڑ پکڑنے لگتی ہیں تو ایک نیا ادب اُن خیالات اور ان اقدار کی حمایت اور تبلیغ و اشاعت کے لئے پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہ قانونِ فطرت ہے۔ اس سے انکار کر کے آپ اپنے کو بدمزہ نہ کیجیے، حالیؔ کے زمانے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جبکہ ہم نے اپنی توڑے دار بندوقوں اور اپنے پرانے علوم و فنون کی زور آزمائیوں کا تماشا دیکھ لیا تو پھر ہم مغرب کی انہیں چیزوں کے اپنانے کی طرف متوجہ ہوئے جنہیں اپنانے کے لئے ہم اس وقت سے پہلے تیار نہ تھے حالیؔ کی تنقید اور اس کی نظم گوئی اسی عبوری دور کی ہے جبکہ ہمارے مصلحینِ قوم، سرسید اور اُن کے رفقا ہمیں ترقی کا ایک نیا راستہ دکھلا رہے تھے منقولات کو معقولات کی کسوٹیوں پر پرکھ رہے تھے، اور اقوالِ الٰہی کو اعمالِ الٰہی یا قوانینِ فطرت کی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اگر ایک طرف دین کو سائنس سے مطابقت دی جا رہی تھی تو دوسری طرف کچھ کچھ تاریخ کے مادی اسباب علل کے سمجھنے کی بھی کوشش کی جا رہی تھی جو اب وقائع نویسی کے فن سے ترقی کر کے سماجی زندگی کے عمل و حرکت اور ارتقا کی ایک سائنس بن چکی تھی۔ کیا تاریخ اور کیا تنقید، ایک عام تنقیدی شعور، ہمارے ادب کے ہر شعبے میں اسی زمانے میں پیدا ہوا۔ یہ زمانہ ہماری قومی زندگی کی تاریخ میں بڑا ہی اہم، انقلاب انگیز اور دور رس نتائج کا حامل رہا ہے وہ سارا بطلیموسی نظامِ فکر، اور وہ نو فلاطونی منطقیات جن سے ہم حیات و کائنات کی گتھیاں سلجھاتے اور اپنی جودتِ طبع پر فخر کرتے وہ سب کے سب اس زمانے میں باطل قرار پا گئے، یہ زمانہ جو آج بھی اس وقت سے زیادہ شد و مد کے ساتھ جاری و ساری ہے سائنس اور معقولات کا زمانہ تھا، اور اس زمانے میں بقول حالیؔ خلافتِ رحمانی کے دعویدار ہم آپ نہیں بلکہ وہ تھے جنکی حکمرانی

آب و خاک اور برق و باد سب پر تھی۔

ان ساری تبدیلیوں کا اثر ہمارے مذاق سخن، ہمارے موضوعات سخن اور ہمارے اظہار و بیان سبھی پر پڑا۔ ترقی کرنے کی خواہش کس کے دل میں نہ ہوتی ہے، پھر انہیں مورد عتاب کیوں سمجھا جائے جنہوں نے ہمیں ترقی کے لفظ سے آشنا کیا۔ لیکن یہ زمانہ سیاسی جدوجہد کا کم، سماجی اصلاحات اور ذہنی انقلاب کا زیادہ تھا، چنانچہ اس زمانے میں ہمارے ان بزرگوں کی توجہ زیادہ تر سماجی اصلاحات اور ذہنی انقلاب ہی کی طرف رہی۔ اس ذہنی انقلاب کی باقاعدہ منظم جدوجہد ہمارے ادب میں ۱۸۷۰ء سے شروع ہوتی ہے جبکہ سر سید احمد خاں نے اپنا رسالہ تہذیب الاخلاق یا Mohammedan Reformer جاری کیا، چنانچہ اس رسالہ کے ذریعے سر سید احمد خاں ہی نے سب سے پہلے ہمیں اپنے ادب اور انشا کی خرابیوں سے آگاہ کیا۔ وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"ہمارے علم ادب اور انشا کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب التلفظ کلموں کے تک ملانے اور دور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے فن شاعری جیسا کہ ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی بری چیز نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کچھ نہیں ہے وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیب اور اخلاق کے ہیں۔ خیال بندی کا تشبیہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب و ناقص پڑ گیا ہے جس سے تعجب تو طبیعت پر آتا ہے لیکن اس کا اثر مطلق دل میں نہیں ہوتا، شاعروں کو خبر نہیں ہے کہ فطری جذبات اور ان کی قدرتی تحریک اور ان کی جبلی حالت کا کسی پیرایہ، کنایہ اشارہ، یا تشبیہ و استعارہ میں بیان کرنا کیا کچھ دل میں اثر"

جن لوگوں نے حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کا مطالعہ کیا ہے وہ اسے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ سر سید نے یہاں جن چیزوں کی طرف مجملاً اشارہ کیا۔ نے انہیں چیزوں پر بالتفصیل اپنے مقدمے میں بحث کی ہے لیکن حالی اس کتاب میں صرف سر سید ہی کے افکار و خیالات سے متاثر نہیں ہیں لاہور قیام میں جبکہ وہ پنجاب گورنمنٹ کے بک ڈپو میں ترجموں کی عبارت درست کرنے کی خدمت پر مامور تھے، ان کی شناسائی انگریزی ادب اور تنقید اچھی خاصی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے تقریباً چار برس لاہور میں رہ کر یہ کام کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاصکر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔" ان کی اس طبیعت پر مزید رنگ یہ چڑھا کہ جب مولانا محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہال رائڈ، ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سے اس مناظمے کی بنیاد ڈالی جس سے دور حاضر کی نظم گوئی وجود میں آئی تو مولانا حالی اس کے سرگرم رکن بن گئے۔ مولانا نے اپنی چار مثنویاں برکھارت، نشاط امید، حب الوطن اور مناظرہ' رحم و انصاف" اسی مناظمے کے لئے لکھیں جس کا مقصد مولانا کے الفاظ میں یہ تھا کہ "ایشیائی شاعری جو در و بست عشق اور مبالغے کی جاگیر ہو گئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق اور واقعات پر رکھی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسی مشاعرے یا مناظمے سے ہماری جدید نظم گوئی اور تنقید دونوں ہی کی ابتدا ہوتی ہے اور اس سلسلے میں مولانا محمد حسین آزاد کی خدمات کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنی کتاب آب حیات لکھی تو انہوں نے اس کی بنیاد جدید طرز کی تنقید ہی پر رکھی، لیکن اس کے باوجود ادب کی دنیا میں آزاد کی کتاب کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی جو حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کو ملی، حالانکہ مقدمہ آب حیات کے دس سال بعد شائع ہوا۔ اس کا سبب وہی ہے جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا کہ آزاد مذاق سخن کے نقاد تھے وہ زندگی کے اقدار اور نظریۂ شعر و ادب کے نقاد نہ تھے۔ اور میں پہلے ہی کہہ آیا ہوں کہ تنقید کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے جہاں سے کہ ادبی اقدار کی تنقید شروع ہوتی ہے۔ اور یہ شرف حالی ہی کو پہنچتا ہے کہ وہی پہلے ہمارے مسلمات شاعری کو تنقید کی زد میں لائے اور ادب اور سوسائٹی کے رشتے کو بھی معلوم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ حالی نے آب حیات پر تبصرہ کیا ہے اس میں اس نکتے کو خاص طور سے ابھارا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کتاب میں مصنف نے کہیں اس بات کی تصریح نہیں کی کہ اردو شاعری نے ہمارے

اق اور ہمارے خیالات پر کیا اثر کیا" اس کے برعکس مولانا حالی نے اپنے مقدمۂ شعر و شاعری میں اس کی اس کی وضاحت صاف لفظوں میں کی ہے کہ اگر
دب ایک طرف سوسائٹی کے مذاق سے اثر قبول کرتا ہے تو دوسری طرف وہ سوسائٹی کے مذاق کو بدلتا اور اس کی اصلاح بھی کرتا ہے۔"

مجھے امید ہے کہ اگر اب میں حالی کو اُردو کا پہلا نقاد کہوں تو شاید اس کے قبول کرنے میں آپ کو کوئی عذر نہ ہوگا لیکن مولانا حالی کے بارے میں صرف
نا کافی نہیں ہے کہ وہ اردو کے پہلے نقاد تھے، کیونکہ پہلے نقاد ہونے سے کوئی شخص بڑا یا اہم نقاد نہیں بن پاتا ہے۔ مولانا حالی ہمارے ادب کے
اہم نقاد تھے۔

ان کی وہ اہمیت شاعر اور شعری تخلیق کی نفسیات کی کھوج لگانے میں ہے۔ جس سے ہمارا قدیم تنقیدی ادب بالکل ہی بے نیاز رہا ہے۔ کیونکہ
عری کو صرف ایک فن یا ہنر کی حیثیت سے جانچتے رہے ہیں۔ ان کے اس مقدمے کی اہمیت اس میں بھی ہے کہ انہوں نے شاعری کو نہ صرف شاعر
ت میں تلاش کیا، بلکہ شاعری کو بہ حیثیت ایک سماجی عمل کے بھی دیکھا، جس سے سوسائٹی کے خیال، مذاق اور اخلاق سبھی کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔
نے ان دو بنیادی مسائل پر بحث کر کے ہمارے تنقیدی ادب میں ایک گراں بہا اضافہ کیا ہے۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

محمد علی صدیقی

گلابی —— ایک چہرہ دو (۲) آئینے

وہ دور ختم ہوا جب لڑکیوں کے پارٹ لڑکے کرتے تھے ——— اور وہ دور آگیا جہاں لڑکیاں لڑکوں کے روپ میں نظر آرہی ہیں ——— اِن دونوں زمانوں کے درمیان گلاب بائی رہتی ہیں ——

ہندوستانی اسٹیج کے بڑے بڑے فنکاروں کے ناموں کو اگر اکٹھا کیا جائے تو اکثریت پارسی اور ہندو فنکاروں کی ملتی ہے مسلمان تو صحیح معنوں میں بعد ہی میں آئے۔ اردشیر ایرانی، کیکاؤس جی، خورشید جی، بالی والا، ٹھوٹھی، نرائن اور گوکھلے جی وغیرہ وغیرہ اردو اسٹیج کے تیسرے دور کے بڑے بڑے فنکار ہیں آغا حشر کے چوتھے دور سے ذرا پہلے ان بڑے ناموں میں گلاب بائی کا نام بھی مل جاتا ہے۔ گلاب بائی اسٹیج کی اُن مایہ ناز ہستیوں میں سے تھیں جن کی آمد سے ہندوستانی عورتوں نے اسٹیج کی طرف رُخ کیا اور اسے باعث اعتنا سمجھا۔ وہ پچھلے پچاس سال کی بہت ہی منفرد شخصیت ہیں۔ ہندوستانی اسٹیج پر جب بھی کبھی جامع کتاب لکھی جائے گی، اُن کا نام ضرور شامل ہوگا۔ میں انہیں ۱۹۲۹ء سے جانتا تھا۔ گو اُس زمانہ میں وہ بوڑھی ہو چکی تھیں لیکن پھر بھی میں نے اُن سے زیادہ مستعد اور چاق و چوبند فنکارہ نہیں دیکھی۔ سرِ شام ہی سے وہ الائٹ تھیٹر کے ایک ٹوٹے پھوٹے ڈریسنگ روم میں میک اپ کرنے بیٹھ جاتیں اور تین چار گھنٹے مسلسل میک اپ کرتی رہتیں۔ میں بصد شوق عمر کے بڑھتے ہوئے سایہ سے میک اپ کی جنگ دیکھتا رہتا گلاب بائی کو میک اپ کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے میک اپ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا۔ واقعی اگر میک اپ کو بھی تمثیل کا ایک اہم عنصر نہ مانا جائے تو پھر وہی ہو جو چودھویں پندرھویں صدی تک فرانس میں ہوتا تھا۔ جب فرانس کی میونسپلٹیاں ہر چورا ہے پر شہریوں کی تفریح طبع کے لئے ڈراموں کا بندوبست کیا کرتی تھیں تو فرانسیسی میک اپ سے بچنے کے لئے خود فنکاروں کی زبان سے عمر اور شکل کے بارے میں اس طرح بیان کرواتے تھے کہ "میں جوان ہوں"۔ "بوڑھا ہوں"۔ "خوبصورت ہوں" یا "بدصورت" ہوں لیکن گلاب بائی بڑھاپے "میں پبلک سے" آہ۔ آہ "کہلوانے کی عادی تھیں اور میں نے بیسیوں دفعہ انہیں اسی نیت سے شعوری طور پر وہ سب کچھ کرتے ہوئے دیکھا جس سے عمر کئی سال پیچھے پلٹ جائے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ بڑھاپا یہ ہے تو جوانی کیا ہوگی؟

سوال واقعی اہم تھا میں نے ایک دن کریدنا شروع کیا۔ یہی ۱۹۵۵ء کی ایک سنہری شام تھی۔ موسم کافی اچھا تھا۔ وہ تھیٹر کی بکنگ کے نزدیک

کھڑی ہوئی چائے والے کا انتظار کر رہی تھیں۔ بڑھاپا انہیں تھکا چکا تھا۔ اب وہ ایسے دور میں داخل ہوگئی تھیں جہاں اُنہیں سارے کام خود کرنے پڑتے اب عمر کا وہ عہد گزر چکا تھا جب لوگ اشاروں پر چلا کرتے تھے سو وہ سخت جاڑے میں بھی آدھے فرلانگ کے فاصلہ پر خود ہی چائے لینے جاتیں اور چلچلاتی دھوپ میں بھی میں سوچتا رہتا کہ اگر چہرے پر یہ جھریاں نہ ہوتیں تو کیا ہوتا جواب خود بخود یہ ہوتا کہ "جوانی ہوتی" اور پھر کیا ہوتا چلئے خود اُن کی زبانی سنئے۔ میرے اس سوال کا جواب اُنہوں نے تقریباً دو سال کی جستجو کے بعد دیا تھا۔ بڑی وضعدار واقع ہوئی تھیں کہتی تھیں "ابھی اب جب کہ میں اپنے ماں باپ کا نام اونچا کر ہی چکی ہوں تو بتانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" میں اور بھی سر ہو جاتا۔ عادت سے اچھی طرح واقف تھا اگر ذرا سستی برتی تو پھر ہفتوں ہموار کرنا پڑے گا" اور پھر بات یہیں ٹھپ ہو جائے گی۔ میں نے پوچھا "آپ نے اسٹیج کی زندگی میں کیوں اور کیسے قدم رکھا اور اُنہوں نے بیان کرنا شروع کیا۔

"اب کونسا سال ہے؟"

"۱۹۵۶ء"

تو یہ سمجھو تقریباً ۴۰ سال پہلے میں ایک برہمن گھرانے کی جوان لڑکی تھی۔ سارے گھر گھاٹ کے کام کرتی۔ صبح سویرے ناچتی گاتی اور ایک مندر سے دوسرے مندر پھدکتی پھرتی۔ مجھے بھگوان ہر روپ میں پسند آتا۔ رادھا کرشن اور گوپیاں میرے خیالات کی دنیا میں چھائی رہتیں۔ میں بھی سوچتی کہ کوئی کرشن آئے اور مجھے اپنی رادھا بنائے۔ میری سہیلیاں گوپیوں سے بھی زیادہ بیباک تھیں۔ وہ کہتیں "گلاب تیری آنکھیں تو رادھا کی آنکھوں سے بھی اچھی ہیں" وہ رک گئیں۔ اُن کی آنکھوں میں چند قطرے اُبھرے اور آہستہ آہستہ جھریوں میں راستہ تلاش کرنے لگے۔

میں پاس ہی ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ جانتا تھا کہ گلاب بائی کے آنسو لڑیوں کی صورت میں بکھرتے ہیں میں نے انہیں اس سے پہلے روتے ہوئے تو نہیں دیکھا لیکن سنا تھا کہ وہ بہت ہی رقیق القلب ہیں۔

تھوڑی دیر کے وقفے کے بعد میں پھر دوبارہ اُن کے پاس چلا گیا۔ ایک چارپائی ٹوٹی ہوئی میز اور میک اپ کا سامان۔ میک اپ کا سامان دوسری تمام چیزوں پر بھاری تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گلاب بائی نے چالیس سال کی ڈرامائی زندگی کی تمام خالی شیشیاں اور بوتلیں جمع کر لی ہیں دیواروں پر جگہ جگہ اُن کے پرانے فوٹو لگے ہوئے تھے۔ کہیں ماسٹر محمد حسین کے ساتھ، اور کہیں آغا حشر کے ساتھ اور نہ جانے کتنے دوسرے ماسٹروں اور "رانیوں" کے ساتھ۔ اُن کا کمرہ بذات خود ہی ایک ڈرامہ کا سین تھا جہاں بڑھاپا تحک کر سستا رہا ہو۔

میں نے دوبارہ گفتگو شروع کی۔

"بائی جی آپ کہاں پیدا ہوئی تھیں"

"میں یہ نہیں بتاؤں گی۔ کہیں تم میرے شہر کے متعلق کوئی غلط رائے نہ قائم کر لو" اور میں اُن کی اخلاقی جرأت سے پگھلنے لگا۔

"آپ اسٹیج پر کب آئیں" ظاہر ہے کہ اُس کے ساتھ "کیوں" بھی ہے؟

"ہاں سنو" ایک ایسی ہی شام کو جب میں کیلاش مندر سے دیوی کے چرن چھو کر آرہی تھی، تو مجھے ایک سہیلی نے لالہ کے سورگباش ہونے کی خبر دی۔ باپ کے انتقال کے وقت میں کوئی پندرہ سال کی ہوں گی۔ اپنی سہیلیوں میں سب سے زیادہ شریر تھی۔ مجھ پر وہ مثال صادق آتی تھی کہ انگ انگ میں شرارت اور مستی رچی ہوئی ہے اور جب سے میں نے اپنے اندر جسمانی تبدیلیاں محسوس کیں، میرے آس پاس کے اُمیدوار لڑکوں نے میری راہ میں شریر نظروں کے جال بچھانے شروع کر دیے تھے لیکن میں نے گیتا گووند میں رادھا کا وہ شعر پڑھا تھا۔

"آؤ میرے کرشن، رادھا کو اپنے ہاتھوں میں لے لو۔ آؤ کہ میرے جوڑے میں پھول کملا رہے ہیں" آؤ — آؤ — ضرور۔ آؤ۔

اور میں اپنے جوڑے کے پھولوں کو درست کرنے والے کا انتظار کرتی رہی۔ وہ میرے لئے ابھی تک سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کب ہی خیال میرے ہردے من میں اٹھتا رہتا لیکن آج تو موت کے دیوتا نے میرے لالہ کو بھی اٹھا لیا تھا۔ گھر میں بیٹھی ہوئی میری بوڑھی ماں میرا کیسے سنبھالتی۔

"بوجھ کیسا بائی!"

اور انہوں نے میری طرف ذرا گھور کر دیکھا میں شرما سا گیا

"جی تو پھر کیا"

"تو لالہ کی موت کے فوراً ہی بعد میری ماں سورگباش ہوگئیں اور میں ایک سنسان رات کو اپنے پیارے شہر کے اسٹیشن پر آئی حسرت سے وطن کو ایک ور دیکھا اور شمالی ہند کی طرف جانے والی ایک گاڑی میں بیٹھ گئی" دہلی اتری اور پھر تو عجیب ہی نقشہ دیکھا۔

"جی کیا" میں بار بار اسی قسم کے لقمے دیتا رہتا تاکہ میری جانب سے برابر کی دلچسپی ظاہر ہو۔ میں جب اس رات کے متعلق سوچتی ہوں تو مجھے پ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ دہلی میں اجنبی ہوتے ہوئے بھی میں اجنبی نہیں تھی" قلی سے لیکر تانگے والے تک، غرض ہوٹلوں کے ایجنٹ اور ٹ فارم پر گھومنے والے پیشہ ور نظر باز سب ہی میرے قیام و طعام کی ذمہ داری لینے پر رضامند ہی نہیں بلکہ مصر تھے۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر بول رہا تھا کہ "تم بھارت کی بیٹی ہو۔ اکیلی ہو تو کیا ہم جو ہیں۔ ہم جو ہیں" لیکن ان کی آنکھوں میں ناچنے والے شیطان سے میں سہم سی گئی میں نے ا ہمت سے کام لیا اور سب سے نظر بچاتی بچاتی باہر آگئی اور اپنے ایک دور کے عزیز کے مکان پر چلی گئی" وہاں پر خالص روایتی ذہنیت نے رنگ ــــــــ دکھایا۔ ایک لڑکی کی سرپرستی کرنے کے لئے کوئی عزیز تیار نہ تھا۔ سب اُسے مطعون کرتے۔ منحوس قرار دیتے اور وہ رادھا صفت دوشیزہ ر رادھا بن ہی گئی۔ اوّل ایک دھارمک لیلا میں پھر پروفیشنل تھیٹر میں۔ ایک دم ہندوستان میں ایک بجلی سی کوند گئی۔ بڑی بڑی پیشکشیں آنی ع ہوئیں۔ گلابی کے متعلق یہ کہنا کہ انہوں نے فلاں فلاں ڈرامے میں کام کیا ہے غلط سا ہے۔ بلکہ اُسے اس طرح کہا جائے کہ ہر قابل ذکر ڈرامے جو بڑی کمپنیوں نے پیش کیا وہ موجود تھیں۔ مجھے اشتیاق ہوا کہ اُس زمانہ کا کوئی اچھا سا فوٹو دیکھوں۔ اُنہوں نے ایک ٹوٹے ہوئے صندوق میں ہاتھ گھمانا شروع کیا۔ ایک چھوٹی سی صندوقچی نکلی۔ اُس میں ایک کپڑے کی کترن سے لپٹے ہوئے پانچ چھ فوٹو تھے سب میرے حوالے کر دئیے۔ رادھا کا پہاننا مشکل ہی کیا تھا ایک بہت ہی حسین تصور کی عملی شکل جس کو بناتے وقت مصور نے برش سے تمام شوخ رنگ بھر دئیے تھے صرف ہونٹوں ذرا اوپر ہلکی سیاہی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے چہرہ پر رنگوں کا بڑا اچھا امتزاج تھا۔ کچھ صندلی رنگ میں ہلکا گلابی رنگ پھر اُس پر اُبھرتی ہ سفیدی۔ ان تینوں رنگوں کی آمیزش سے گلاب بائی گلاب بائی تھیں۔ اور آج جو گلاب بائی میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں تو مجھے بڑا تعجب اور ۔س ہو رہا تھا۔ شیکسپیئر نے کیا خوب کہا تھا" وقت حسن چھین سکتا ہے لیکن حسن کی عظمت کا احساس نہیں چھین سکتا" گلاب بائی کی زندگی جدید دستانی اسٹیج کی زندگی ہے۔ اسٹیج ایک منفعت بخش کاروبار کی حیثیت سے پہلی دفعہ ابھرا جگہ جگہ تھیٹر قائم ہوئے باقاعدہ اور منظم طریقوں سے ۔ستاد ۔گے اس قدیم فن کو نئے تقاضوں کے تحت تازگی بخشی گئی اس بوڑھے چہرے نے حبیب سیٹھ کی کمپنیوں کے وہ دن بھی دیکھے تھے جب ستے مشکیں لر ڈرامہ دیکھا کرتے تھے۔ ۔ حشر آئے اپنے ساتھ ایک پورا بہاؤ لیکر آئے۔ وہ حقیقت سے قریب اور زندگی کے راز ہائے سربستہ کو سمجھنے اور سمجھانے لے مرقعے لائے۔ ایک طوفان آیا اور گلاب بائی" ترکی حور" " دل کی پیاس" اور " آنکھ کے نشے" میں تیرتی ہوئی ایک ایسے موڑ پر آگئیں کہ ہم فخر یہ کہہ سکیں کہ

ہمارے یہاں اسٹیج ہے ـــــ زندہ اور متحرک اسٹیج۔ اس زمانہ کی خاص خاص کمپنیوں میں میڈن، کورنتھین اور بمبئی وکٹورین تھیں۔ اس زمانہ میں منشی حسن، دیوانہ، پریم ناتھ اور ظفر علی خاں جیسے قلم کار کود چکے تھے۔ انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والا ہر مسئلہ تمثیل ہو رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں براڈوے تھیٹروں اور بالشویک تھیٹر جیسی نفاست اور تکنیکی ترقی نہ ہو لیکن جذبات کے سوتے یہاں بھی پھوٹتے تھے۔ ہندوستانی ڈرامے پر زندگی کے بھرپورپن اور سوز و گداز کے فقدان کا الزام لگایا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے ڈراموں میں فراریت ہے ان تمام الزامات کی وجہ صرف ہمارے سماج کا ڈھانچہ اور ضابطہ اخلاق ہے۔ برگساں نے کہا ہے کہ جس معاشرے میں اخلاقی ضابطوں پر سختی سے عمل پیرا ہونا پڑتا ہے وہاں زندگی بن جمود آجاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے سماج میں اس جمود کو توڑنے کی ذرا سی بھی کوشش قابل ملامت بن جاتی ہے بھلا اس سے فنکار کیوں بچتے؟ اس روایت کو زندہ رکھنے والے فنکار اپنے شہروں کے نام بھی بتاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اور گلاب بائی کے ساتھ بھی یہی المیہ تھا۔ وہ اُن ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے زندگی کے جمود کو توڑنا چاہا۔ انہوں نے چاہا تھا کہ نام نہاد سماجی ٹھیکیداروں کے منہ پر طمانچہ مارا جائے چونکہ وہ ایک دکھیاری کی مدد کے لئے برنارڈ و ہوم نہیں کھلوا سکتے لیکن اُسے نیم برہنہ دیکھ کر روپے پیسے کی بارش کر سکتے ہیں۔ گلاب بائی نے زندگی کے اس نٹ کھیل میں ایک کامیاب کھلاڑی ہونے کا ثبوت دیا اور انہوں نے زندگی میں جمود پر حرکت کو اور نفرت پر محبت کو ترجیح دی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ ایک برہمن زادی ہی رہتیں اور ساری عمر دوسری ذاتوں اور مذاہب کے لوگوں سے نفرت کرتے کرتے گذار دیتیں اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بطور انسان صرف مذہبی قیود کی پابند ہوتیں لیکن معاشی مصیبتوں اور سماجی ہولناکیوں کی افتاد نے انہیں جھونٹے اور اچھالے دئے۔ مرنے سے بیس سال قبل وہ مسلمان ہوگئیں اور لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ شاید وہ فنکار نہ رہ سکیں لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ اپنے شوہر محمد حسین بادا کے ساتھ رہیں محمد حسین بادا ہندوستانی اسٹیج کے ایک باوقار ہدایت کار تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی آگئیں اور یہاں ڈراموں میں حصہ لینے لگیں۔ میں نے اُن سے پوچھا بائی جی آپ اپنی زندگی کا سب سے زیادہ اہم واقعہ سنائیں۔"

وہ ہنسیں اور خوب ہنسیں اور میں بھی اُن کے ساتھ ہنسنے لگا تھوڑی دیر بعد خود ہی کہنے لگیں: "میں جب اسٹیج کی دنیا میں آئی تو پورے ہندوستان میں گنتی کی چند عورتیں ڈرامے میں پارٹ ادا کیا کرتی تھیں اُن میں اکثریت سماج کے ظلم سے دل برداشتہ خواتین کی تھی کچھ معمولی پارٹ کرنے والی عورتیں "سرخ روشنی" والے علاقوں کی پروردہ ہوتی تھیں لیکن اُس زمانے میں اخلاق رکھ رکھاؤ ہوتا تھا۔ بڑوں کا ادب چھوٹوں سے پیار اور نوعمر لڑکیوں کو حتی المقدور اسٹیج سے بچانے کی کوششیں ہوتی تھیں۔ ایک دن راجستھان کی ریاست جودھ پور کے ایک بڑے دیوان کی جوان لڑکی اگن کنڈ سے بھاگ کر ہمارے تھیٹر میں آگئی۔ اُس دن مہاراج بھی ہال میں موجود تھے۔ پھولوں سے لدی ہوئی جوان حسینہ، مانگ میں سیندور بھرے اسٹیج میں پناہ تلاش کرنے آئی تھی۔ میں اسٹیج کی ونگ میں کھڑی اپنے داخلے ر ... کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ مجھ سے آکر ایک دم لپٹ گئی "مجھے بچالو بہن مجھے بچالو" اور میں ہکی بکی رہ گئی۔ ایک ہی سانس میں نجانے وہ کیا کیا کہہ گئی اور میں سمجھ گئی کہ یہ بھی ایک دکھیاری ہے ـــــ احتجاج کر رہی ہے ایک ایسے سماج سے جہاں پنڈت کے اشلوکوں پر جوانیاں بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں

"آپ نے پھر کیا کیا؟"

"میں نے اپنے سین کے خاتمے پر بڑے اطمینان کے ساتھ لڑکی سے گفتگو کی اُسے بہلایا اور دوبارہ والدین کے پاس جانے کی تلقین کی۔ لیکن اُس کے پاس بہت ہی ٹھوس شکایتیں تھیں۔ اُس کے جوان دل پر حکومت کرنے کے لئے ایک ۷۰ برس کے بوڑھے کو چنا گیا تھا۔ وہ اس صدمہ سے بدحواس سی ہوگئی۔ میں نے اُس کے من راجہ کا کھوج لگایا۔ اور دونوں کو ایک دوسرے کے سپرد کر دیا۔ مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ آج وہ دونوں

ہنسی ہنسی خوشی زندگی گذار رہے ہیں۔

گفتگو ختم ہوگئی وہ میک اپ کرنے میں مشغول ہوگئیں یہ مصروفیتیں اُس وقت تک جاری رہیں جب تک الائٹ تھیٹر قائم رہا۔ الائٹ تھیٹر کے خاتمے پر گلاب بائی کی ڈرامائی زندگی کا ڈراپ سین ہوگیا۔ اُس کے بعد ان سے کبھی بھی ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوسکا لیکن ایک دن میں نے اُنکی موت کی خبر سنی۔ مجھ تک خبر پہنچنے میں تین دن لگے موت سب کو آتی ہے لیکن لاکھوں آدمیوں کو ۴۰ سال تک تفریح بہم پہنچانے والی فنکارہ کے جنازے میں چار آدمی بھی نہیں تھے۔ کافی دیر انتظار ہوتا رہا کہ شاید اسٹیج کے کچھ شائقین اپنی ہیروئن کو زندگی کے اسٹیج سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتے ہوئے دیکھنے آئیں مگر ایسا نہیں ہوا خیراتی لاری ایک لاش اور دو تین آدمیوں کو لے کر قبرستان کی طرف روانہ ہوئی اور اس کے پیچھے ہندوستانی ڈرامے کی یادوں کا ایک طویل سلسلہ بھی گم ہوتا چلا گیا۔ وہ دور ختم ہوا جب لڑکیوں کے پارٹ لڑکے کرتے تھے اور وہ دور آگیا جہاں لڑکیاں لڑکوں کے روپ میں نظر آرہی ہیں ان دونوں زمانوں کے درمیان گلاب بائی رہتی ہیں۔

سحر انصاری

کراچی کی ادبی سرگرمیاں

نشستند و گفتند و برخاستند

حفیظ ہوشیارپوری کے بعد عبدالعزیز خالد آئے۔ انہوں نے کہا یہ ایک منظوم ڈرامہ ہے "دکانِ شیشہ گر"
——— معلوم ہوا کہ انجم اعظمی نے اپنی ایک نظم محاسب پیش کی ہے اور یہی موضوعِ زیرِ بحث ہے۔
سب کے سب خاموش ہو گئے، ضیا جالندھری نے چند لمحے توقف کیا اور پھر اٹھ کر تیز تیز قدموں سے
باہر جانے لگے۔ ممتاز حسین نے آواز دی ارے ضیا ..... او ہو۔ خفا ہو گئے کیا ..... بات تو
سنو ——— ن، م، راشد نے نظم کا آغاز کیا "دل مرے صحرا نوردِ پیر دل" اسکے بعد عزیز حامد مدنی نے غزل پڑھی۔

وہ ۲۳ دسمبر ۱۹۶۰ء کی شام تھی۔ میں پاکستان رائٹرز گلڈ (کراچی) کی پندرہ روزہ ادبی نشست میں شرکت کی غرض سے ہوٹل ایکسلسیر کے بالائی ہال میں پہنچا۔ جہاں ادیبوں کا اچھا خاصا اجتماع تھا۔ حفیظ ہوشیارپوری۔ ضیا جالندھری۔ انجم اعظمی، قمر ہاشمی۔ قمر تسکین۔ قیوم نظر (جو اتفاق سے ان دنوں کراچی آئے ہوئے تھے) جون ایلیا۔ منظر ایوبی۔ ساقی فاروقی۔ پروفیسر ممتاز حسین۔ صادق مدہوش، ابن انشاء وغیرہ موجود تھے۔

پروگرام کا آغاز ہوا۔ ممتاز حسین کے کرسیٔ صدارت پر تشریف رکھنے کے بعد صادق مدہوش نے گزشتہ نشست کی روداد پڑھ کر سنائی۔ ان کا رکنا تھا کہ حاضرین نے صدائیں بلند کیں "یہ رپورٹ نامکمل ہے۔ نامناسب ہے۔ انھیں NOTES لینے چاہئیں۔

اس کے بعد حفیظ ہوشیارپوری نے ایک غزل پیش کی۔ غزل چھوٹی بحر میں تھی اور اچھی تھی۔ اس پر تعریفی کلمات کے سوا کچھ نہ کہا جا سکا۔

حفیظ ہوشیارپوری کے بعد عبدالعزیز خالد آئے۔ انہوں نے کہا۔

"یہ ایک منظوم ڈرامہ ہے۔ اس کا عنوان ہے دکانِ شیشہ گر۔ اور پھر انھوں نے بیدل کے شعر سے تمہید کا آغاز کیا۔
طویل نثری تمہید کے بعد کامل نظم سنی گئی۔ اس ڈرامے میں یونانی صنمیات سے ماخوذ پنڈورا اور ایپی میتھیس کا قصہ نظم کیا گیا تھا۔ بعض بعض جگہ سامعین بے اختیارانہ "واہ، واہ" کہہ اٹھتے۔ عبدالعزیز خالد نے نظم ختم کی۔ ممتاز حسین نے دعوتِ تنقید دی۔ اس نظم کی تعریف میں بہت سے جملے سننے میں آئے۔

انجم اعظمی نے کہا "صاحب صدر! یہ نظم اچھی ہے۔ لیکن بہت اچھی ہو سکتی تھی اگر اس میں خالد صاحب تن آسانی سے کام نہ لیتے۔ بعض ترکیبیں مثلاً "نور پکڑنے کے لئے" اچھی نہیں لگتیں۔ البتہ جہاں جہاں سراپا کا حصہ ہے وہ بہت خوبصورت ہے اور ہندی الفاظ نے آہنگ میں تازگی پیدا کر دی ہے

باقی حصہ جذبے سے عاری ہے؟

جناب صدر! میں انجم صاحب کی بات سمجھنے سے قاصر رہا۔ کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ مجھے تو جی یہ نظم بے حد پسند آئی ہے۔ مجھے انجم صاحب کی بات سے شدید اختلاف ہے۔ قمر تسکین نے کہا۔

اور۔ صاحب صدر! اس نظم کو خالد صاحب نے منظوم ڈرامہ کہہ کر پیش کیا ہے۔ حالانکہ اس میں ڈرامے کے عنصر سرے سے ہیں ہی نہیں۔ ساقی فاروقی بولے۔

"یعنی آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیئے تھا جو اس میں نہیں ہے۔ ممتاز حسین بولے۔

"صاحب صدر! ڈرامے میں کرداروں کے ڈائیلاگ ہوتے ہیں۔ کلائمکس ہوتا ہے۔ سسپنس ہوتا ہے۔ لیکن اس میں یہ سب نہیں ہے۔

"آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ڈرامے کے لئے بس اتنا ہی ضروری ہے" ممتاز حسین نے کہا۔

کیا کریں گے بے چارے مجبور ہیں۔ کورس کی کتاب میں بس اتنا ہی لکھا ہوا ہے۔ عبدالعزیز خالد نے آہستہ سے کہا۔

صاحب صدر! کیونکہ اس نظم میں ڈرامائیت نہیں ہے اسے ہم ڈرامہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ ایک طویل نظم تو ہو سکتی ہے۔ ابن انشا نے کہا۔

"ہم اسے Dramatic Poem کہہ سکتے ہیں۔ جمالی نے کہا۔

"ہاں اسے ایک ڈرامیٹک پوئم کہا جا سکتا ہے۔ چند آوازوں نے تائید کی۔

"جی نہیں۔ آپ خود چاہیں تو ڈرامائی نظم کا ترجمہ Dramatic Poem کر لیں۔ ورنہ انگریزی میں Dramatic poetry قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ اسے ڈرامائی نظم کیوں کہا جائے۔ ایک طویل نظم کہنے میں کیا ہرج ہے۔ طفیل احمد جمالی بولے۔

جناب صدر، ہمارے سامنے اسے ایک منظوم ڈرامہ کہہ کر پیش کیا ہے۔ ابن انشا نے جواب دیا۔

انجم اعظمی بولے۔ "صاحب صدر منظوم ڈراما تو خیر یہ نہیں ہے۔ لیکن ایک اچھی طویل نظم ہو سکتی تھی۔ اگر عبدالعزیز خالد صاحب اس پر محنت کرتے یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس دور میں ایک خالد صاحب ہی ہیں جو بڑی محنت سے مسلسل طویل نظمیں لکھ رہے ہیں۔ اور وہی اس کام کو خوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔"

آپ یہ کہہ کر انھیں کیوں بدنام کر رہے ہیں۔ قیوم نظر نے کہا۔

اس پہ ایک قہقہہ بلند ہوا۔

دسمبر ۱۹۶۰ء کی پچیسویں تاریخ تھی اور اتوار کا دن۔ میں ایس۔ ایم آرٹس کالج کے کمرۂ اساتذہ میں پہنچا۔ "مجلس احباب قلم" کی تنقیدی نشست میں شرکت کی غرض سے کئی نوجوان ادیب ایک بڑی سی گول میز کے گرد بیٹھے تھے۔ جن میں مستحسن عباس۔ س۔ م صولت۔ مسعود جعفری۔ ملک حسین۔ ریحانہ اختر صدیقی۔ شاہین صدیقی۔ رضیہ غفور۔ ناہید تقی۔ اختر جبیں۔ اکرم احسن صدیقی۔ انور احسن صدیقی۔ ریاض انور۔ اے۔ ایچ انصاری۔ حسین نقی اور اشتیاق حسین طالب وغیرہ شامل تھے۔

س۔ م صولت کرسیٔ صدارت پر رونق افروز ہوئے اور پروگرام کے آغاز کے لئے افسانہ نگار ثاقب جاوید کا نام پکارا۔ ثاقب جاوید موجود نہ تھے۔ سکریٹری نے ان کا افسانہ "نوکری" پیش کیا۔ افسانہ ایک ٹیلی فون آپریٹر کی زندگی سے متعلق تھا۔ جس میں محکمہ جاتی ناانصافیوں اور افسران بالا کی گندی ذہنیت کو پیش کیا گیا تھا۔

اس افسانہ پر تنقید ہوئی۔ بعض نے اسے نامکمل افسانہ بتایا۔ بعض حضرات کے خیال میں یہ ایک اچھی کوشش تھی اور افسانہ کامیاب تھا۔
اس کے بعد اشتیاق حسین طالب نے ایک غزل پیش کی۔ اس کے اکثر اشعار پر تحسین و آفریں کے کلمات کہے گئے۔ اس غزل کے ایک شعر کے بارے
نورالحسن صدیقی نے کہا۔
"اس شعر میں انفرادیت ہے۔ مادی حالات سے بے اطمینانی کا اظہار ملتا ہے۔ لیکن اس احساس میں، کہ آزادی کی فضا میں سانس لی جائے
یت کا پہلو ہونا چاہیئے تھا۔"
"صاحبِ صدر! آفاقیت کے معنی یہ ہرگز نہیں لئے جاسکتے کہ شاعر اپنے وجود کے احساس کو ختم کردے۔" ملک حسین نے یہ کہہ کر "طبقۂ نسواں"
سلسل سکوت کو توڑا۔
اس غزل کے بعد انورالحسن صدیقی نے اپنی نظم "نوائے مستقبل" تنقید کے لئے پیش کی۔ اس نظم کے سلسلہ میں عوامی اور غیر عوامی شاعری بھی زیر بحث
، نظیر اکبر آبادی اور علی سردار جعفری کے کلام پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ اور اچھا خاصا سلسلہ جاری رہا۔
اتوار ۸ جنوری ۱۹۶۱ء کی شام کو جب میں پاکستان آرٹس کونسل کی عمارت میں داخل ہوا تو دیکھا کہ حلقۂ اربابِ ذوق کی تنقیدی نشست
غاز ہوچکا تھا۔ صورتِ حال کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ انجم اعظمی نے اپنی ایک نظم "محاسب" پیش کی ہے۔ اور یہی موضوع زیر بحث ہے۔ مجھے تاخیر
پہونچنے کا افسوس تھا۔
افضال شیروانی۔ صہبا اختر۔ ضیا جالندھری وغیرہ بحث میں مصروف تھے۔
افضال شیروانی کہہ رہے تھے "صاحب" محاسب کے معنی تو اکاؤنٹنٹ یا آڈیٹر کے ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ کوتوال کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے
صدر محترم! محتسب اور محاسب کے ایک ہی معنی نکالنا مناسب نہیں۔ دوسرے، میرے خیال میں محاسب کا لفظ فنکار کے ضمیر کیلئے آیا ہے
اس عرصے میں ممتاز حسین تشریف لاچکے تھے اور نظم کی نقل دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔
"مغلیہ عہد میں محاسب ریکارڈ کیپر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اور اس نظم میں اس کے یہی معنی ہیں۔"
تب تو بات صاف ہوجاتی ہے۔ جناب صدر! افضال شیروانی نے کہا۔
ضیا جالندھری نظم کی نقل اپنے ہاتھ میں لیکر بولے۔ "صاحبِ صدر اگر مجھے اجازت دیتے ہیں اس سلسلہ میں کچھ عرض کروں۔ دراصل میں نظم
ہ نفسیاتی تجزیے سے بھی واقف ہوں۔ لہذا اس سلسلے میں پہلے میں یہ کہوں گا کہ اس نظم کا عنوان پہلے "سادہ کاغذ" تھا جسے شاعر نے نہایت خوبصورتی
ے کاٹ کر محاسب کا عنوان دے دیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا اس کی وجہ میں بعد میں بیان کروں گا۔ اس پوری نظم میں استقلال کہیں نہیں ہے - بلکہ ایسا
سوس ہوتا ہے جیسے شاعر انتہائی مایوسی کے عالم میں ہے۔ اور فراقِ محبوب نے اسے نہایت نڈھال کردیا ہے۔ اس میں ایک مصرعہ آیا ہے۔ دست گیری
ے لئے کوچۂ جاناں کی ہوا۔ اس میں کتنا بعد ہے اس کا اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ جاناں بھی نہیں بلکہ کوچۂ جاناں کی ہوا۔ اور اس سے بھی صرف
دست گیری کی تمنا ــــــ ! ؟
صاحبِ صدر! یہ کوئی بات نہیں ہوتی۔ کوچۂ جاناں کی ہوا سے مراد جاناں ہی ہے۔ اور اس کی تعبیر اس طرح کرکے ضیا جالندھری صاحب
خواہ مخواہ دوری دکھانے کی کوشش کررہے ہیں۔ صہبا اختر نے کہا۔
اور صاحبِ صدر! اس نظم میں مایوسی کا تو شائبہ بھی نہیں۔ ہجرِ محبوب میں شاعر سرِ رہگزار بیٹھا ہے۔ لغزشِ وہم کے سہارے بھی آگے نہیں

سکتا۔ لیکن تمنا کو جو محبوب تک چلنے کی ہے اس نظم میں تو بڑی جرأت ہے۔" میں نے کہا۔

"صاحبِ صدر! اگر اس نظم کو symbolic way میں سمجھا جائے تو میں اس سے یہ سمجھا ہوں کہ اس نظم میں انسان کی
سے اب تک کی جدوجہد کو اور اس کے ارتقاء کو نظم میں شاعر نے بیان کیا ہے۔ لغزشِ پیہم سے مراد انسان کی تگ و دو ہے اور انسان کے ایثار کی
شی کی گئی ہے۔" افضال شیروانی نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

ضیاؔ جالندھری بولے۔ "صاحبِ صدر! اگر اسی طرح symbolic معنی نکالے جائیں تو میں کہوں گا کہ یہ نظم cold war پر
ی ہے۔ افضال شیروانی نے مکمل اطمینان سے کہا۔

"میں اسے مان لوں گا۔"

اور جس طرح صاحبِ صدر! ابھی اس نظم کی مصرعہ بہ مصرعہ تشریح کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ نظم انسان کی ارتقائی جدوجہد پر لکھی گئی ہے۔
رح میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ نظم اماں جان کی خفگی پر لکھی گئی ہے۔"

یہ ضیا جالندھری کے الفاظ تھے۔

"مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ بسم اللہ۔" افضال شیروانی بولے۔

"صاحبِ صدر! میں ضیاؔ جالندھر صاحب کے اس اندازِ تنقید کے سلسلہ میں شدید protest کرتا ہوں۔ ہمیں ضیا جالندھری
ہے جیسے حلقے کے پرانے رکن سے اس طرح کی تنقید کی ہرگز امید نہیں تھی۔"

"اگر صہبا اختر صاحب میرے اس اندازِ تنقید پر پروٹسٹ کرتے ہیں تو میں پھر کچھ نہیں کہوں گا۔" یہ کہہ کر ضیا جالندھری نے نظم کی نقل ممتاز حسین
حوالے کر دی۔

سب کے سب خاموش ہو گئے۔ ضیا جالندھری نے چند لمحے توقف کیا اور پھر اٹھ کر تیز تیز قدموں سے باہر جانے لگے۔ ممتاز حسین نے آواز دی
"ضیا جالندھری — ! کہاں جا رہے ہو بھئی۔ ؟ سنو تو — ارے ضیاؔ ..... او ہو۔ خفا ہو گئے کیا ...... بات تو سنو۔
... اور یہ کہتے ہوئے ضیاؔ جالندھری کے پیچھے بھاگے —" ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے۔!

پھر دیر تک تنقید کا آغاز ہوا۔

"اس نظم میں [illegible] بہت ہے۔ شاعر اپنے گناہوں کے مرقع کی تشہیر کو فن کا حاصل سمجھتا ہے۔ میں نے کہا۔

"یہ نظم آزاد نظم کی تکنیک کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں کوئی مصرعہ ایسا نہیں جسے ہم زائد کہہ سکیں۔" افضال شیروانی نے کہا۔

صاحبِ صدر! نظم بے حد خوبصورت اور کامیاب ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس میں کئی خوبیاں نظر آئیں۔ یہ نظم مجھے بے حد پسند ہے۔"
ہبا اختر نے آخر میں کہا۔

تنقید ختم ہوئی سب حضرات ممتاز حسین صاحب کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب وہ تشریف نہ لائے تو حاضرین اپنی اپنی نشست
وڈ کرآرٹس کونسل کی عمارت سے باہر نکلے۔ رات کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ اور کاروں کی تیز روشنیاں اہلِ نظر کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

جمعہ ۲ جنوری ۱۹۶۱ء کو جب میں پاکستان رائٹرز گلڈ (کراچی) کی پندرہ روزہ نشست میں شرکت کے لئے ہوٹل ایکسلسیر پہنچا تو حال
ں ادیبوں کا اجتماع پایا۔ نشست کا آغاز ہو چکا تھا۔ مجتبیٰ حسین صدارت کر رہے تھے۔ صادق مدہوش نے ابھی ابھی گزشتہ نشست کی روداد ختم

لی تھی۔ مجتبیٰ حسین کے برابر طفیل احمد جمالی ایک کرسی پر نشستہ تھے۔ میں نے حاضرین کا جائزہ لیا تو ڈاکٹر شمیم ارشاد، مس نعیم ارشاد، ریاض انور، منظر ایوبی، افضال شہروانی، انجم اعظمی، قمر ہاشمی، حسنین کاظمی، منہاج برنا، ن۔م راشد، جمیل الدین عالی، ابن انشار، ضیا جالندھری، عزیز حامد مدنی، غلام عباس، مختار صدیقی، س۔م صولت، ا۔ج۔ علوی وغیرہ کو موجود پایا۔

مجتبیٰ حسین نے ن۔م۔ راشد سے نظم پڑھنے کے لئے کہا۔ راشد صاحب حاضرین کے سامنے آکر کرسی پر بیٹھ گئے۔ صادق مدہوش نظم کی سائیکلو اسٹائل کاپیاں حاضرین میں تقسیم کر رہے تھے۔ ایک نقل مجھ تک بھی پہونچی۔ فل اسکیپ پر چار صفحوں میں پھیلی ہوئی ایک طویل نظم تھی ن۔م راشد نے نظم کا آغاز کیا۔ "دل مرے "صحرا نوردِ پیر دل" وہ کچھ کچھ اہلِ فارس کا سا لہجہ بنا کر نظم پڑھ رہے تھے۔ لوگ دم بخود تھے اور نگاہیں نظم کی نقول پر جمی ہوئی تھیں۔ نظم ختم ہوئی۔ مجتبیٰ حسین نے کہا۔

"آپ حضرات نے ن م راشد صاحب کی نظم سنی۔ اب اس سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار کیجئے۔

سب پر سناٹے کا عالم طاری تھا۔ مجتبیٰ حسین نے عینک کے شیشوں میں سے حاضرین کی سمت متجسس نگاہوں سے دیکھا۔

بالآخر دوبارہ اظہار رائے کی دعوت دی

چند ایک نے کہا صاحب ہم ابھی نظم پڑھ رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔

بہرحال۔ کچھ دیر بعد سہی۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو آپ کو کہنا ہی ہے"

منظر ایوبی نے مجھ سے پوچھا۔ "نظم کا عنوان کیا ہے"

"دل مرے صحرا نوردِ پیر دل" میں نے کہا۔

کیا مطلب؟ وہ کچھ چونک کر بولے۔

سب ابھی تک نظم میں کھوئے ہوئے تھے۔

انجم اعظمی نے بحث کی ابتدا کرتے ہوئے کہا۔

پہلے تو یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ "ریگ" کا سمبل کس حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے۔ مجھے اس نظم میں یوں محسوس ہوا ہے جیسے ریت اور آگ کا سمبل ایک ہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

"نہیں صاحب صدر! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ کسی نے کہا۔

جناب صدر! میرے خیال میں ریت کا سمبل وقت کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اور آگ انسان کے ارتقاء کی خواہش ہے۔ اور صحرا نوردِ پیر دل دراصل نوعِ انسانی کا دل ہے۔

"صاحب میرے خیال میں سمبل پر گفتگو کرنے سے بہتر یہ ہے کہ مجموعی حیثیت سے نظم پر اظہار رائے کیا جائے۔ غلام عباس صاحب آپ اس سلسلہ میں کچھ فرمائیں گے"

"جی۔ یہ نظم میرے خیال میں راشد صاحب کی بہت اچھی نظم ہے۔ اور میرے خیال میں یہ ایک سیاسی نظم ہے۔ اس میں ریگ کا سمبل جنتا یا عوام کے لئے ہے۔ آگ سے جذبہ مراد ہے اور صبح وہ عہد ہے جب انسان دنیا کو بہتر بنانے کی کوششوں میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور ایک پرامن اور دلکش زندگی بسر کرے گا۔ غلام عباس نے کہا۔ اس دوران میں عزیز حامد مدنی مسلسل سر کے اشارے سے اس تشریح کی نفی کرتے رہے۔ "اسلوب کے اعتبار سے

ماحب نے یہ ایک نئی نظم لکھی ہے۔ اور ان کی شاعری میں اس سے ایک نئے موڑ کا آغاز ہوتا ہے۔ غلام عباس کہہ رہے تھے۔

صاحب صدر! مجھے عباس صاحب کے بیان کئے ہوئے معنوں سے اختلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ راشد صاحب نے یہ کوئی اتنی واضح سیاسی نظم ہی ہے۔ اس سے پہلے ان کی نظم "زنجیر" ہمارے سامنے آچکی ہے۔

اس نظم کے بارے میں بس یہ کہوں گا کہ اس میں بعض ایسے سمبل آئے ہیں کہ اگر اس نظم پر ن م راشد کے بجائے فیض احمد فیض کا نام ہوتو اسکے سکل دوسرے انداز سے بدل جائیں گے۔ اور ان سمبل کے کچھ اور ہی مطلب لئے جائیں گے۔ ویسے مجھے غلام عباس صاحب سے یہ پوچھنا ہے کہ افریقہ اور مڈل ایسٹ کا ذکر اس نظم میں آیا ہے تو کیا یہ شعوری طور پر آیا ہے؟

اس کا کچھ جواب نہ ملا۔ انجم اعظمی نے کہا۔

ریت کا سمبل عوام کے لئے نہیں بلکہ کائنات کے لئے معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے آگ کے بجائے ریت ہی کو پوری نظم میں ایک سمبل کے طور پر ل کیا جاتا تو اچھا تھا۔ ہمارے سامنے آگ پر جوش صاحب کی ایک بہت عمدہ نظم آچکی ہے۔

یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ جوش صاحب کے علاوہ کوئی آگ کو سمبل نہیں بنا سکتا۔ یا سب سے پہلے صرف انہوں نے آگ پر نظم لکھی ہے" سین نے کہا۔

"قدیم یونانی شاعری میں آگ کو سمبل بنایا گیا ہے۔ ابن انشا نے کہا۔

ضیا جالندھری نے بڑے شد و مد کے ساتھ احتجاج کرتے ہوئے کہا

"جناب صدر میرے خیال میں ہم نظم کو بہت محدود کر رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی سمبل کو بھی محدود کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس نظم کے سمبل د نظر آتے ہیں"

اس انکشاف پر کچھ لوگ مسکرائے اور کچھ لوگ پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہو گئے۔

عزیز حامد مدنی نے کہنا شروع کیا۔

صاحب! ریگ دراصل ذرۂ ریگ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور یہ انسانی وجود کا سمبل ہے۔ اور آگ انسانی شعور ہے۔ آگ کے شعلے اور رقصاں سینکڑوں رنگ تگ و دو کو ظاہر کرتے ہیں۔ نظم بڑی خوبصورت ہے اور بڑے اچھے انداز میں لکھی گئی ہے۔ صبح کا سمبل اس پُرامن ماحول کے ہے جب انسانی شعور کی تگ و دو مکمل ہو جائے گی۔

مختار صدیقی نے کہا، مجھے مدنی صاحب کی بات سے اتفاق ہے۔ دراصل یہاں ریگ انسانی وجود کا سمبل ہے۔ اور آگ اجتماعی شعور ہے۔ ویسے یہ بھی بہت اعلےٰ درجے کی نظم ہے۔ درحقیقت ابتک جتنی باتیں اس نظم کے ———— متعلق کہی گئی ہیں سب اس میں شامل ہیں۔ اس نظم کو ب سمبل تک محدود کر دینا زیادتی ہوگی۔

اسی دوران میں ڈکشن پر تبصرہ ہوا۔ راشد صاحب جو اس عرصے میں اپنی طویل سائز کی سگریٹ کے کش لے رہے تھے بولے۔ صاحب! مجھے کچھ اجازت دیجئے تو میں یہ عرض کروں گا کہ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ اس لئے مجھے اب اجازت دیجئے۔

مختار صدیقی بھی ان کے ساتھ اٹھ کر چلے گئے۔ بعض حضرات نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ جن کا ماحصل یہ تھا کہ ن۔م راشد کچھ بلکہ بہت کچھ ہو کر گئے ہیں۔

اس کے بعد عزیز حامد مدنی نے غزل پڑھی۔ غزل کو بے حد سراہا گیا۔ ہر ہر شعر پر بے حد داد دی گئی۔ انجم اعظمی نے کہا۔
"صاحبِ صدر اس غزل کو صرف اچھا یا بہت اچھا کہدینا کافی نہیں ہے۔ اس غزل میں نرمی ہے ایک خاص موڈ ہے۔ اس غزل میں بے حد نئی علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ جس سے نئے امکان غزل میں پیدا ہوئے ہیں۔ مثلاً دشت سے زندگی کی رو ایک مثال لے گئی۔ یا ہوا آگ سے فال لے گئی۔ بہت ہی خوبصورتی سے کہا گیا ہے۔

جنوری کا ایک اور قابلِ ذکر اجتماع اردو یونیورسٹی کی تحریک کے سلسلہ میں انجمن ترقی اردو کے دفتر میں طلبائے اردو کالج کے زیرِ اہتمام ہوا۔ اس اجتماع میں حیدرآباد۔ شکارپور۔ لائل پور۔ اوکاڑہ۔ نواب شاہ۔ سکھر اور لاہور کے طلباء اور طالبات کے وفود نے شرکت کی۔ اپنی تقریروں میں طلباء نے یقین دلایا کہ ہم اردو یونیورسٹی کی تحریک میں اپنی تمام تر کوششیں بروئے کار لائیں گے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اردو یونیورسٹی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ جس قوم کی اپنی زبان نہ ہو اسے قوم نہیں کہا جا سکتا۔ بابائے اردو ٹھہر ٹھہر کر رعب دار آواز میں اپنی بات کہتے رہے۔

علی مختار رضوی نے اردو کالج کے طلباء کی طرف سے ایک پرجوش تقریر کی اور یقین دلایا "ہم بابائے اردو کی سرپرستی میں اردو یونیورسٹی قائم کر کے رہیں گے۔

امداد نظامی نے "بابائے اردو" پر ایک نظم پڑھی۔ اس جلسے میں طلباء کے علاوہ ابراہیم جلیس۔ طفیل احمد جمالی۔ فخر ماتری اور جون ایلیا وغیرہ نے شرکت کی۔

بیڑی مرچنٹس ایسوسی ایشن کراچی کے صدر محمد مسلم اکبرآبادی مہمان خصوصی کی حیثیت رکھتے تھے۔ موصوف نے اپنی جیب سے پندرہ سو (۱۵۰۰) روپے اور ایسوسی ایشن کی جانب سے ایک ہزار روپے پیش کئے۔ کراچی پان مرچنٹس ایسوسی ایشن کی طرف سے ابراہیم جلیس نے چودہ سو روپے نقد پیش کئے۔ اور اس طرح سرفروشانِ اردو نے اردو یونیورسٹی کی تحریک کو عملی حیثیت سے ایک منزل اور آگے بڑھا دیا۔ یقیناً اردو یونیورسٹی اس عہد کی سب سے بڑی ضرورت ہے جسے ہم سب کو مل کر مکمل کرنا چاہیئے۔

(بقیہ صک۵)

اصول قائم رہیں اور ملک میں نئی اصلاحات نافذ کی جائیں پس جب تک کہ یہ مقاصد پورے نہیں ہو جاتے نیشنل اسمبلی اپنے اجلاس اور اپنے مباحث جاری رکھے گی۔ خواہ اس کے اجلاس کہیں بھی منعقد ہوں بنا بریں نیشنل اسمبلی کے تمام ممبروں کو ہر حال میں اپنے فرائض بجا لانے کا حلف اٹھانا چاہیئے۔

چنانچہ وہیں شاہی ٹینس کورٹ میں تمام ممبران اسمبلی نے حلف اٹھایا اور حلف نامے پر اپنے اپنے دستخط کئے۔ صرف ایک ممبر یعنی مارٹن ڈچ نے اپنے نام کے آگے "مخالف" کا لفظ اور حسب ذیل جملہ تحریر کیا۔

"میرے خیال میں بادشاہ کی مرضی کے خلاف اس قسم کے حلف اٹھانا درست نہیں"

ٹینس کورٹ کے حادثے نے بادشاہ کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ قومی اسمبلی کے چھ سو ممبر اب قابو سے باہر نکل چکے ہیں اور صرف فوجی طاقت کا استعمال ہی انہیں طلبِ حقوق سے باز رکھ سکتا ہے۔ بادشاہ کی خوبصورت ملکہ میری مُصر تھی کہ نائبوں کے خلاف لوہا اور بارود کی طاقت استعمال کی جائے لیکن لوئی ہتھیاروں کے ٹکراؤ سے ڈرتا تھا۔

رئیس امروہوی

جب عوام تنگ آجاتے ہیں

۲۱ر جنوری - پیر کا دن ———————

قتل گاہ چلنے کے لئے تیار ہو جائیے ———! ہم نے ایک نعرے کی گونج سنی

لیکن اچانک ڈھول تاشے بجنے لگے اور یہ نعرہ اُن کے شور میں ڈوب گیا ———

دیواروں اور درختوں پر تماشائی چڑھے ہوئے ہیں مائیں اپنے بچوں شوہر اپنی بیویوں

اور نوجوان اپنی محبوباؤں کے ساتھ اس عجیب و غریب نظارے کو دیکھنے آئے ہیں

——— لیجئے وہ موت کا جلوس آپہنچا ——— انقلاب زندہ باد ———

اور یہ اُسکی زلفوں کے بال ہیں ——— جلاد کا معاون نیلامی بولیاں بول رہا تھا۔

سورج کی ایک تیز کرن۔ پیرس کی کہر آلود فضا کو چیرتی ٹاور کے قید خانے میں در آئی اور لوہے کی زنگ آلود سلاخوں سے گذر کر قید خانے کے نم آلود اندھیرے حجرے میں پھیل گئی۔ یہ ۲۱ر جنوری (۱۷۹۳ء) کی بھیانک صبح تھی موسم سرما کا سورج شفق کے خون میں ڈوب کر پیرس کے افق پر ابھرا تھا۔ ۲۱ر جنوری پیر کا دن۔ جب فرانس کے قومی کنونشن کے حکم پر خاندانِ بوربون کے آخری حکمراں لوئی شانزدہم کا سر گلوٹین سے قلم کیا جانے والا تھا۔

لوئی اس رات بہت کم سو سکا ہوگا۔ صرف اسی لئے نہیں کہ یہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔ بلکہ اس لئے بھی کہ ہر آدھ گھنٹے بعد ٹاور کے قید خانے کے پہرہ دار کھردرے فوجی بوٹوں سے کھٹ کھٹ کرتے آتے اور شاہی قیدی کے حجرے میں جھانک جاتے۔ نہ جانے کیوں۔ یہ ڈر اُن کے دل میں سما گیا تھا کہ اچانک کوئی معجزہ رونما ہوگا اور نظر بند بادشاہ۔ قید خانے کی کوٹھری سے غائب ہو جائے گا۔ صبح چھ بجے فوجی پہرہ داروں کے حلقے میں ایک دراز ریش پادری۔ شاہی قید خانے میں داخل ہوا۔ اور بدنصیب لوئی نے عشائے ربانی (COMMUNION) میں شرکت کی۔ جب پادری ساڑھے سات بجے رخصت ہونے لگا تو قریب المرگ لوئی نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ جو کچھ دیر بعد گلوٹین کے دھار دار چاقو سے قطع ہونے والی تھی۔

۸۔ بجے۔ ٹاور کے پہرہ داروں نے، قید خانے کے تمام راستوں اور دروازوں پر پہرے بٹھادئے اور لوئی کو اطلاع دی کہ قتل گاہ چلنے کے لئے تیار ہوجائیے!

ساڑھے آٹھ بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ لوئی نے اپنا لباس بدلا۔ اور جیلر سے۔ جو قریب ہی کھڑا تھا۔ بڑی دھیمی آواز میں کہا

چلو —!

ٹاور کے قید خانے سے لوئی کی قتل گاہ کے ۲ ½ میل لمبے راستوں پر، دونوں طرف۔ پیرس کے لوگوں کی دوہری صفیں کھڑی ہیں۔ ان میں عورتیں بھی ہیں اور بچے بھی۔ جوان بھی ہیں اور بوڑھے بھی۔ عورتوں نے بچوں کو کاندھے پر چڑھا رکھا ہے۔ تاکہ وہ بھی شاہی قیدی کے سفر قتل کا تماشا دیکھ سکیں۔ وہ دیکھو موت کا جلوس آرہا ہے۔ لوئی کا زندہ جنازہ! جلوس کے آگے سینٹر (قومی اسمبلی کا ایک سرکردہ رکن) گھوڑے پر سوار ہے۔ سینٹر کے پیچھے نیشنل گارڈز کا مسلح دستہ ہے اور اس دستے کے عقب میں سرخ رنگ کی ایک بند گاڑی۔!!

بادشاہ اس بند گاڑی میں اپنے مقتل —— اپنی قبر کی طرف جارہا ہے۔ (یا لے جایا جارہا ہے)

جلوس ابھی ربو سینٹ ڈینس اور بارون ڈی باز کے نکڑ پر پہنچا تھا کہ مجمع میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی۔

مارکوئس۔ ڈی۔ لا۔ ٹور۔ ڈو۔ پن کا بیان ہے کہ

میں اپنی بیوی کے ساتھ مکان کی کھڑکی میں بیٹھا۔ لوئی کے سفر قتل کا نظارہ دیکھ رہا تھا کہ ہم نے ایک نعرے کی گونج سنی

eULENT SAUVER LE ROI [1]

لیکن اچانک ڈھول تاشے بجنے لگے اور اتنے زور سے کہ یہ اکلوتا نعرہ اُن کے شور میں ڈوب گیا۔ بعد کو پتہ چلا کہ بعض شاہ پرستوں نے جلوس پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر عوام اور نیشنل گارڈ نے ان کی کوشش کو ناکام بنادیا۔

نو بج کر ۴۰ منٹ ہوئے ہیں پیلیس ڈی لا ریوولیشن پر اب تک کُہر چھائی ہوئی ہے۔ مگر اسی کُہر آلود دُھندلی فضا میں انقلابی سپاہیوں کے برچھی خود اور نیزوں کی اَنیاں لپک رہی ہیں پیلیس ڈی لا ریوولیشن کے میدان کے بیچوں بیچ۔ اک چبوترے پر گلوٹین کا آلہ رکھا ہے اور وہاں سے چالیس پچاس گز کے فاصلے پر پیرس والوں کے ہجوم صف باندھے کھڑے ہیں۔ سامنے ٹوی لریز کے شاہی محلات ہیں جنکی دیواروں اور درختوں تک پر تماشائی چڑھے ہوئے ہیں۔ مائیں اپنے بچوں، شوہر اپنی بیویوں۔ بوڑھے اپنے ساتھیوں اور نوجوان اپنی محبوباؤں کے ساتھ اس عجیب و غریب نظارے کو دیکھنے آئے ہیں۔ لیجئے وہ موت کا جلوس آپہنچا۔ اور مجمع نے گلے پھاڑ پھاڑ کر تین مرتبہ انقلاب زندہ باد! کا نعرہ بلند کیا۔ اور اُس کے بعد چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لوئی نے بند گاڑی میں اپنا سر جھکا لیا اور پانچ منٹ تک دعا کرتا رہا قتل گاہ کے مہتمم نے۔ بند گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اور معزول بادشاہ آہستگی کے ساتھ قدم اٹھا کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔ اگی ورتھ نے۔ جو بادشاہ کا وفادار ملازم تھا۔ اپنا کاندھا پیش کردیا [2]۔ لوئی اگی ورتھ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر نپے تُلے قدموں کے ساتھ قتل گاہ کے چبوترے پر چڑھا۔ ٹھیک اُسی وقت لوگوں نے بے تحاشا ڈھول پیٹنے شروع کردئے جن کے شور سے پلیس ڈی۔ لا ریوولیشن کی فضائیں گونج اُٹھیں۔ ایک لمحے تک لوئی

---

[1] یہ ویسا ہی نعرہ ہے جیسا ۱۱۱۱ء میں عراق کے انقلاب پسندوں نے واقعۂ کربلا کے بعد بلند کیا تھا یالثارات الحسین

[2] یہ سوال بار بار کیا گیا ہے کہ لوئی کو مجمع عام کے سامنے قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن کنونشن کے لیڈروں نے اس کا بڑا معقول جواب دیا تھا انہوں نے کہا تھا کہ اس طرح شاہ پسندوں کی ہمتیں پست ہوجائیں گی۔ اور یہ خیال — صحیح تھا۔

غور سے مجمع کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے ڈھول پیٹنے والے مجمع کو ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا۔ اور اچانک باجے بجنے بند ہو گئے [1]

اِس ہیبت ناک خاموشی میں لوئی کی آواز آہستہ آہستہ گونجی۔

لوگو! ـــ میں بے گناہ ہوں لیکن میرے قتل سے تمہیں خوشی نصیب ہوتی ہے تو میں اطمینان کی موت [2] مرنے کے لئے تیار ہوں

ابھی لوئی کا فقرہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ مجمع سے نعرہ بلند ہوا۔

VIVE LA NATION (قوم زندہ باد)

لوئی نے اپنی قبا اتار دی۔ چار مسٹنڈے جلّادوں نے بادشاہ کے بازو پکڑے اور جس طرح گنّا پیلنے کے لئے کولہو میں چڑھایا جاتا ہے لوئی کا سر گلوٹین کے شکنجے میں کسا جانے لگا۔

اِس حادثے سے متعلق فرانس کی انقلابی اسمبلی کی طرف سے حسب ذیل کمیونیکے (اعلامیہ) جاری کیا گیا۔

۲۱ جنوری۔ پیر کے دن۔ دس بجکر بیس منٹ ہوئے تھے کہ انقلاب کے قیدی کی گردن گلوٹین میں دے دی گئی اور دس بج کر بائیس منٹ پر لوئی کا سر قلم کر دیا گیا۔ "انقلاب زندہ باد"

یہ لوئی کا تکونا سہ رنگا ہیٹ ہے

دس فرانک!

پندرہ فرانک۔

پچاس فرانک!

آخر یہ ہیٹ ایک سَو فرانک میں وہیں اور اُسی وقت نیلام کر دیا گیا

اور یہ اُس کی زلفوں کے بال ہیں!

دو سو فرانک!

اور ہاں یہ اس کا ہیئر ربن ہے

بولی بولو ـــ

جلّاد کا معاون۔ نیلامی بولیاں بولے جا رہا تھا اور قتل گاہ کے تماشائی۔ بڑے جوش و خروش کے ساتھ۔ بادشاہ کے خون آلود سر کے بال ہیئر ربن اور دوسرا اسباب خرید رہے تھے ـــ البتہ مقتول حکمراں کے براؤن کوٹ۔ اور مینا کاری کے نیلے بٹن نیلام سے محفوظ رکھے گئے۔ اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تماشائیوں میں بانٹ دیا گیا۔ بعض منچلے تماشائی پہرہ داروں کے روکنے کے باوجود چبوترۂ قتل پر چڑھ گئے۔ جہاں لوئی کی لاش خون میں نہائی ایک طرف پڑی تھی۔ اُنہوں نے یادگار کے طور پر اپنے رومال بادشاہ کے خون میں رنگے۔ بعضوں نے اپنی اپنی تلواریں نکال کر۔ انہیں مقتول بادشاہ کا خون چٹایا۔ جن کے پاس کچھ نہ تھا۔ انہوں نے کاغذ کے پُرزے ہی لوئی کے خون سے بھگو لئے کہ یادگار کے طور پر محفوظ رہیں۔

---

[1] مجھے اِن سطور کی تحریر کے وقت۔ میر انیس کا وہ مصرع کتنا یاد آ رہا ہے۔ ہو گئے جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش

[2] لوئی کا اصل فقرہ Peuple je meurs innocent جو تاریخ میں محفوظ ہے

بہت سے انتہا پسندوں نے لوئی کی لاش کے گرد رقص کرتے ہوئے انقلابی گیت (MARSEILLEISE) چھیڑ دیا[1] لیکن ہمیں انقلاب فرانس کی تاریخ میں جہاں ایسے دل ہلا دینے والے واقعات ملتے ہیں۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً موسیو فاورٹ کی زبان سے اُن کا ایک واقعہ سُنئے (موسیو فاورٹ خود زبردست انقلاب پسند تھے) وہ بیان کرتے ہیں کہ جس وقت لوئی شانزدہم کو قتل کیا جا رہا تھا۔ تو میری والدہ مجھے اپنے ساتھ ایک اندھیرے کمرے میں لے گئیں۔ ہم دونوں گھٹنوں کے بل جھک گئے اور ہم نے رو رو کر بادشاہ کی مغفرت کی دعائیں مانگیں!

یہی نہیں — بلکہ جرمنی میں سرکاری طور پر لوئی کی موت کی یادگار میں ایک ماتمی تمغہ جاری کیا گیا۔ خود پیرس میں بعض دیوانے شاہ پرستوں نے فداکاری کے مظاہرے کئے۔ مثلاً لی پلی ٹائر کو جو جیکو بائنیس پارٹی (مخالف شاہ جماعت) کا ڈپٹی لیڈر تھا۔ ایک شاہ پرست نے سر بازار حملہ کر کے مار ڈالا یہ شخص اصل میں بادشاہ کے چچیرے بھائی اور لینز (ORLEANS) کو قتل کرنا چاہتا تھا جس نے کنونشن میں بادشاہ کی موت کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ تاہم مجموعی حیثیت سے پیرس والوں نے لوئی کے یوم قتل کو "یوم جشن" کی طرح منایا۔ لوئی کے قتل کے بعد شہر کے تمام کیفے اور ہوٹل کھل گئے۔ شراب خانے سجائے گئے محلّوں میں جلوس نکالے گئے اور پیرس کے میئر نے کنونشن کو جاکر اطلاع دی کہ

"شہر پُر سکون ہے۔ عوام بادشاہ کے قتل کا جشن منا رہے ہیں"[2]

اور درحقیقت میئر کا بیان صحیح تھا۔ پیرس میں وہ ہفتہ — جشن قتل کا ہفتہ تھا۔

شاہ فرانس کے قتل کے ایک ہفتے بعد۔ پرنس ڈی کونڈے نے اپنی قیام گاہ ولن گن محل میں سوگواروں کا ایک جلسہ طلب کیا جس میں لوئی کی مغفرت کیلئے دعا مانگی گئی اور لوئی ہفتہ ہم[3] کے نام سے ولی عہد کو اُس کی عدم موجودگی میں فرانس کا حکمران تسلیم کیا گیا۔ بادشاہ کے چھوٹے بھائی[4] "کومٹ ڈی پروونس" نے جو اُس زمانے میں فرانس سے باہر جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ کومٹ ڈی آرٹوئس[5] کے نام اپنے تعزیت نامے میں لکھا ہے کہ

بھائی قتل ہو گئے اور بوربون خاندان تباہ ہو گیا۔ آپ حضرات نے میرے بھتیجے کو شاہ فرانس تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن وہ غریب بھی باغیوں کے ہاتھ سے بچنے والا نہیں۔ لوگ میرے مرحوم بھائی کی موت پر آنسو بہا رہے ہیں اور میری بدنصیب آنکھیں خون برسا رہی ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ لوئی کے قتل سے فرانسیسی قوم کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ میں صرف اسی امید پر دل کو ڈھارس دے لیتا ہوں۔

اسی تعزیت نامے کے آخر میں بادشاہ کے چھوٹے بھائی نے کومٹ ڈی آرٹوئس کو وصیت کی تھی کہ میں عنقریب اپنے بھائی کے پاس جانے والا ہوں اور وصیت کے طور پر تمہارے بیٹے کو۔ شاہی خاندان کا وارث قرار دیتا ہوں[6]

اس خط سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شاہی خاندان کے افراد ایک دوسرے کو کتنا چاہتے تھے؟

مگر وہ گلوٹین ؟

---

[1] لوئی کے ساتھ ۲۱۔ جنوری ۱۷۹۳ء کو پیرس کے عوام نے جو کچھ کیا۔ وہ اس سے بہت کم ہے جو ۱۴۔ جولائی ۱۹۵۸ء کو بغداد کے شورش پسندوں نے شاہ فیصل۔ نوری السعید فیصل کی ماں اور بہن وغیرہ کے ساتھ کیا تھا۔ مثلاً بادشاہ کی لاش سڑکوں پر کھینچتے پھرے تھے۔

[2] لوئی کے واقعات قتل بڑے دردناک نظر آتے ہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ تاریخ کے ہر انقلاب میں یہی ہوا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں روس کے زار نکولس ثانی اور اسکے خاندان کے ساتھ انقلابیوں نے اس سے بدتر سلوک کیا تھا۔ [3] LOUIS XVII [4] یہ بھی بادشاہ کا بھائی تھا۔

[5] بوربون خاندان کو نپولین کے زوال کے بعد پھر فرانس پر حکومت کرنے کا موقع ملا تھا لیکن وہ ناکام رہے اور بوربون خاندان درحقیقت۔ لوئی شانزدہم پر ہی ختم ہو گیا اور پھر شاہی نظام کو بحال کرنے کی ہر کوشش ناکام رہی۔

[6] کومٹ ڈی پروونس کی غلط کاریوں کا خمیازہ ملکہ کو بھگتنا پڑا جس کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔

جس گلوٹین سے لوئی کا سر قلم کیا گیا۔ وہ گلوٹین کس نے تیار کی تھی؟

فرانس کے انقلاب پسندوں نے؟

نہیں!

قومی اسمبلی نے؟

نہیں!

انقلابی حکومت کے جلادوں نے۔؟

نہیں!

تو پھر؟

یہ گلوٹین خود لوئی نے اپنے لئے تیار کی تھی۔ بدنصیب نے اپنی قبر خود کھودی تھی۔ لوئی چبوترۂ قتل پر چڑھنے سے قبل کتنی ہی مرتبہ اُس پر قدم رکھ چکا تھا اس برگشتہ بخت حکمراں نے فرانس کے ۲½ کروڑ عوام (۲۵ ملین افراد) سے ٹکر لینے کی کوشش کی اور آخرکار خود تباہ ہوگیا۔ انقلاب فرانس، شاہی استبداد کا قدرتی نتیجہ تھا۔ یہ کوئی معمولی سیاسی تحریک نہ تھی۔ ایک ہمہ گیر فکری، روحانی، نظریاتی، ادبی، شعری، تہذیبی، سیاسی، معاشی اور طبقاتی زلزلہ تھا جس نے اٹھارویں صدی کے آخری گیارہ سال میں فرانس ہی نہیں ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ انقلاب روسو اور والٹیر جیسے دانشوروں کے ذہن سے پیدا ہوا تھا قلم نے تلواروں کو جنم دیا تھا۔ دوات نے زہر اور خون اگلا تھا اور کتاب سے ایک نئی دنیا طلوع ہوئی تھی۔ اس انقلاب کا نعرہ تھا۔

جمہوریت۔ اخوت۔ آزادی اور مساوات!

اس سے قبل یہ نعرے کسی نے اتنے وسیع پیمانے پر کہاں سنے تھے؟ بیسویں صدی کا سب سے بڑا واقعہ، انقلاب روس کا واقعہ ہے لیکن خود انقلاب روس اپنی تمام تفصیلات، اپنی تمام جزئیات اور اپنے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے فرانسیسی انقلاب کا چربہ ہے اُس کی نقل ہے ـــ آپ پچھلے پندرہ سال کے واقعات پر ہی نظر ڈال لیجئے۔ ان پندرہ سال میں ہم کتنے انقلابوں سے گذرے۔ انقلاب چین۔ انقلاب شام۔ انقلاب مصر، انقلاب عراق۔ انقلاب سوڈان انقلاب انڈونیشیا، انقلاب ہند چینی، اور ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم پاکستان کا انقلاب اکتوبر (۱۹۵۸ء) ـــ یہ تو ہوئے ایشیا کے حالیہ انقلابات ـــ جہاں تک یورپ و جنوبی امریکہ کے انقلابی حوادث کا تعلق ہے تو ـــ اطالیہ۔ فرانس۔ البانیہ۔ زیگوسلاویہ۔ چیکوسلاویہ۔ پولینڈ۔ ہنگری، مشرقی جرمنی لتھونیا، اسٹونیا، لٹاویا۔ یا پھر کیوبا، ارجنٹائن۔ پیرو۔ گوئٹے مالا وغیرہ۔ ان میں سے کون سا ملک ایسا ہے۔ جو انقلاب کی آگ سے نہیں گذرا[۵۱]۔ مگر ان سب کی تہ میں، انقلاب فرانس کی بھڑکائی ہوئی چنگاریاں سلگ رہی ہیں۔ وہی آزادی۔ وہی جمہوریت۔ وہی لادینی ریاست اور وہی قومیت کے نعرے! بے شک یہ سب کچھ انقلاب فرانس کی دین ہے[۵۲]

مئی ۱۷۸۹ء کا ذکر ہے

انقلاب کی ابتدا عجیب تھی۔

اٹھارویں صدی کے آخر کا فرانس ہے اور لوئی شانزدہم پندرہ سال سے نامطمئن اور ناآسودہ فرانسیسیوں پر حکومت کر رہا ہے۔ بوربون خاندان کی یہ روایت بھی تھی کہ وہ شاہی اقتدار کی جڑوں کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لئے کبھی کبھی جرنیلوں، پادریوں اور خاندانی امیروں کا جلسہ طلب کر لیا کرتے تھے۔ لوئی کی

---

[۵۱] واضح رہے۔ ڈی گال کا سامراجی فرانس نہیں ـــ روسو کا ـــ انقلابی فرانس   [۵۲] حال ہی میں حبش اور لاؤس (ہند چینی) بھی اس امتحان سے دوچار ہوگئے۔

حسین ترین ملکہ میری انطوانی [1] Marie Antoinette نے اپنے تاجدار شوہر کو مشورہ دیا کہ پارلیمنٹ کا جلسہ طلب کرنا چاہئیے۔ تاکہ جرنیلوں امیروں اور پادریوں کی سرگرم حمایت حاصل ہو سکے۔

۵۔ مئی ۱۷۸۹ء کو ورسیلز میں اسٹیٹس جنرل (فوجی عہدہ دار وغیرہ) کا ابتدائی اجلاس ہوا۔ یہ جلسہ ڈیڑھ سو سال کے بعد پہلی مرتبہ منعقد ہوا تھا [2] اب تک فرانس میں پارلیمنٹری نظام حکومت کا کوئی تصور ہی موجود نہ تھا۔ نہ کوئی پارلیمانی آئین تھا۔ نہ انتخابی روایات تھیں نہ سیاسی پارٹیوں کا رواج تھا۔ بس یونہی۔ بادشاہ وقت نے جب چاہا۔ اُمراء کو مشورے کے لئے طلب کر لیا۔ اس اجتماع کو پارلیمنٹ کہا جاتا تھا۔ ورسیلز کے جلسے کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ بحث و مباحثے میں کن قاعدوں کو برتا جائے۔ لوئی شانزدہم کے وزیر مالیات (کنٹرولر جنرل آف فائنینس) ایٹین چارلس لومنی برن نے جو ٹولوز (شاہی محل) کا آرچ بشپ (اسقفِ اعظم) بھی تھا مشورہ دیا کہ ملک کی تمام جماعتوں سے اِس سلسلے میں رائے طلب کی جائے۔ چنانچہ قومی پارلیمنٹ کے قواعد بنانے کے لئے تمام فرانس سے قدیم ریکارڈ طلب کئے گئے۔ دو مہینے بعد۔ لومنی برن کا زوال ہو گیا اور اصلاح پسند نیکر (NECKER) وزارت مالیات کے عہدے پر فائز ہوا۔ اور اُس نے پارلیمنٹ کا دائرہ وسیع کر دیا یعنی قوم کے مزید نمائندوں کو جلسے میں شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ ۴۲ اشراف نے یہ دعوت قبول کر کے ۶۔ نومبر کو پارلیمنٹ کے جلسے میں شرکت کی وہ چھ ضمنی کمیٹیوں میں بٹ گئے جن کے صدر شاہزادے تھے۔ نیکر نے تجویز پیش کی کہ جرنیلوں کا جلسہ ورسیلز کے بجائے دارالحکومت پیرس میں طلب کیا جائے لیکن بادشاہ نے یہ تجویز ٹھکرا دی۔ کیونکہ لوئی کو شکار کی دھن تھی اور وہ صرف ورسیلز کے قریب ہی مل سکتا تھا۔

جلسے سے قبل لوئی نے پارلیمنٹ کے ممبروں کو شرفِ ملاقات بخشا۔ یہ تقریب دن کے گیارہ بجے سے ۸ بجے رات تک جاری رہی۔ اگرچہ بادشاہ تقریب کی طوالت سے اُکتا گیا تھا لیکن اُس نے اپنی کبیدگیٔ خاطر کا اظہار نہ ہونے دیا۔ ۴ مئی کو۔ پارلیمنٹ کے نائب (DEPUTIES) ایک جلوس کی شکل میں VENI CREATOR گانے کے لئے۔ کلیسائے سینٹ لوئس تک گئے۔ یہ بڑا شاندار اور تاریخی دن تھا۔ لوئی کے سر پر جواہر نگار تاج جگمگا رہا تھا۔ اور وزیر شاہزادے۔ امراء۔ فوجی جرنیل۔ اُسے اپنے حلقے میں لئے ہوئے تھے۔ چرچ سے باہر ورسیلز کی سڑکوں پر پانچ لاکھ انسان شاہ اور امراء کے جلوس کا خیر مقدم کرنے کے لئے موجود تھے۔

پارلیمنٹ کے ایک ڈپٹی (نائب) کا بیان ہے کہ

"آج میں نے فرانس کی تمام شان و شوکت اور دھوم دھڑکے کو ایک جگہ جمع دیکھا۔"

ورسیلز میں نائبوں کے جلسے۔ دی سیل ڈس مے نس پی سائرس ڈیوریو۔ نامی ہال میں منعقد ہوتے تھے۔ ۵۔ مئی ۱۷۸۹ء کو پارلیمنٹ کے افتتاحی جلسے کو خود بادشاہ نے مخاطب کیا۔ لوئی کا جلوس ایک بجے دن کے ہال میں داخل ہوا۔ میرابو کا بیان ہے کہ اُس وقت جلسے میں جوش و خروش کی زبردست لہر دوڑی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے اپنی افتتاحی تقریر کو ایک طرح کی جذباتی اپیل بنا دیا تھا۔ اُس نے نائبین کو مخاطب کر کے کہا کہ

حضرات!

"کہا جاتا ہے کہ پورے ملک میں بے چینی اور بیزاری پھیلی ہوئی ہے۔ ہر شخص کو تبدیلی کی خواہش ہے اور جلد از جلد۔ بڑے مبالغے اور بڑی شدت پسندی کے ساتھ۔ لیکن ٹھہرئیے۔ یہ سمجھ داری [3] کا طریقہ نہیں۔ ہمیں عقلمندوں اور دانشوروں کے مشورے پر قدم اٹھانا چاہئیے۔ آئیے ہم ٹھنڈے دل سے اپنے معاملوں پر سوچ بچار شروع کریں۔

---

[1] اپنے عہد میں فرانس کی سب سے زیادہ خوبصورت عورت ـــ غالباً یورپ کی۔ [2] فرانسیسی تاریخ میں جرنیلوں۔ پادریوں اور امراء کے ہنگامی جلسے ۱۳۰۲ء، ۱۴۸۴ء اور ۱۶۱۴ء میں بھی منعقد ہوئے تھے۔ [3] مجھے تو سمجھ داری میں کوئی عیب نظر نہیں آتا (رئیس)

۱۶۰۷ء،؟

—— ٹھنڈے دل کے ساتھ؛ بادشاہ کے اس مشورے نے اُن نائبوں کے جوش وخروش کو ٹھنڈا کر دیا جو پارلیمنٹ کے افتتاح سے بڑی بڑی تبدیلیوں کی آس لگائے ہوئے تھے۔ بہرحال پارلیمنٹ کے سامنے حسب ذیل امور بحث و مباحثے کے لئے پیش کئے گئے۔

(۱) اخبارات کی آزادی

(۲) امن و امان کا قیام اور فوجداری اور نظام تعلیم کی اصلاح

(۳) ضابطۂ تعزیرات کی اصلاح

وزیر مالیات نکر نے جلسے میں اعلان کیا کہ اس سال فرانس کو آمد و خرچ میں نو دلاکھ اسّی ہزار فرانک کا گھاٹا ہوگا لیکن ملک کو دیوالیہ ہونے سے بچانے کا طریقہ یہ نہیں کہ پارلیمنٹری سسٹم نافذ کر دیا جائے۔ یہ ہے کہ وزراء کے اختیارات میں مزید اضافہ ہو۔

نمائندوں کے دباؤ سے جون میں پارلیمنٹ کے دائرہ نمائندگی میں مزید توسیع کی گئی اور ۴۔ جولائی کو پیرس کے عوامی نمائندے بھی ورسیلز آکر پارلیمنٹ کے جلسے میں شریک ہو گئے۔ ۱۷۔ جولائی کو نمائندوں نے اصلاحات کے مسئلے پر بحث شروع کی اور فوراً ہی محسوس ہو گیا کہ نئے نمائندوں کا مزاج بگڑا ہوا ہے۔ لوئی کو اب اندازہ ہوا کہ اس نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ کر کتنی بڑی حماقت کی ہے۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور پارلیمنٹ میں عوامی نمائندے بنیادی اصلاحوں کا مطالبہ کرنے لگے تھے [۱] —— لوئی نے یہ دیکھ کر حالات برابر بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے ناظم تقریبات کو حکم دیا کہ فی الحال پارلیمنٹ کے جلسے ملتوی کر دیئے جائیں چنانچہ شاہی ناظم تقریبات مارکوئس ڈی ڈریکو نے پارلیمنٹ میں آکر اعلان کیا

شریفو! بادشاہ کا حکم ہے کہ پارلیمنٹ کو فی الحال برخواست کر دیا جائے

اس اعلان پر اصلاح پسند میرابو اپنی نشست گاہ سے اٹھا اور اس نے مارکوئس سے کہا کہ

اب صرف سنگینوں کے بل پر ہی ہمیں یہاں سے نکالا جا سکتا ہے

پیرس کے نمائندے بیلے نے جواب دیا کہ

آپ اعلیحضرت کو مطلع کر دیجئے کہ ہم اب بغیر آزادانہ بحث مباحثے کے پارلیمنٹ کو ملتوی کرنے پر تیار نہیں۔!

کیا —— ناظم تقریبات نے چیخ کر کہا۔ یہ ہے وہ جواب۔ جو میں اعلیحضرت کو جا کر دوں۔ یہ ہے وہ جواب؟

ہم مجبور ہیں۔ بیلے نے جواب دیا۔ ہم ایک آزاد قوم کے نمائندے۔ اور اعلیحضرت کی باشعور رعایا ہیں اور ہم یہاں فرانس کے مستقبل پر غور و فکر کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔

پارلیمنٹ کے یہ تیور دیکھ کر رجعت پسندوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ اور ملکہ نے بادشاہ سے اصرار کیا کہ ہتھیاروں کے بل پر۔ قومی نمائندوں کو مار بھگا یا جائے —— لیکن کمزور لوئی کو بھلا اس کی جرات کیوں ہوتی؟

پیرس جاگ اٹھا

جب پیرس میں ماہسیلز کی خبریں پہنچیں اور دارالحکومت کے باشندوں کو پتہ چلا کہ رجعت پسند رجعہ بادشاہ کو گھیرے ہوئے ہیں اطاقت کے بل پر پارلیمنٹ کو منتشر کر دینا چاہتے ہیں تو وہ غصے سے بھڑک اٹھے اور رجعت پسند پارٹی کے خلاف پیرس والوں نے "خروج [۲]" کا ارادہ کر لیا۔ آہستہ آہستہ شہر میں

---

[۱] بعض لوگ حیران ہوں گے کہ لوئی نے اصلاح پسند نمائندوں کو پارلیمنٹ میں شرکت کی دعوت ہی کیوں دی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اُسے فرانس کی عام بے چینی نے مجبور کر دیا تھا۔ گو وہ اس صورت حال سے مطمئن نہ تھا۔ [۲] یہاں صحیح اور برمحل لفظ خروج ہی ہے۔ بغاوت نہیں

سرکشی کی آگ پھیل گئی یہاں تک کہ پیرس کے پہرہ دار بھی کھلم کھلا انقلابیوں سے جا ملے۔

اس دوران میں پارلیمنٹ کے جلسے ر بادشاہ کی مرضی کے خلاف، برابر جاری رہے۔ آخر کچھ پیچ بچاؤ کے بعد لوئی کے ایما پر پارلیمنٹ کے تینوں طبقوں پادری، امرا، اور عوام کے درمیان بناوٹی ملاپ سا ہو گیا اور ان تینوں گروہوں نے فرانس کا نیا آئین بنانے کے لئے اسمبلی نیشنل کانسٹی ٹیوشنلے کے نام، ایک نئی جماعت مرتب کی۔ یہ عوام کی فتح تھی چنانچہ پارلیمنٹ کے حکم سے اس موقع کی یادگار میں ایک میڈل جاری کیا گیا[1] جس پر تین آدمیوں کی تصویریں تھیں خاندانی امیر، پادری اور عام آدمی — فرانس کے طبقاتی اتحاد کی نشانی -!

۵ مئی اور ۲۷ جون کی درمیانی مدت میں پارلیمنٹ نے اصلاحات کے مسئلے پر اپنے مباحثے جاری رکھے۔ اب پارلیمنٹ "نیشنل اسمبلی" میں تبدیل ہو چکی تھی اور اس نے وقتی مسائل کے بجائے اپنے کو آئین سازی کے لئے وقف کر دیا تھا۔ نیشنل اسمبلی کے نائبوں کی اکثریت متوسط طبقے پر مشتمل تھی۔ ان میں ۵۵ فیصدی چالیس سال سے زیادہ عمر کے تھے اور صرف چھ فیصدی تیس سال سے کم عمر کے — اور پیشے کے اعتبار سے؟

پچاس فی صدی قانون داں!

بارہ فی صدی انتظامی شعبوں سے تعلق رکھنے والے!

بارہ فی صدی۔ تجارت پیشہ

آٹھ فی صدی۔ جائدادوں کے مالک

سات فی صدی۔ زراعت پیشہ

دو فی صدی۔ پادری۔ ڈاکٹر بحری اور بری فوجی افسر

جین سالوین بیلے[2]۔ سیاس۔ جبرئیل رکیوٹی۔ اور کومٹ ڈی میرآبو[3] کا شمار ایوان کے لیڈروں میں ہوتا تھا دوسری صف کے رہنماؤں میں ماؤنیر۔ ملا۔ اُوٹ۔ اور رابوٹ سینٹ ایٹین قابل ذکر ہیں۔

بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان کھینچا تانی جاری ہی تھی کہ ۴ جون کو لوئی کے سات سالہ شاہزادے کا انتقال ہو گیا۔ اور اس ذاتی صدمے نے بادشاہ کے مزاج کو اور چڑچڑا کر دیا۔ لوئی نے ملکہ میری انطونی کے مشورے سے قومی اسمبلی کے صدر بیلے کے نام حکم بھیجا کہ

پارلیمنٹ کو ملتوی کردو اور شاہی اجلاس[4] کے لئے تیاری کرو۔

اس حکم نامے کے دوسرے روز صبح کو قومی اسمبلی کے نائبین جو شرکت اجلاس کے لئے قصر پارلیمنٹ پہنچے تو انہوں نے ایوان کے دروازوں کو بند اور چاروں طرف پولیس اور فوج کا پہرہ پایا۔ یہ دیکھ کر قومی نائبین کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی۔

اگر اس مجمع کا لیڈر کوئی انتہا پسند انسان ہوتا تو وہیں زدوکوب اور مار پیٹ شروع ہو جاتی۔ لیکن بیلے اور اس کے بردبار ساتھیوں نے لوگوں کو بھڑکنے سے باز رکھا۔ کچھ شور و شغب کے بعد اپنے اعتدال پسند لیڈروں کی رہنمائی میں قومی اسمبلی کے نائبین ایوان پارلیمنٹ سے نکل کر قریب ہی ٹینس کورٹ میں جا کر جمع ہو گئے اور وہاں انہوں نے ایک تاریخی تجویز پاس کی۔ یہ انقلاب فرانس کی پہلی تجویز یا پہلی دستاویز تھی۔

"ہم گاؤ کہ نیشنل اسمبلی، ملک کا نیا دستور بنانے کے لئے طلب کی گئی تھی۔ تاکہ فرانسیسی قوم میں نئی بیداری پیدا ہو۔ شاہی طرز حکومت کے سچے

---

[1] Gerdes Francaises [2] Post Tenebras Lux آرٹ اینڈ لٹریچر میں ڈاکٹر تھا۔ اور ادبی میدان میں

مشہور فرانسیسی طنز نگار والٹیئر VOLTAIRE کا حریف [3] یہ سب کے سب اصلاح پسند تھے۔ لیکن قومی اسمبلی کے حوامی نمائندے، انہیں شاہ پرست جماعت کا رکن تصور کرتے تھے۔ [4] SEANCA ROYALE

ایم۔کے۔ فاطمی

انسانی گوشت

تاریخ کی روشنی میں

دیمک، چیونٹیاں، ٹڈیاں، مکڑیاں، پتنگے، تتلیاں، بھونرے ——
مکھن میں تلی ہوئی۔ دیمک — ایک نہایت لذیذ غذا ہے —— لیکن
کھانے کی ایک اور بھی لذیذ قسم ہے —— اور وہ ہے انسان کا گوشت

آدمی حقیقتاً ایک گوشت خوار جانور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی کھانے کے سلسلے میں صرف ایک مانگ ہے —— گوشت! روئے زمین پر صرف چند ہی قسم کی ایسی جاندار چیزیں ہیں جن کو انسان نے ابھی تک اپنی خوراک نہیں بنایا ہے۔ ورنہ اس نے چھوڑا کچھ بھی نہیں ہے تین ہزار سال پیشتر آشور بنی پال (ASURBANI PAL) بادشاہ نے اپنے شاہی محل نینوا (NINEVEH) میں اپنے مہمانوں کے لئے تیلیوں میں لگی ہوئی ٹڈیاں کھانے کے لئے پیش کی تھیں تاکہ وہ لوگ ان کو اسی طرح مزے سے کھائیں جس طرح آج ہم لوگ اپنی دعوتوں میں بہت سی مزے دار اور چٹپٹی چیزیں کھاتے ہیں۔

جن ملکوں میں ٹڈیاں ہوتی ہیں وہاں کے رہنے والے بہت سے خوش قسمت لوگوں کے لئے یہ کیڑا اب بھی غذا کا ایک جزو اعظم ہے۔ ٹانگانیکا (TANGANYIKA.) میں ٹڈیوں کے پر اور پیروں کو نوچ کر پھینک دیا جاتا ہے اور ان کو مکھن میں تلا جاتا ہے یا ان کے کباب بنائے جاتے ہیں بیلجین کانگو میں تلی ہوئی دیمک ٹوکروں میں بھر کر فروخت کی جاتی ہے۔ ایک ممتاز برطانوی سیاح نے ابھی کچھ ہی عرصہ پیشتر یہ اطلاع دی کہ مکھن میں تلی ہوئی دیمک ایک نہایت ہی لذیذ غذا ہے۔ ایک دوسرے سیاح نے لکھا ہے کہ اس ملک کے رہنے والے دیمک کو لوہے کے برتنوں میں بالکل اسی طرح بھون لیتے ہیں جیسے کافی (COFFEE) بھونی جاتی ہے۔

چیونٹیاں بھی بہت سے ملکوں میں بہت پسند کی جاتی ہیں اور خاص کر وہ چیونٹی جس کو سوگر انٹ (SUGAR ANT) کہتے ہیں اور جو عام طور پر سنٹرل آسٹریلیا میں پائی جاتی ہے، بہت پسند کی جاتی ہے۔ یہ چیونٹیاں کچھ ایسی چیزوں کو زبردستی کھا لیتی ہیں جن سے ان کے پیٹ اس قدر متورم ہو جاتے ہیں کہ ان کا سائز انگور کے برابر ہو جاتا ہے۔ ان چیونٹیوں کے پیٹ میں کچھ خاص قسم کے پودوں کے رس اور کچھ خاص قسم کے کیڑوں کی مٹھاس ہوتی ہے۔ جب یہ چیونٹیاں باہر نکلتی ہیں تو ان کو آسٹریلیا کے لوگ سر کی طرف سے پکڑ لیتے ہیں، ان کے پیٹ کو سامنے کے دانتوں سے دباتے ہیں اور ان کے رس کو نچوڑ لیتے ہیں۔

مکڑی، دیمک، پام وارم اور چیونٹیوں میں مکڑیاں، پتنگوں تتلیوں، بھونروں پروانوں اور ڈریگن فلائیز (DRAGON FLIES)
کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

انسانی گوشت!

لیکن ان تمام کھانوں کی قسموں میں جن کا ذکر کیا گیا ہے ایک اور بھی انوکھی قسم ہے۔ اور وہ ہے
اس بات کے قطعی ثبوت موجود ہیں کہ تاریخ کے زمانے سے بہت پہلے ہی انسان نے خود اپنے ہی ساتھیوں کا گوشت کھایا ہے ——— !
۱۹۲۶ء میں ایک چینی گاؤں 'چاؤ کاؤ تین' میں، جو کہ پیکن سے تقریباً ۳۰ میل جنوب میں واقع ہے، ایک دانت تلاش کیا گیا تھا جس سے مشہور تشریح داں ڈیویڈسن بلیک کو ایک ایسی مخلوق کے پہچاننے میں مدد ملی جو کہ "پتھے کانتھروپس ارکٹس" (PITHE CANTHROPUS ERECTUS) سے بہت مشابہ تھی۔ "جاوان آپے مین" (THE JAWAN-APE MAN) کو اس سے بہت پہلے ایک ڈچ تشریح داں تلاش کر چکا تھا۔
اس کے بعد مزید کھدائیوں میں بلیک کے "پتھے کانتھروپس پے کی نین سس" (PITHE CANTHROPUS PEKINESIS) کے تقریباً ۳۰ ہمعصروں کی ہڈیاں، کھوپڑیاں اور ڈھانچے ملے جن کے ساتھ ان کے بے شمار اوزار اور ہتھیار تھے۔ ان قدیم انسانوں کی جھلسی ہوئی ہڈیاں ان کے چولہوں میں پڑی ہوئی تھیں۔ ان سے اس انسان کی انہیں پکانے کی عادتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ بہت ہی عجیب انداز میں توڑی گئی کھوپڑیوں کو دیکھنے سے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ ان کے بھیجے نکال لئے گئے تھے اور انہیں پکا کر کھایا گیا تھا۔ اس طرح اگر جیسا کہ ان شہادتوں سے پتہ چلتا ہے۔ "پیکن مین" (PEKIN-MAN) ایک انسانی گوشت خور تھا تو وہ کھانے میں بہت "نفاست پسند" اور "عیش پسند" واقع ہوا تھا۔ یہ "پیکن مین" "جاوا آپے مین" کی طرح اب سے تقریباً ۲۵ لاکھ برس قبل رہتا تھا۔
نینڈرتھال مین (NEANDERTHAL MAN) جو کہ وسطی یورپ میں اب سے تقریباً ۲ لاکھ برس پہلے رہتا تھا اس کے لئے یہ بات یقینی ہے کہ وہ ایک آدم خور تھا۔ اس کے بہت سے ثبوت ڈور ڈوگنے (DORDOGNE) اور لی ماؤسٹیر (LE MOUSTIER) کے غاروں میں اور پتھر کی پناہ گاہوں میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان ڈھانچوں سے بھی اس کا سراغ ملتا ہے جو کہ کروٹیا (KROTIA.) کے کریپنا (KRAPINA) کی ایک ماؤسٹیرین بستی میں باقی رہ گئے تھے۔ اسی طرح "کرو میگنن مین" (CRO MAGNON-MAN) بھی جو کہ تقریباً ۵۷ ہزار برس پہلے رہتا تھا اور جس کو سب سے پہلی مرتبہ (HOMO SAPIEN) کہا گیا، اپنے وقت میں اپنے ہم جنسوں کو کھاتا تھا۔ اس کے سینکڑوں ثبوت "طاؤلاؤز" (TOULOUSE) کے قریب "آرگ نیک" (AURIGNAC) کے غاروں میں ملیں گے۔
عہد قبل حجری کا آدمی اور عہد متاخر متاخر حجری کا آدمی (MESOLITHIC AND NEOLITHIC) جو کہ ۱۰ ہزار برس سے لیکر ۲ ہزار برس قبل مسیح تک میں رہتا تھا، اس نے بھی اس معاملے میں اپنے "آدم خور بزرگوں" کی "روایات" کو برقرار رکھا۔ سوئٹزرلینڈ اور بہت سی دوسری جگہوں پر اس کے تاریخی ثبوت مل جائیں گے۔ اس کے بعد آخری کانسے کے زمانے (LATER BRONZ AGE) میں جبکہ انسان نے پہلی دفعہ دھاتوں کا استعمال شروع کیا تو اکثر و بیشتر مواقع پر وہ انسانی گوشت کھاتا تھا۔ یورپ اور دوسرے بہت سے ممالک کے علاوہ آسٹریلیا اس کے واضح ثبوت فراہم کرتا ہے۔
مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے تقریباً ۴۰۰ برس قبل مسیح لکھتے ہوئے یہ انکشاف کیا تھا کہ اسیڈونس (ISSE DONES) اور خانہ بدوش سیتھی قوم (SYTHIAN) میں آدم خورانہ عادات پائی جاتی ہیں۔ وہ لوگ اپنے ہی قبیلے کے بوڑھے لوگوں کو ہمدردانہ قتل کرتے

اور کھا جاتے ہیں۔ اسی مورخ نے سب سے پہلے لکھا ہے کہ یہ لوگ مُردہ آدمیوں کی کھوپڑیوں کو شراب یا پانی پینے کے برتن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ایک دوسرے یونانی مورخ اسٹار بو نے لکھا ہے کہ آئرلینڈ میں انسانی گوشت کا کھانا ایک بالکل عام بات تھی۔ یہ عیسیٰ سے کچھ عرصے پیشتر کی بات ہے۔ اسکے بعد چوتھی صدی عیسوی میں سینٹ جیروم (ST. JEROME) نے بھی اسکاٹ لینڈ میں اس رواج کی موجودگی کی رپورٹ دی ہے۔ ان جنگلیوں پر سرحدی قزاقی سرحدوں پر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑا کرتے تھے اور ان پر یہ الزام ہے (جو یقیناً بالکل صحیح ہے) کہ وہ اپنے مارے ہوئے دشمن کے خون کو پی لیتے تھے

یہ ایک مشہور حقیقت ہے کہ نویں صدی عیسوی میں عربوں اور ہسپانیوں کی جنگ کے دوران الویرا (ELVIRA) کی عورت نے سوار (SAWAR) کا، جو کہ عربوں کا ایک بڑا سردار اور ان ہسپانیوں کے قبیلے والوں کی غارت گری اور قتل عام کا ذمہ دار تھا، سینہ چاک کیا اور اس کے بعد اس کو کھا لیا۔ تیرھویں صدی میں مارکو پولو (MARCO-POLO) جو کہ اس وقت صرف ۱۷ سال کا ایک لڑکا تھا سفر پر روانہ ہوا۔ وہ وینس (VENICE) سے تقریباً ۲۴ سال باہر رہا اور اس نے اس وقفے میں مشرق بعید اور خاص کر چین اور تاتار کا دورہ کیا۔ اس نے اور اس کے بہت سے ساتھی ملاحوں نے یہ بتلایا کہ چینی اور تبتی قبیلے کے بہت سے لوگ انسانوں کا گوشت کھاتے ہیں۔ اس بات کو اس سے اور تقویت ملتی ہے۔ سولھویں صدی میں یورپ کے بہت سے ممالک کے جلّادوں کو یہ شاہی اختیار تھا کہ وہ ایسے لوگوں کے خون اور جسم کے کچھ مخصوص حصوں کو جن کو وہ قتل کریں یا پھانسی دیں، اپنے قبضے میں کر سکتے ہیں اور جس طرح چاہیں اُسے کام میں لائیں۔

اٹھارھویں صدی میں بوہیمیا کے زنگاریس (ZINGARIS OF BOHEMIA.) قبیلے کے لوگ بھی اپنے راجہ کی طرح انسانی گوشت کھاتے تھے۔ وہ لوگ انسانی گوشت کے بہت ہی لذیذ ٹکڑے بھون کر یا کچے ہی، کان، ہاتھوں کی ہتھیلیاں، پاؤں کے تلوے پنڈلیاں اور گال اور گال وغیرہ بہت کھاتے تھے۔ راجہ کو یہ پورا اختیار تھا کہ وہ اپنے قیدیوں کے سروں کو کاٹ لے اور ان کی شریانوں اور نسوں سے نکلا گیا گرم گرم خون پی لے۔ انیسویں صدی میں ایک چینی جلاد کے لئے یہ کوئی خاص بات نہ تھی کہ وہ اپنے شکاروں کے کلیجے اور دل نکال کر کھا جائے

ان مثالوں کا زیادہ تر حصہ قدیم مورخوں، سیاحوں اور سپاہیوں سے ماخوذ ہے جنہوں نے دور دور ممالک میں سیاحت کی اور کہانیاں اپنے ساتھ لائے۔ ان میں ایسے انسانی گوشت کھانے کے واقعات کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جو کہ سخت قحط، جہازوں کی تباہی اور قلعوں کے محاصروں کے وقت سخت بھوک کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ اس قسم کے واقعات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور ان میں اکثر کی صحت کو شہادت کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے لیکن اس زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا جیسا کہ بعد میں ماہرین انسانیات نے کیا۔ انہوں نے اس موضوع پر اپنا مطالعہ جاری رکھا اور ان شہادتوں کی تشریح کی اور ان کا باہمی ربط تلاش کرنے کی کوشش کی، ساتھ ہی ساتھ اس سلسلے میں بہت سے نظریات کو جمع کر لیا۔

اکثر ایسا بھی ہوا کہ ماہر انسانیات خود ہی ایک سیاح بھی تھا لیکن پھر بھی اس نے ایسے سیاحوں کی معلومات و اطلاعات پر بھی بھروسہ کیا جو دنیا بھر کی سیاحت کر چکے ہیں۔ ایسی تبلیغی تنظیموں سے بھی بہت سی باتیں معلوم ہوتیں جو بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ افریقہ کے تاریک جنگلوں، جنوبی امریکہ کے جنگلوں، پولی نیشیا اور ملانیشیا کے غیر متمدن جزیروں کی تلاش کرنے والے لوگوں سے بھی بہت مدد ملی۔ ایسے طلبا بھی تھے جنہوں نے عام لوگوں میں راسخ متداول روایات و عقائد کے مطالعہ کے لئے ان لوگوں کی زبان سیکھنے کی زحمت برداشت کی اور اس طرح ان وحشی اور غیر متمدن لوگوں مثلاً شمالی بحرالکاہل کے ساحل پر بسنے والے "کواکیوٹل انڈینز" (KWAKIUTL INDIANS) کی کہانیوں اور حکایات و روایات کو جمع کر لیا۔ اس طرح ماہرین انسانیات کے لئے بہت سا مواد جمع ہو گیا۔

انیسویں اور بیسویں صدی کی ابتدا میں اس طرح سے جمع کی گئی معلومات کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ اا

تفصیلات کی گوناگونی اور اختلاف تھا۔ بہرحال دنیا کے ہر حصے میں انسانی گوشت کھانے کی عادت کا پتہ لگتا ہے اور اس میں کسی شک کو دخل نہیں ہے۔

کانگو میں غلاموں کو غذا کے طور پر بیچنے کے لئے موٹا تازہ کیا جاتا تھا تاکہ بازار میں اچھے دام لگ سکیں۔ نائیجیریا میں شکاروں کے جسموں کو مذہبی رسم کی ادائیگی کے طور پر کاٹا جاتا تھا اور قربان گاہوں میں ملکر کھایا جاتا تھا۔ فجی قوم کے سردار جب اپنے بال کٹواتے تھے تو انسانی گوشت کی ایک دعوت کھاتے تھے۔ اسی طرح جیونٹس قبیلے کی مائیں اپنے کچھ بچوں کو کم سنی میں ہی کھا لیا کرتی تھیں۔ وارد ستان کے قبیلے والے انسان کا دل کھاتے اور خون پیتے تھے۔ مغربی افریقہ میں چیتے کی کھال پہننے والے لوگوں کا جن کو لیوپارڈ سوسائٹی (LEOPARD SOCIETY) کہا جاتا ہے، ایک ایسا مذہبی فرقہ ہے جو جنگلوں میں انسانوں کا شکار کرتا ہے۔ انسانوں کو مار ڈالنے کے بعد یہ لوگ اس کا گلا پھاڑ ڈالتے ہیں اور بعد میں ان کو مذہبی اجتماع کرکے کھاتے ہیں۔

آسٹریلیا کے کچھ علاقوں میں انسانی شکاروں کے جسموں کو دھوئیں میں سکھایا جاتا تھا اور اس کے بعد وہ حصے جو گرمی کی وجہ سے سیال یا چربی کی شکل میں تبدیل ہو جاتے تھے ان کو کھایا جاتا تھا۔ کہیں کہیں ان لاشوں کو سڑنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا اور اس سڑانے کے عمل کے بعد جو چیزیں پیدا ہوتی تھیں ان کو بچا کر رکھ لیتے اور ان کو کھاتے تھے۔ کچھ خاص جنوبی امریکی قبیلے والے لاشوں کو راکھ کی شکل میں بدل دیتے، اس کو کسی عرق یا سیال میں ملاتے اور پھر اس محلول (MIXTURE) کو پی جاتے۔ کچھ افریقی قبیلے مُردوں کی لاشوں کو غذا کے لئے ایسے قبیلوں میں فروخت کر دیتے جہاں خوراک کی حد سے زیادہ قلت ہوتی تھی۔ جنوبی امریکہ کا ایک قبیلہ اپنی قیدی عورتوں سے اس لئے بچے پیدا کرتا تاکہ ان کو جب بھی انسانی گوشت کھانے کی ضرورت محسوس ہو تو اس طرح سے ایک مستقل سپلائی کا انتظام رہے۔ اس طرح کی بے شمار باتیں ہیں جن سے صفحات کے صفحات رنگے پڑے ہیں۔

حقیقتاً انسانی گوشت کھانے کی عادت کم یا زیادہ مقدار میں تقریباً ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے بحرالکاہل سے لیکر وینکا ؤور (VANCOOVER) تک، ویسٹ انڈیز سے لیکر ایسٹ انڈیز تک، پولی نیشیا، ملانیشیا، سے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ تک، شمالی، مغربی، مشرقی اور وسط افریقہ میں، جنوبی اور شمالی امریکہ میں، اس قسم کی سینکڑوں بلکہ ہزاروں شہادتیں ملی ہیں جن سے یہ پتہ چلا کہ وہاں کے لوگ اس عادت کے کس بری طرح شکار تھے۔

قدیم ماہرین انسانیات اسی عادت کو ظاہر کرنے کے لئے سب سے پہلے انتھروپوفیگی (ANTHROPOPHAGY) کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ یہ لفظ یونانی زبان کے دو الفاظ "انتھروپس" (ANTHROPES) یعنی آدمی، اور فیگن یعنی (PHAGIEN) کھانا سے بنا ہے لیکن اس کے لئے سب سے زیادہ مشہور و معروف لفظ کینی بالزم (CANNIBALISM) ہے جو دراصل گیرب (GARIB) کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ گیرب ایک ویسٹ انڈین قبیلے کا نام تھا جس کے درمیان اس عادت کا سب سے پہلے پتہ ایک اسپینی نے لگایا۔ اس موضوع پر گزشتہ ڈیڑھ دو صدیوں میں ماہرین انسانیات اور خاص کر امریکیوں نے بہت لکھا ہے لیکن اس سلسلے میں اختلافی مواد کی اس قدر کثرت ہے کہ ان لوگوں کو اکثر جگہوں پر محض قیاس سے کام لینا پڑا ہے اور اسی وجہ سے اکثر ان کے نظریات میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان کے نظریات کبھی کبھی بہت ہی جامع اور مکمل ہوتے ہیں اور کبھی کبھی حد سے زیادہ متضاد اور الجھے ہوئے لیکن پھر بھی ان میں دلچسپی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ مثلاً مشہور ماہر انسانیات ڈاکٹر اسپیر (D. SPIER) لکھتے ہیں۔

"غیر متمدن لوگ انسانوں اور جانوروں کو اپنے خیال میں اس قدر بالکل ایک سا سمجھتے تھے کہ یہ ممکن ہے کہ وہ انسانی گوشت کو دوسری

اشیائے خوردنی سے بہت زیادہ یا بالکل مختلف نہ سمجھتے ہوں۔ دراصل ویسے تو انسانی گوشت کے کھانے میں کوئی جبلی کراہت نہیں ہے۔ مہذب قوموں اور بہت سی وحشی قوموں نے بھی، اس سے جو اپنی نفرت ظاہر کی ہے وہ رواج اور تقلید کی پیدا کردہ ہے۔ اور ان ناپاک، گندی اور حرام اور انسان کے لئے ناقابلِ تصرف چیزوں کے کھانے کی طرف سے جو نفرت پائی جاتی ہے وہ بالکل اسی طرح کی ہے جیسے سُور اور کتے تمام سامی (SEMITIC) لوگوں کے لئے ناپاک اور حرام ہیں۔ ایسی چیزوں کے کھانے سے نفرت طبیعی ضروریات کے سبب نہیں ہے بلکہ یہ انسان کا ایک غیر معمولی جذبہ ہے جو اس کو ایسی چیزوں سے نفرت کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔"

لیکن دوسری طرف ڈاکٹر اریک ملر اس سے قطعی مختلف نظریئے کے حامی ہیں اور ان کا دعویٰ بھی کسی طرح اس سے کم نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

" یا تو یہ رواج کسی خاص علاقے میں قحط کے وقت میں پیدا ہوا، یا کسی خاص وقتی غذائی ضرورت کے سبب۔ اس کے علاوہ کچھ حد سے زیادہ بڑھے ہوئے نظریاتی، جذباتی اور مذہبی ہیجان نے بھی آدم خوری کی طرف سے فطری نفرت پر قابو پالیا۔ پھر یہ ایک مسلسل عادت ہوگئی۔"

لیکن ڈاکٹر ملر نے یہ نکتہ خود ہی پہلے ہی بیان کردیا ہے کہ قحط کے واقعات کے علاوہ بھی، جب کہ آدم خوری کو صرف ایک مقصد کے پورا کرنے کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے، اس عادت کے رواج پانے کے ہمیشہ ۲ یا ۳ محرکات ہوا کرتے ہیں یعنی غذائی، ساحرانہ اور مذہبی۔ اور ان کی وجہ سے بھی بعد میں یہ عادت عام لوگوں میں پڑجاتی ہے۔

بہرحال یہ بات واضح ہے اور ماہرین انسانیات اس پر قطعی متفق ہیں کہ آدم خوری کا رواج چاہے دنیا کے کسی بھی حصے یا کسی بھی قبیلے میں ہو لیکن جہاں بھی یہ کسی قبیلے میں ان کی سماجی زندگی کے ایک بہت قدیم اور مضبوط جزو کی حیثیت رکھتا ہے اس کی ابتدا مختلف شکلوں میں اور مختلف وجہوں سے ہوئی ہے۔ اس کا تعلق مذہبی تقریبات سے جوڑا جاسکتا ہے، اس کی کوئی ساحرانہ اہمیت ہوسکتی ہے۔ یا پھر اس کو کسی ایک وقتی اور ناخوش گوار بھوک کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے جس کی وجہ سے انسانی گوشت کو غذا کے طور پر استعمال کرنے کے لئے تجربہ کیا گیا۔ لیکن یہ آخری بات ایک سخت پُرآشوب تجربے کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اکثر و بیشتر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب انسانی گوشت کے کھانے اور اس کے مزہ چکھنے کا ایک مرتبہ شوق پیدا ہوجاتا ہے تو پھر یہ مزہ بہت تیزی کے ساتھ ایک بہت ہی بھیانک اور گوشت کھانے کی ایک ناقابلِ تشفی ہوس کی شکل اختیار کرلیتا ہے جس کو کبھی بھی کسی بھی جانور کا گوشت ٹھنڈا نہیں کرسکتا ہے۔ اور اس طرح مُردخوری کے سلسلے میں بہت سی ذلیل قسم کی باتیں پیدا ہوجاتی ہیں اور اس ذلالت اور تنزل کا سلسلہ بڑے ہی بے رحمانہ طور پر آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔

ان محرکات میں سے پہلے دو ایک دوسرے سے متعلق ہیں کیونکہ مذہب، جادو اور وہم اپنی خصوصیات کے سبب وحشی قوموں میں ایک دوسرے میں تبدیل ہونے والے سمجھے جاتے رہے ہیں۔ یہ سب چیزیں ایک ہی معلوم ہوتی ہیں لیکن ان محرکات اور اس بھدے اور ذلیل مقصد یعنی صرف انسانی گوشت کھانے کی ہوس کے درمیان بہت گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ اگر ایک مرتبہ اپنے ہی ساتھیوں کا گوشت کھانے پر مذہبی اور ساحرانہ طور پر معافی دے دی گئی تو پھر اس انسانی گوشت کی مانگ برابر بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور پھر مانگ کے لئے سپلائی کا ہونا ضروری ہے۔

(باقی آئندہ)

شیر افضل جعفری

غزل

لہک لہک کے سرِ دار بھیم گانے کی
دُھنوں پہ مست ہوئیں گردشیں زمانے کی

قفس کی تیلیوں سے کونپلیں نکل آئیں
اسیر کو جو اجازت ہو چہچہانے کی

اندھیری رات ہے، بادل ہے، اور تند بھنور
تو پھر بھی ٹھان لے کچے گھڑے پہ جانے کی

چنارِ آہ سے توفیق لی ہے آدم نے
شبِ نصیب کو تاروں سے جگمگانے کی

کچھ ایسا جھوم کے روٹھا ہوں میں دُعاؤں سے
کہ خود کریم کو ہے آرزو منانے کی

اُگی ہیں سُولیاں باغِ حیات میں افضل
یہی تو رت ہے انا پر بہار آنے کی

نازش حیدری

سراسر اُن کو گلستانِ آرزو کہیئے
رُکیں تو رنگ سمجھئے چلیں تو بُو کہیئے

وہ اک تعلقِ پنہاں کہ آرزو کہیئے
جو فاش ہو تو مژہ پر اُسے لہُو کہیئے

جمال وہ کہ جسے صُبحِ مشکبو کہیئے
کھُلے جو زلف تو پھر شام آرزُو کہیئے

اُٹھا کے صحنِ چمن میں نگاہِ چہرہ شناس
کسی کو پھُول کسی کو شگفتہ رُو کہیئے

سوالِ شوق کا اکثر جواب بنتی ہے
تری نظر کی خموشی کہ گفتگُو کہیئے

مجھے شکست کا الزام بھی قبُول مگر
مقابل آیئے بربادِ جستجُو کہیئے

نگاہِ چمن کے جو نکلے کسی کی پلکوں سے
حدیثِ بادہ و افسانۂ سُبُو کہیئے

ہمارے پاؤں سے منزل کو تاج ملتا ہے
سفر کی گرد کو اب رنگِ آبرُو کہیئے

ہماری تشنگیٔ شوق کی ہے بات کچھ اور
یہ وہ نہیں جسے دورانِ گفتگُو کہیئے

ہماری تشنہ لبی کو نہ کر سکی سیراب
وہ گفتگو کی روانی کہ آب جُو کہیئے

دلیل ہوش کے آثار بھی نہ رہ جائیں
میں پُوچھوں کون ہے دیوانہ آپ تُو کہیئے

ہر انقلاب کی لہر اپنے میکدے میں ہے
کسے شراب سمجھئے کسے لہُو کہیئے

چمن بدوش ہے ہر وادیٔ نظر نازش
مری حیات کو کشمیر آرزو کہیئے

مختار علی خاں

میں نے کہا" میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے خوفزدہ کرنے کے لئے ایسے بھوت کی ضرورت ہوگی جو آنکھوں سے نظر آسکے" اور اپنا گلاس ہاتھ میں لیکر آگ کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

سوکھے ہوئے بازو والے شخص نے مجھے ترچھی نگاہوں سے دیکھا اور بولا" یہ تمہاری اپنی پسند ہے۔

میں نے کہا" میں اٹھائیس سال دنیا میں رہ چکا ہوں لیکن میں نے اب تک کوئی آسیب نہیں دیکھا۔

عمر رسیدہ عورت آگ پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اس کی پژمردہ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ ہماری گفتگو میں دخل انداز ہوتے ہوئے بولی میرے خیال میں تم نے اپنی عمر کے اٹھائیس برسوں میں اس مکان کی طرح مکانات نہ دیکھے ہوں گے۔ ایسے شخص کے لئے ابھی بہت سی چیزیں دیکھنا ہیں جس کی عمر صرف اٹھائیس سال ہو" اس نے اپنا سر ادھر ادھر گھماتے ہوئے کہا" بہت سی چیزیں دیکھنا اور ان پر افسوس کرنا ہے"

مجھے کچھ شبہ تھا کہ یہ عمر رسیدہ لوگ مدھم آواز میں بول کر زبردستی اس مکان کی روحانی خوفناکیوں میں اضافہ کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے اپنا خالی گلاس میز پر رکھ دیا اور کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ مجھے کمرے کے گوشہ کے پرانے اور عجیب آئینہ میں اپنی ایک جھلک نظر آئی ـــــ میں چھوٹا اور چوڑا نظر آرہا تھا۔

میں نے کہا" اچھا تو اگر آج رات مجھے کوئی چیز نظر آئی تو اس سے میری عقل وفہم میں اضافہ ہوگا کیونکہ میں اس کام کے لئے ہر خیال سے آزاد ذہن لے کر آیا ہوں"

سوکھے ہوئے بازو والے شخص نے مکرر کہا" ہاں یہ تمہاری اپنی پسند ہے"

باہر کے راستے کے پتھروں پر ایک لکڑی اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کے قلابوں میں آواز پیدا ہوئی۔ اور ایک بہت زیادہ عمر رسیدہ شخص کمرے میں داخل ہوا۔ وہ زیادہ خمیدہ تھا اور اس کے چہرے پر زیادہ جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ لکڑی سے اپنے آپ کو سہارا دیے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ٹوپی کے چھجے (شیڈ) سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ نیچے کا نیم خمیدہ ہونٹ اس کے گرتے ہوئے زرد دانتوں سے لٹکا ہوا تھا۔ وہ سیدھا میز کے سامنے رکھی ہوئی آرام کرسی کی طرف گیا اور ناشائستگی سے بیٹھ کر کھانسنے لگا سوکھے ہوئے بازو والے شخص نے نووارد کو تھوڑی دیر کے لئے نفرت سے دیکھا۔ بوڑھی عورت نے اس کی آمد کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس کی نگاہیں مستقل طور سے آگ پر جمی ہوئی تھیں۔

جب نووارد کی کھانسی تھوڑی دیر کے لئے رک گئی تو سوکھے ہوئے بازو والا شخص بولا" میں نے کہا کہ یہ تمہاری اپنی ہی پسند ہے"

ہاں یہ میری اپنی ہی پسند ہے، میں نے جواب دیا۔

چھجے دار ٹوپی والا پہلی بار میری موجودگی سے باخبر ہوا۔ اس نے مجھے دیکھنے کے لئے اپنے سر کو دائیں بائیں اور پیچھے کی جانب حرکت دی۔ مجھے تھوڑی دیر کے لئے اس کی آنکھوں کی ایک جھلک نظر آئی۔ یہ آنکھیں چھوٹی چمکیلی اور سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد اس نے پھر کھانسنا اور تھوکنا شروع کر دیا۔

سوکھے ہوئے بازو والے شخص نے بیئر کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "تم اسے پیتے کیوں نہیں؟

چھجے دار ٹوپی والے شخص نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ سے ایک گلاس برانڈی نکالی جس میں سے نصف میز پر گر گئی۔ اس کا ایک بڑا سا سایہ دیوار پر جھکا ہوا بیٹھا تھا اور اس کے شراب نکالتے اور پیتے ہوئے اس کی حرکات کی نقل کر رہا تھا۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ مجھے اس بات کی توقع نہ تھی کہ اس مکان کے ایسے لوگ محافظ ہوں گے۔ میرے خیال میں بڑھاپے میں کچھ غیر انسانی عنصر شامل ہے ــــ کوئی جانوروں سے مشابہ شے۔ بوڑھے لوگ روز بروز انسانی خصوصیات سے محروم ہوتے رہتے ہیں۔ ان تینوں افراد نے اپنے سکوت خمیدہ جسم اور سرد مہری سے مجھے آزردہ کر دیا تھا۔

میں نے کہا " اگر آپ لوگ مجھے وہ آسیب زدہ کمرہ دکھا دیں تو میں وہاں آرام کر لوں، کھانسنے والے شخص نے اپنے سر کو پیچھے کی طرف فوری طور سے اس طرح جنبش دی کہ میں چونک پڑا۔ اس نے دوبارہ شیڈ کے نیچے سے اپنی لال آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ لیکن میری بات کا کسی نے جواب نہ دیا۔ میں نے انہیں یکے بعد دیگرے دیکھتے ہوئے ایک دو لمحہ انتظار کیا اور بلند آواز میں کہا " اگر آپ مجھے اپنا آسیب زدہ کمرہ دکھا دیں تو آپ میری میزبانی کے بارے سبک دوش ہو جائیں گے۔

سوکھے ہوئے بازو والے شخص نے میرے پیروں کو دیکھتے ہوئے کہا " باہر پتھر پر ایک شمع جل رہی ہے . . . . لیکن اگر تم آج رات لال کمرے میں جاتے ہو تو ــ"

(آج کی سی خوفناک رات . . . . بوڑھی عورت بول اٹھی) ...

ـــــ تمہیں تنہا ہی جانا ہوگا:

" بہت اچھا" میں نے جواب دیا۔ مجھے کس راستے سے وہاں جانا چاہئیے۔"

" تم راستے میں سیدھے تھوڑی دور چلے جاؤ یہاں تک کہ تم ایک دروازہ تک پہنچ جاؤ۔ اس دروازے سے ایک پیچ دار زینہ اوپر کی طرف جاتا ہے۔ آدھا زینہ ختم ہونے کے بعد ایک چبوترہ ہے۔ چبوترے پر ایک دروازہ ہے جس پر ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس میں داخل ہو جاؤ اور پھر لمبے برآمدے تک پہنچ جاؤ۔ وہ کمرہ اس برآمدے کے اختتام پر بائیں طرف واقع ہے۔'

میں نے اس کی ہدایات دہراتے ہوئے کہا 'میں اس طرح صحیح جگہ پہنچ جاؤں گا؟

بوڑھے شخص نے ایک بار میری اصلاح کی۔

شیڈ والے شخص نے تیسری بار عجیب غیر فطری انداز میں اپنے چہرے کو خمیدہ کرتے ہوئے مجھے دیکھا اور بولا، کیا تم واقعی جا رہے ہو؟

بوڑھی عورت نے کہا 'یہ کیسی خوفناک رات ہے!

میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا 'میں اسی مقصد سے یہاں آیا ہوں'

جیسے ہی میں دروازے کی جانب بڑھا بوڑھے شخص نے اٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے میز کی طرف پیش قدمی کی تاکہ دوسرے افراد اور آتشدان سے

نزدیک تر ہو جائے"۔

میں نے دروازہ پر پہنچ کر انہیں مڑ کر دیکھا وہ مجھے ایک دوسرے کے نزدیک نظر آئے۔ ان کے چہرے آگ کی روشنی میں کالے معلوم ہو رہے تھے وہ مڑ مڑ کر پیچھے سے مجھے گھور کر دیکھ رہے تھے۔ ان کے بوڑھے چہروں سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔

"شب بخیر" میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

سوکھے ہوئے بازو والے شخص نے کہا "یہ تمہاری اپنی ہی پسند ہے"۔

میں نے شمع کے پوری طرح روشن ہو جانے تک دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ اور پھر اسے بند کر دیا۔ اور سرد راستے پر چلنے لگا جس میں میرے قدموں کی آواز گونج رہی تھی۔

مجھے اعتراف ہے کہ ان تین عمر رسیدہ اشخاص کی عجیب ہیئت سے جن کی نگرانی میں ڈیوک کی بیوی نے یہ قلعہ چھوڑ رکھا تھا میں بہت متاثر تھا۔ میں اس پرانی وضع کے ساز و سامان سے بھی اثر پذیر ہوا تھا جو مالک کے اس کمرے میں رکھا تھا جس میں یہ لوگ جمع تھے اگرچہ میں حقیقت پسندانہ رجحان برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ لوگ اور یہ اشیاء مجھے کسی دوسرے عہد سے متعلق معلوم ہوتے تھے۔ ایک ایسا عہد جو اپنے روحانی ماحول کے ساتھ ہمارے اس عہد سے بالکل مختلف تھا ہمارا عہد جس میں روحانی واقعات بڑی حد تک ناقابل یقین ہیں۔ یہ لوگ عہد گزشتہ سے وابستہ معلوم ہوتے تھے جبکہ چڑیلوں کا وجود قابل اعتبار اور خبیث روحوں کا وجود یقینی تھا۔ ان لوگوں کا وجود ہی جانکاہ تھا جن ہاتھوں نے ان کے کپڑوں کو تراشا تھا وہ مردہ ہو چکے تھے۔ کمرے کا آرائشی سامان ایک روحانی شان لئے ہوئے تھے۔ اور اسے دیکھ کر خود بخود قلب میں ایک خوف کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی لیکن میں نے ان خیالات کو اپنے دل سے نکال دیا۔ یہ راستہ انتہائی سرد اور غبار آلود تھا۔ میرے ہاتھ میں موم بتی لرز رہی تھی اس کے باعث سائے حرکت کر رہے تھے۔ آواز کی گونج کبھی پیچ دار زینے کے اوپر محسوس ہوتی تھی اور کبھی نیچے ایک سایہ میرے پیچھے چل رہا تھا اور دوسرا میرے سر کے اوپر چھت پر۔ میں چبوترے پر پہنچا اور وہاں ایک لمحے کے لئے رک گیا۔ میں نے کھڑے ہو کر کھڑکھڑاہٹ کی ایک آواز سنی جو میرے کان میں ابھی آئی تھی جب میں وہاں مکمل خاموشی سے مطمئن ہو گیا تو میں نے دروازے کا پردہ اٹھایا اور برآمدے میں داخل ہو گیا۔ اس برآمدے میں ایک بڑی کھڑکی تھی اور اس سے گزر کر چاندنی آ رہی تھی۔ چاند کی اس روشنی میں دالان میں رکھی ہوئی ہر چیز مجھے بخوبی نظر آ رہی تھی۔ ہر شے اپنے مقام پر رکھی ہوئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس مکان کو ڈیڑھ سال قبل نہیں بلکہ کل ہی چھوڑا گیا ہے۔ شمعدانوں میں شمعیں لگی ہوئی تھیں اور قالینوں پر جو غبار جم گیا تھا وہ اتنے یکساں طور سے پھیلا ہوا تھا کہ چاند کی روشنی میں وہ نظر نہ آتا تھا۔ میں اپنا قدم آگے بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ فی الفور رک گیا مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی وحشت ناک شخص جھکا ہوا بیٹھا ہے اور میرے اوپر ابھی حملہ کرنے والا ہے۔ میں اسے دیکھ کر شاید نصف منٹ تک ساکت و صامت کھڑا رہا۔ پھر میں نے اپنا ہاتھ اس جیب میں ڈالا جس میں میرا ریوالور رکھا تھا۔ اس کے بعد میں آگے بڑھا۔ قریب پہنچنے پر مجھے معلوم ہوا کہ کسی مجسمے کا سایہ ہے جو چاند کی روشنی میں کوئی خوفناک چیز نظر آ رہا تھا۔ اس انکشاف سے میرے گم شدہ حواس واپس آ گئے۔ چنانچہ جب مجھے ایسی ہی شے نظر آئی تو میرے دل پر اس کی موجودگی کوئی غلط اثر نہ ہوا۔

اب میں آسیب زدہ کمرے تک پہنچ چکا تھا۔ اس کمرے کے دروازے کے قریب کا گوشہ تاریک تھا۔ میں نے اس گوشے کا جائزہ لینے کے لئے اپنی موم بتی کو ادھر ادھر جنبش دی۔ مجھے خیال آیا کہ اس مقام پر وہ نوجوان مردہ پایا گیا تھا۔ اس واقعے کی یاد نے میرے اندر دہشت کی ایک لہر دوڑا دی۔ لہٰذا میں نے آگے بڑھ کر تیزی کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

کمرے میں داخل ہو کر میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اور پھر اس میں قفل لگا دیا۔ اب میں کھڑا ہوا اس کمرے کا جائزہ لے رہا تھا جہاں دو نوجوان موت کا شکار ہو گیا تھا لیکن در اصل یہاں اس کی موت کا عمل شروع ہوا تھا کیونکہ وہ دروازہ کھول کر اس زینے پر سر کے بل گر گیا تھا جہاں میں ابھی چڑھ چکا تھا۔ اس واقعے کے علاوہ بھی روحوں سے متعلق دوسرے واقعات اس کمرے سے منسوب کئے جاتے تھے۔ ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا تھا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو ان ہی بھوتوں کے واقعات سے ڈرا رہا تھا کہ وہ انہیں سنتے ہوئے مر گئی۔ اس تاریک کمرے کو دیکھ کر ایک توہمات سے پاک شخص اچھی طرح اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ واقعات اسی تاریکی سے ابھرے ہیں۔ میری موم بتی کی لو کی روشنی بمشکل تھوڑی دور جا سکتی تھی اور روشنی کے اس مختصر سے جزیرے کے آگے رازوں کا ایک سمندر موجود تھا۔

مجھے خوف تھا کہ کمرے کا یہ اندھیرا عجیب عجیب خیالات کی تخلیق کا باعث ہو گا چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اولاً اس کمرے کی تمام اشیاء کا تجزیاتی جائزہ لونگا۔ اسی فیصلے کے مطابق میں نے اس کے ساز و سامان کو اچھی طرح دیکھا اور اس کے گوشوں کو دیکھ کر پوری طرح مطمئن ہو گیا کہ یہاں میرے علاوہ کوئی جاندار موجود نہیں ہے۔ کھڑکیوں پر پردے لٹک رہے تھے۔ میں نے وہ پردے ہٹا دئے اور کھڑکیوں کو بند کر دیا تاکہ کسی چیز کے باہر سے داخل ہونے کا امکان باقی نہ رہے۔ کمرے میں دو پرانے آئینے تھے اور ان میں دو شمعدان لگے ہوئے تھے۔ ایک آتش دان وہاں موجود تھا۔ اس کے علاوہ ایک الماری میں دو شمع دان لگے تھے اور قریب ہی چینی کے دو شمعدان رکھے تھے۔ میں نے آتش دان میں آگ روشن کر دی۔ اور آتشدان کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ ایک آرام کرسی میں نے اپنے سامنے رکھ لی اور اس پر اپنا ریوالور رکھ دیا۔ تاکہ ضرورت پڑتے ہی اسے فوراً اٹھا سکوں۔ کمرے کے اس جائزے نے میرے لئے اچھا کام کیا۔ لیکن دور گوشے کی تاریکی اور خاموشی خطرہ تھا کہ میرے تخیل کے لئے ایک تازیانے کا کام دے گی۔ پیچھے سنگھار میز کا سایہ ایسا خیال دل میں پیدا کرتا تھا کہ گویا کوئی جاندار شے یہاں موجود ہے۔ ایسے خیالات خاموشی اور تنہائی میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے موم بتی لے کر اس سائے کی طرف گیا اور میں نے اس طرح اس سائے کے متعلق اپنے شک کو مٹا دیا۔ میں نے سنگھار میز پر وہ موم بتی کھڑی کر دی اور وہاں سے ہٹ گیا۔

اس وقت تک میں کافی اعصابی کشیدگی میں مبتلا ہو چکا تھا حالانکہ اس کی کوئی وجہ نہ تھی۔ لیکن میرا ذہن اس وقت تک غلط قسم کے خیالات سے بالکل پاک تھا۔ دماغ کو ان خیالات سے آزاد رکھنے کے لئے میں نے کچھ شعر گنگنانے شروع کر دیئے — میں نے کچھ ہی اشعار پڑھے ہونگے کہ مجھے اس کی گونج ناخوشگوار معلوم ہوئی چنانچہ میں نے یہ مشغلہ ترک کر دیا۔ تھوڑی دیر میں اپنے آپ ہی سے روحوں کے عدم وجود کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ لیکن یہ بات بھی مجھے خوشگوار نہ معلوم ہوئی۔ میرا ذہن پھر ان تین ضعیف لوگوں کی طرف منتقل ہو گیا اور میں نے اسی موضوع پر اپنے خیالات مرکوز رکھنے کی کوشش کی۔ کمرے میں گو سات موم بتیاں روشن تھیں لیکن اس کے باوجود یہ اچھی طرح روشن نہ تھا۔ مختلف لوگوں کی پرچھائیاں میرے لئے باعث تکلیف تھیں۔ کچھ موم بتیاں لرز رہی تھیں جس کے باعث پرچھائیوں میں بھی حرکت پیدا ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی صورت سے یہاں زیادہ روشنی کی جائے کہ مجھے خیال آیا کہ دالان میں رکھی ہوئی کچھ موم بتیاں نظر آئی تھیں۔ چنانچہ میں فوراً کمرے سے باہر گیا اور وہ موم بتیاں اٹھا لایا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے دروازہ کھلا ہوا چھوڑ دیا۔ ان موم بتیوں کی تعداد کوئی دس ہوگی۔ انہیں میں نے جلا کر مختلف جگہوں پر لگا دیا۔ اب کمرے میں بہت کافی روشنی ہو گئی تھی۔ اور اس روشنی کو دیکھ کر میرے دل میں بہت اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔

لیکن اس اعتماد کے باوجود تحقیق کے ارادے سے اس کمرے میں آنے کے نفسیاتی اثرات اچھے نہ تھے۔ میں مختلف موضوعات پر تھوڑی دیر کے لئے سوچتا تھا۔ اب رات کا نصف حصہ گزر چکا تھا۔ یکایک سنگھار میز کی موم بتی بجھ گئی۔ اور وہ سایہ جو میرے خوف کا باعث تھا فوراً اپنی جگہ پر دوبارہ آ گیا۔ میں نے در اصل موم بتی کو گل ہوتے نہیں دیکھا۔ مجھے تو بس وہی سایہ نظر آیا۔ جب میں نے نظر ہٹائی تو معلوم ہوا کہ اس جلنے کی موجودگی کا سبب

موم بتی کا گل ہونا ہے۔ میں نے جلدی سے دیا سلائی اٹھائی اور اس گوشے کو دوبارہ روشن کر دیا۔ موم بتی جلانے کے لئے میں نے جب دیا سلائی جلائی تو پہلی بار ناکام رہا۔ دوسری بار میں نے دیا سلائی جلا کر اسے روشن کیا۔ اس دوران میں مجھے دیوار پر کوئی چیز آتی ہوئی نظر آئی میں نے گھبرا کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ معلوم ہوا کہ آتشدان کے پاس میز پر رکھی ہوئی موم بتیاں گل ہو گئی ہیں۔ میں فوراً کھڑا ہو گیا۔ اور موم بتیاں جلانے کے لئے میز کے قریب پہنچا لیکن میں نے ابھی ایک ہی موم بتی جلائی تھی کہ آئینے والی ایک موم بتی گل ہو گئی اور اس کے فوراً بعد دوسری بھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی شخص نے موم بتیوں کو انگلی اور انگوٹھے کے درمیان دبا کر بجھا دیا ہے۔ میں پریشان کھڑا ہوا دیکھ ہی رہا تھا کہ سر کے نیچے کی موم بتی بجھ گئی۔ اب اتنی موم بتیاں بجھ چکی تھیں کہ کمرے میں بہت سے سائے پیدا ہو گئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ میری جانب بڑھ رہے ہیں۔ ان موم بتیوں کے بعد الماری کے شمعدان کی باری تھی۔ ان کے علاوہ ایک دوسرے گوشے میں بھی اندھیرا ہو گیا۔ ایک ہوا کا جھونکا کھلے ہوئے دروازے سے آیا اور اس نے سنگھار میز والی موم بتی کو بھی بجھا دیا۔ اب میں موم بتیوں کو جلدی جلدی جلانے لگا لیکن گھبراہٹ کے باعث میرے ہاتھ لرز رہے تھے اور میں دیا سلائی کو جلانے میں خطا کر رہا تھا۔ اس دوران میں کھڑکی کی دو اور موم بتیاں بجھ گئیں لیکن میں بہت تیزی کے ساتھ انہیں دوبارہ جلانے میں مصروف تھا اب مجھے خیال تھا کہ میں اس مصیبت پر قابو پا گیا ہوں لیکن ایک ہوا کے جھونکے نے چار شمعوں کو ایک دم بجھا دیا۔ میرے اندر اور گھبراہٹ پیدا ہو گئی اور میں دوڑ دوڑ کر موم بتیاں جلانے لگا لیکن میں اندھیرے پر مکمل طور سے قابو پانے میں اب تک ناکام رہا تھا۔ میں نے ایک تدبیر سوچی کہ ایک موم بتی کے ذریعے ہی دوسری موم بتیوں کو روشن کروں اس سے میں دیا سلائی کو بار بار جلانے کی زحمت سے بچ سکوں گا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا لیکن ایک کو جلانے نہ پاتا تھا کہ دوسری بجھ جاتی تھی۔ میں دیوانہ وار ایک کے بعد دوسری موم بتی کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میرے حواس اب رخصت ہو چکے تھے اور کمرے پر چھا جانے والی تاریکی کا خوف دل پر مکمل طور سے غلبہ پا چکا تھا۔

اسی بھاگ دوڑ میں میری ٹانگ میز سے ٹکرا گئی اور میرے چوٹ آ گئی۔ میں نے اسی حالت میں ایک کرسی گرا دی اور خود بھی زمین پر آ گیا گرتے میں میرے ہاتھ کی موم بتی بھی گر کر بجھ گئی اور میں نے جلدی سے دوسری اٹھائی۔ لیکن یہ بھی بجھ گئی اور پھر آخری دو بھی میرا ساتھ چھوڑ گئیں لیکن کمرے میں ہنوز تھوڑی سی روشنی باقی تھی آتشدان میں آگ جل رہی تھی میں نے سوچا کہ اس سے موم بتیاں روشن کروں اس کام سے میں آگ کی طرف بڑھا لیکن قریب پہنچتے ہی وہ آگ بھی بجھ گئی اور پرچھائیوں نے دبیز اندھیرے کی شکل اختیار کر لی۔ میں نے موم بتی کو ہاتھ سے پھینک دیا اور خوفناک طور سے چیخنے لگا۔ مجھے چاندنی سے روشن برآمدہ کا خیال آیا اور میں اس کی طرف بے تحاشا بھاگا لیکن مجھے دروازہ کی صحیح جائے وقوع یاد نہ رہی تھی۔ میں بستر کے آخری حصہ سے زور سے ٹکرا گیا۔ اس کے بعد میں وہاں سے مڑا لیکن میری ٹکر ایک کرسی یا میز سے ہوئی۔ مجھے باہر نکلنے کی اپنی جدوجہد نامکمل طور سے یاد ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اس طرح ادھر ادھر بھاگنے میں میرے سر پر ایک زبردست چوٹ آئی اور اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔

میری آنکھ اس وقت کھلی جبکہ دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ میرے سر پر کچھ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو سوکھے ہوئے بازو والا شخص میرے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے گرد و پیش کو دیکھا اور یاد کرنے کی کوشش کی کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ تھوڑی دیر میں یاد کرنے میں بالکل ناکام رہا۔ میں نے دوسری جانب دیکھا وہاں بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ کل رات اس کے چہرے پر خالی الذہنی کے آثار تھے لیکن اب وہ مختلف معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک شیشی سے کوئی دوا گلاس میں ڈال رہی تھی۔

میں نے سوال کیا "میں اس وقت کس جگہ ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں آپ لوگوں سے واقف ہوں لیکن اس کے باوجود میں آپ لوگوں کو پہچان نہیں سکتا۔"

اس کے بعد انہوں نے پورا واقعہ بتایا اور میں نے آسیب زدہ کمرے کے متعلق یہ باتیں اس طرح سنیں جس طرح کوئی شخص بے بنیاد افسانہ سنتا ہے۔

اس نے کہا "ہم نے تمہیں کمرے میں صبح کے وقت پایا۔ اور تمہاری پیشانی اور ہونٹوں پر خون تھا۔ مجھے رفتہ رفتہ گذشتہ رات کے واقعات یاد آئے۔ بوڑھے شخص نے کہا" تمہیں اب میرے قول کا یقین آگیا کہ یہ کمرہ آسیب زدہ ہے۔ اب وہ اس طرح بات کر رہا تھا کہ گویا وہ ایک شکست خوردہ دوست پر اظہار غم کر رہا ہے۔

میں نے کہا "ہاں یہ کمرہ آسیب زدہ ہے"

اچھا تمہیں وہ نظر آیا۔ ہم تو اتنی مدت سے اس مکان میں رہتے ہیں لیکن ہم کو کوئی چیز نظر نہیں آئی کیونکہ ہم نے اسے دیکھنے کی کبھی جرات نہیں کی۔ اچھا سچ بتاؤ کہ کیا واقعی وہ وہی نوجوان تھا۔

"نہیں یہ وہ نوجوان نہیں تھا۔"

بوڑھی عورت بولی "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ بیچاری وہ عورت ہوگی جو خوف کے باعث مرگئی تھی۔"

میں نے کہا" وہاں نہ وہ خاتون تھی اور نہ وہ نوجوان بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک چیز۔ یہ ایسی چیز ہے جو انسان کے پیچھے ایک سایہ کی طرح لگی رہتی ہے۔ اور وہ ہے خوف! یہ خوف ہی ہے جو ہمارے حواس کو مختل کر دیتا ہے اور ہمارے دماغ کو مضطرب کرکے ناکارہ بنا دیتا ہے۔ یہی خوف میرا دالان میں پیچھا کر رہا تھا اور جب میں کمرے میں داخل ہوا تو یہی خوف میرے تعاقب میں تھا۔

میں نے دفعتہً اپنا سلسلہ گفتگو بند کر دیا تھوڑی دیر خاموشی رہی اور غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ میری پٹیوں پر چلا گیا۔

رات کو کھانسنے والے شخص نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا" مجھے علم ہے کہ وہاں کیا شے ہے۔ وہاں تاریکی کی ایک قوت حکمرانی کر رہی ہے یہ قوت وہاں ہر وقت موجود رہتی ہے خواہ وہ دن ہو یا رات۔ اس خاتون کے اس کمرے میں خوف ہے اور یہ خوف اس وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ یہ گناہ کا مکان باقی ہے۔

(ترجمہ از ایچ جی ویلز)

یونس شمد

رات تاریک تھی

چھمیا صحن میں کھڑی ہوئی قسمیں کھا کھا کر کہہ رہی تھی "بی بی جی، اگر میں نے چوڑیاں اُٹھائی ہوں تو میرے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ اگر میں نے دیکھی ہوں تو میری آنکھیں پھوٹ جائیں۔ مگر خالہ جان کو اُس کی قسموں اور اس کی باتوں پر اعتبار ہی نہ آتا تھا۔ وہ اُس کی ہر بات کے جواب میں اپنا سوال دہرا دیتیں۔

"تو پھر کون لے گیا؟" تیرے سوا گھر میں اور کون تھا۔؟ آسمان تو کھا نہیں گیا۔ زمین تو نگل نہیں گئی"؟

خالہ جان غصّے سے کانپ رہی تھیں۔ پھر وہ اپنے بڑے بڑے لانبے لانبے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی غسل خانہ سے نکل کر برآمدہ میں کھڑی ہوئیں۔ اور گلے میں پڑا ہوا دوپٹہ الگنی سے ٹانگ دیا۔ دھوپ برآمدہ میں آہستہ آہستہ اُتر رہی تھی۔

سردی اپنے شباب پر تھی۔ سرد ہوا کے جھونکے جسم کو چھوتے ہوئے گذر جاتے تو جسم کپکپا اُٹھتا۔ ان دنوں کوئٹہ میں سردی کا یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ جیسے جسم پر برف جم گئی ہو۔ ہاتھ پیر اکڑ جاتے ہیں۔ گھر سے باہر نکلنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ شکیل اور میں دونوں ایک ہی دفتر میں ملازم تھے ۔ میں اس سردی میں بھی دفتر ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا تھا۔ مگر شکیل نو بجے کے بجائے گیارہ بجے دفتر پہنچتا ۔ اور اب گیارہ بج چکے تھے۔ وہ اب تک کمرہ میں لحاف اوڑھے دبکا بیٹھا تھا۔

خالہ جان ! کئی بار اُسے آ کر اُٹھا گئی تھیں۔ چھمیا لوٹا۔ صابن دانی اور سلافچی سرہانے رکھ گئی تھی ۔ بال سُکھاتے ہوئے خالہ جان کو ایکا ایکی شکیل کے دفتر جانے کا خیال آ گیا۔ وہ غصہ میں بھری ہوئی تو تھیں ہی۔ شکیل پر برس پڑیں "بدبختی مارا۔! دوپہر تک بستر میں پڑا رہتا ہے۔ یہ بھی کوئی عادت ہے جانوروں کی سی۔ منہ ہاتھ دھوئیں نہ کُلّی کریں۔ ناشتہ کیا منہ کو چُپڑا اور دفتر چلے گئے۔ خبردار جو کل سے دیر سے اُٹھا۔ تم جیسے ہی افسروں نے تو دفتروں کی حالتیں خراب کر رکھی ہیں۔ منہ نور نہ پیٹ شعور ۔ !"

خالہ جان کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر شکیل نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا اور پھر کپڑے بدل کر دفتر چلا گیا۔ شکیل اور میں خالہ جان کے پاس تقریباً دو۔ ڈھائی سال سے رہ رہے تھے۔ یہاں ہم دونوں کو نوکری کے سلسلہ میں آنا پڑا تھا۔ شکیل میرا چچا زاد بھائی تھا۔ ہم دونوں بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر بالکل جی نہ لگتا تھا ـــــ خالہ جان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ ہم دونوں کو بالکل اپنے بچوں کی طرح رکھتیں۔ انہیں ہم سے بے انتہا محبت تھی۔

اُن دنوں میں ڈھاکہ جا رہا تھا۔ جب چھمیا نئی نئی ملازم ہوئی تھی اُس وقت چھمیا کی عمر کوئی تیرہ برس کی ہوگی۔ مگر اب جب میں ڈھاکہ سے واپس کوئٹہ آیا تھا۔ تو اُس کی جوانی پھوٹی پڑ رہی تھی ـــــ

انار کی طرح سرخ موٹی تازی، گداز جسم۔ درمیانہ قد۔ اب اُس میں بلا کی کشش آگئی تھی۔ اب میری نگاہیں اُس کے جسم چھوتی ہی نہ تھیں۔ جب وہ سامنے آتی تو میرا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ اور اگر وہ ہنس کر باتیں کرتی تو میرے دل پر بجلی سی کوند جاتی۔ اور میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے۔

صبح ہی صبح جب وہ مجھے اُٹھانے آتی تو میں بالکل انجان بن کر اُس کی گوری گوری نرم نرم کلائی پکڑ لیتا اور جی چاہتا کہ چھمیا سے پوچھوں۔

"کیا اُس نے بچپن میں کبھی مٹی کے گھروندے نہیں بنائے؟ کیا اسے بچپن یاد نہیں؟ کیا وہ ان کھیلوں کو بھول گئی؟!

اگر ایسا نہیں ہے —؟ تو پھر کیا اُسے کوئی ایسا کھیل یاد نہیں — جو میرے ساتھ کھیلا جا سکے۔

اس خیال کے آتے ہی میں انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھتا — اور چھمیا ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر لوٹا اور صابن دانی لینے کمرے سے باہر چلی جاتی۔

خالہ جان کو جب سے نمونیہ ہوا تھا چھمیا رات کو گھر پر ہی رک جاتی تھی — اس کا کمرہ میرے کمرے کے برابر ہی تھا میں گھنٹوں خیالوں میں چھمیا کے جسم سے کھیلا کرتا۔ چھمیا نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی تھی، میں رات کو دیر تک صرف اس لئے پڑھتا رہتا کہ چھمیا سو جائے تو چپکے چپکے چوروں کی طرح اُٹھ کر اُس کمرے میں جاؤں، اور اب کئی ہفتوں سے مجھے اس کی عادت سی ہو گئی تھی۔

میں چپکے چپکے چوروں کی طرح اُٹھ کر اُس کے کمرہ میں جاتا۔ اس کے کمرہ کی بتی جلا کر جلدی سے کمرہ کی الماری میں اپنے بستر کی چادر چھپا دیتا۔

"روز میرے کمرہ کی چادر غائب ہو جاتی ہے۔ نہ معلوم کون کمبخت میرے بستر کی چادر اُٹھا لے جاتا ہے۔"

میں چھمیا کے کمرہ میں یہ جملہ صرف اس لئے زور زور سے دہراتا کہ مجھے یہ معلوم ہو سکے کہ چھمیا سو رہی ہے۔ یا جاگ رہی ہے۔ اور جب یقین ہو جاتا کہ چھمیا سو رہی ہے تو آہستہ آہستہ چل کر میں اس کے پلنگ کی پٹی سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ ڈرتے ڈرتے اپنے ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیتا — مجھے اُس کی گردن کے نشیب پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس کا بدن ہلکی آگ میں جل رہا ہو —

کئی بار چھمیا میری اس حرکت کو دیکھ چکی تھی۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی؟ وہ تو مجبور تھی، اُسے نوکری کرنی تھی۔ کئی جانوں کا پیٹ پال رہی تھی، کئی جسموں کا ایندھن تھی۔ وہ گندے نالہ پر رہتی تھی، خالہ جان کے گھر اور گندے نالہ کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ اس کا باپ کہیں مل میں ملازم تھا۔ اور اب کچھ عرصہ سے تپ دق کے مرض میں مبتلا تھا، اس کی چھوٹی بہن نیلما پانچویں یا چھٹی جماعت میں تھی۔ اور خود چھمیا چھٹی کلاس پاس تھی۔ جب سے اُس نے خالہ جان کے یہاں نوکری کی تھی۔ پڑھنا لکھنا سب چھوڑ دیا تھا —

مگر اب وہ تین چار ماہ قبل میٹرک کے کورس کی کتابیں خرید لائی تھی۔ وہ شکیل سے حساب اور انگریزی پڑھا کرتی تھی۔ شکیل کیونکہ مجھ سے عمر میں کہیں چھوٹا تھا۔ اس لئے میں شکیل کے سامنے کبھی چھمیا کے سامنے نہ آتا۔ اور نہ بات کرتا —

کئی بار میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے دل کا حال شکیل سے کہہ دوں۔ مگر دوسرے ہی لمحہ شرم اور حجاب کی دیوار سامنے کھڑی ہو جاتی۔ اور سر ندامت سے جھک جاتا۔

ایک روز تنگ آکر چھمیا نے میرے خلاف خالہ جان سے شکایت بھی کر دی تھی۔ اور میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک روز ضرور چھمیا سے اس کا انتقام لے کر رہوں گا۔

کوئی رات کے بارہ بجے ہوں گے میں لائٹ آف کر کے لیٹا ہی تھا کہ مجھے برابر کے کمرے سے چھمیا کے رونے کی آواز سنائی دی یہ آواز میرے لئے غیر متوقع تھی۔ میں نے کھونٹی پر ٹنگا ہوا اوورکوٹ پہنا اور ننگے پاؤں چپکے چپکے چوروں کی طرح باہر نکلا چھمیا کے کمرہ کا دروازہ بند تھا۔ مگر کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اب اُس کے رونے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ چھمیا کا سر شکیل کے زانوں پر

رکھا ہوا تھا۔ اور شکیل چھمیا کو سمجھا رہا تھا۔

"ارے ــــ! یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ ! دیکھا نہیں خالہ جان کو کتنی شدید بیمار ہوئی تھیں۔" !

پھر کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی ــ چھمیا نے قدرے تیز لہجہ میں کہا۔

"شکیل تمہارا مجھ پر بہت قرضہ ہو گیا ہے۔!

"تو کیا ہوا ــ؟"

"نہیں شکیل۔! میں اب چاہتی ہوں کسی طرح تمہارا یہ تمام قرضہ ادا کر دوں۔ جب سے خالہ جان کی چوڑیاں چوری ہوئی ہیں وہ مجھ سے سخت ناراض ہیں۔ دوسرے نسیم بھائی بھی چین نہیں لینے دیتے۔ اس گھر میں اب نباہ بڑا مشکل ہے۔ "

"تو ۔ ۔ ۔ ۔ تم ۔ ۔ ۔ ۔ "! شکیل کہتے کہتے رکا۔ اور چھمیا فوراً بول پڑی۔

"مجھے بابو جی کے علاج کے لئے کافی روپیہ کی ضرورت ہے۔"

پھر اچانک اس کی ننھی بہن نیلما کے جملے اُس کے ذہن میں گونج گئے۔ جو اس سے ایک عرصہ سے کپڑوں کی فرمائش کر رہی تھی۔ چھمیا نے بلا جھجک شکیل سے کہہ دیا۔

"نیلما نے مجھ سے چلتے وقت کہا تھا ــــ باجی دیکھئے فراک پھٹ گئی ہے۔ نئی فراک لا دیجئے۔ اور میں اُس سے کل کا وعدہ کر کے خالہ جان کے گھر آ گئی ہوں۔" نیلما جھونپڑی کے دروازہ تک میرے ساتھ آئی تھی۔ اور میں اُسے یہ کہتا چھوڑ آئی تھی۔

"باجی! بھولئے گا نہیں۔ فراک ضرور لائیے گا ــ!"

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس کی سسکیاں بندھ گئیں۔ اس کے جواب میں شکیل نے جانے کیا بات کہی کہ وہ بالکل خاموش ہو گئی میں نے پھر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ اپنے دوپٹہ کے پلو میں آنسوؤں کو سمیٹ رہی تھی۔ جیسے اس کی تمام کائنات یہی ہوں۔

شکیل نے اپنے اورکوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر دس دس روپے کے چند نوٹ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ چھمیا نے نوٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے ــــ دبے لہجہ میں کہا۔

"کیا آپ مہر ادا نہیں کر سکتے ــ؟"

شکیل نے چھمیا کو بغور دیکھا اُس کی نگاہوں میں تجسس تھا۔

"چھمیا ۔ ۔ ۔ ۔ !!" شکیل سکتہ میں آ گیا۔

چھمیا کچھ دیر تک خاموش رہی اور پھر بولی۔

"شکیل بابو آپ سوچئے نہیں۔ میں آج رات آپ کا تمام قرضہ اُتارنے کو تیار ہوں۔ آپ مہر ادا کر دیجئے صرف بابو جی کے علاج کا معاوضہ"!

لمحہ بھر بعد کمرہ کی بتی بجھ گئی۔ میں اپنے کمرہ میں واپس لوٹ آیا۔ کچھ دیر بعد چھمیا کے کمرہ کا دروازہ کھلا۔ شکیل اپنے کمرہ میں گیا۔ اور پھر وہ دونوں صدر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

میں نے باہر نکل کر دیکھا۔ شکیل جلدی میں اپنا اورکوٹ برآمدہ میں چھوڑ گیا تھا ــــ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

رات تاریک تھی۔ طویل خاموشیوں کے لمبے سائے در و دیوار سے لپٹے ہوئے سو رہے تھے۔ چھمیا کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ شکیل اُس کو

سہارا دیے ہوئے جھونپڑی کے قریب پہنچا چمپا شکیل سے یہ کہہ کر علیحدہ ہو گئی۔

"اب میں خود چلی جاؤں گی۔!"

اور شکیل خدا حافظ کہہ کر واپس لوٹ آیا۔

چمپا جب جھونپڑی میں داخل ہوئی تو اس کا بوڑھا باپ بخار میں بے ہوش پڑا تھا۔ اور نیلما سو رہی تھی۔ چراغ کی دھیمی دھیمی زرد روشنی جھونپڑی کی فضا کو اور بھی خوفناک بنا دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک کھڑی بوڑھے باپ اور نیلما کو گھورتی رہی۔ اور پھر جب آہستہ آہستہ چل کر نیلما کے قریب لیٹی تو بوڑھا جاگ اٹھا۔

"کون ۔۔۔ ؟"

"میں بابوجی ۔ !"

"اتنی رات گئے ۔ !"

"ہاں بابوجی۔ طبیعت نہ لگی آپ کی بیماری کی وجہ سے۔ !"

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ کہ بوڑھے کو کھانسی کا سخت دورہ پڑا اس نے بوڑھے کو سہارا دیا۔ کھانسی کی آواز سنکر اس کی بہن نیلما بھی جاگ گئی اٹھ کر پانی کا گلاس دیا۔ چمپا نے بوڑھے کو پانی پلایا۔ اور پھر اُسے چٹائی پر لٹا دیا۔ چمپا نے نیلما سے کہا۔

"دیکھ ۔! تیرے تکیئے کے نیچے کیا رکھا ہے۔"

دوسرے ہی لمحہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی نیلما کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ وہ فرطِ مسرت سے چیخی۔

"باجی اب تو میرے لئے اچھی سی فراک لاؤگی نا ۔!"

اُس جملہ پر چمپا نے محبت اور پیار بھری نگاہوں سے نیلما کو دیکھا۔ اور پھر اُس کے ہونٹ چوم لئے پھر نیلما نے نہ جانے کیا سوچ کر پوچھا۔

"باجی ۔! یہ کہاں سے آئے"؟

اور چمپا کو اپنا وجود گہرائیوں میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوا۔ وہ نیلما کو کچھ جواب دیتی کہ بوڑھے پر ایکبار پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ اس بار کھانسی کا دورہ سخت تھا۔ بوڑھا نڈھال ہوا جا رہا تھا۔ چمپا اتنی تجربہ کار تو نہ تھی۔ مگر بوڑھے کی حالت دیکھکر اسے اندازہ ہو گیا کہ بوڑھے کا وقت قریب ہے۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے بوڑھے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بوڑھے کی نبض ڈوب رہی تھی پھر ایک ہچکی آئی اور بوڑھے نے آنکھیں بند کر لیں۔

"بابوجی ۔!" وہ بوڑھے کی بے جان لاش سے لپٹ کر دھاڑیں مار ۔ مار کر رونے لگی ۔ نیلما بھی رونے لگی۔

جب وہ دل بھر کر رو چکی تو اس نے نیلما کے تکیے کے نیچے پڑے ہوئے روپیہ اور چوڑیاں نکالیں ۔ اور دوسرے ہی لمحہ شکیل کا عکس اُتر آنکھوں میں اُتر آیا۔ اور اس نے اپنی مٹھیاں زور سے بھینچ لیں۔ اور پھر دوسرے ہی لمحہ چوڑیاں اور روپئے دروازہ سے باہر پھینک دیئے۔

نیلما زور سے چیخی۔

"باجی ۔ !!"

پھر وہ تیزی سے روپئے اور چوڑیاں اٹھانے جھونپڑی سے باہر آگئی۔ اور میں جھونپڑی کے دروازہ سے ایک طرف ہٹ گیا چمپا نے اندر سے چیخ کر کہا

"انہیں مت اٹھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!" وہ کچھ نہ کہہ سکی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

نامۂ فنکار۔ ڈھاکہ ۔ مدیر اختر لکھنوی

ڈھاکے سے ندیم کے بعد فنکار کا اجراء۔ اُردو کے لئے بلاشبہ ایک فالِ نیک ہے۔ ارشد کاکوی نے فنکار کی افتتاحی تقریب میں یہ صحیح کہا
کار کی اشاعت مشرقی پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ زیر نظر شمارہ دوسرا شمارہ ہے۔ اداریے میں نقشِ اول کے
ن سے آدم جی انعامات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مدیر نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ اردو کے دونوں انعامات صرف ایک ہی صنف
ں دئے گئے؟ اور شاعری کو جو اردو زبان کے لئے وجہ ناز ہے نیز دوسری اصناف کو کس لئے ناقابل اعتنا ٹھہرایا گیا۔ مدیر کا اعتراض صحیح
اس واقعے سے ہم سب کو عبرت حاصل کرنا چاہئے۔ اور اختر لکھنوی کو معلوم ہونا چاہئیے کہ جب ادب قطعاً غیر ادبی مصلحتوں کا شکار ہو جاتا ہے
اسی قسم کے بصیرت افروز "حادثات ظہور میں آنے لگتے ہیں جن افسانوی مجموعوں کو انعام دیا گیا ہے وہ انعام کے مستحق تھے لیکن بقول مدیر فنکار یہ
ہوتا کہ انعامات مختلف اصناف ادب کو دئے جاتے۔" "بیادِ مجاز" کے عنوان سے ارشد کاکوی کا مختصر مضمون "مجاز کی حقیقت" اور شبیر علوی کا مضمون
زکی رجائیت" خوب ہیں۔ ارشد نے مجاز پر اظہار خیال کرتے ہوئے چونکہ اپنی "کو مکنی" کو بھی یاد رکھا ہے اس لئے مضمون میں بڑی اثریت پیدا ہو گئی ہے
ے مضامین میں سید یوسف حسن کا ترجمہ "ہر آرٹ پروپیگنڈا ہوتا ہے" بہت کامیاب ہے۔ اس مضمون میں ادب کو بظاہر بہت ہی سخت
دی گئی ہے لیکن ہمیں خود پروپیگنڈے کی اصطلاح پر تطہیر نفس کے ساتھ غور کرنا پڑے گا ممکن ہے کہ اس کے بعد ہم اس گالی سے "بے مزہ" نہ ہوں
ن علاقائی گلدستے کے عنوان سے مدیر فنکار کے نام شاعر صدیقی کا خط بعض دلچسپ حضرات سے انصاف کا طالب ہے بحیثیت مجموعی فنکار کے
لعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر لکھنوی اور ان کے ساتھی نظر باز نہیں بلکہ صاحب نظر لوگ ہیں۔

کاکل صبح - مجموعہ کلام عشرت کرتپوری۔ ناشر سب رنگ کتاب گھر

عشرت کرتپوری نئی نسل کے ایک ہونہار شاعر ہیں کاکل صبح ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ دیباچہ جمیل مہدی نے لکھا ہے۔ علاوہ ازیں احسان دانش مفتی اقتدار اور رشید حسن خاں نے شاعر کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کیا ہے "کچھ اپنے متعلق" کے عنوان سے عشرت کرتپوری نے جو سطور تحریر کی ہیں وہ قاری کو ان کی شریف، مخلص اور بلند نظر شخصیت سے قریب تر کر دیتی ہیں۔ ان کا پہلا ہی جملہ مجبور کر دیتا ہے "چونکہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا اس لئے تاریخ پیدائش والدین نے یاد نہیں رکھی" وہ یہ جملہ بہت ہی سرسری طور پر لکھ گئے ہیں لیکن کس قدر زہرناک طنز ہے اس جملے میں! اور کس قدر عظیم اور قابل احترام ہے یہ جملہ ان کی شاعری اور شخصیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے عالی ظرف اور بلند خیال انسان ہیں۔ ان کی شخصیت میں وہ احتشام نہیں جو آدمی کو تماشا بنا دے بلکہ وہ استحکام ہے جس سے کوئی شخصیت ایک مستقل اکائی کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہے۔ کاکل صبح قطعوں غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ غزلوں کے چند متفرق اشعار سنئے۔

یوں ہیں مایوس دل میں امیدیں — جیسے روشن ہوں مقبروں پہ دئے

تراوصال محبت کی موت تھا یہ درست — ترا فراق محبت کی خوش نصیبی ہے

شکر ہے باوفا دوستوں نے — غم بڑے خوبصورت دئے ہیں

"کلرک" اور "آج اور کل" اچھی نظمیں ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری میں حسن بھی ہے اور مقصدیت بھی ایک ایسی مقصدیت جو فن میں حسن کے صحت مند شعور کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے۔
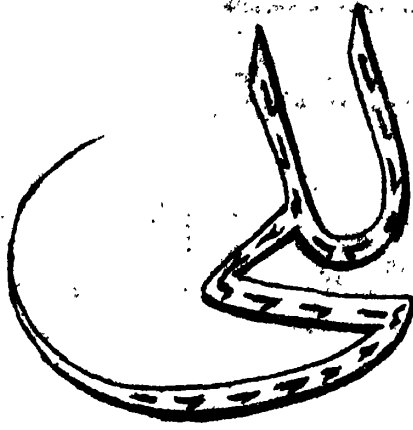
یہ نام ہے اُس خوبصورت شے کا ——
جو پاکستان کے عوام میں بے انتہا مقبول ہے۔
اعلیٰ ذوق نفاست رکھنے والے حضرات اس نام
کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔
خوش سلیقہ خواتین۔ اس نام کی پاکیزگی پر یقین
کرتی ہیں —— اور
دلکش و مہ جبیں چہرے۔ اپنی دلکشی و خوبصورتی
میں اضافہ کرنے کے لئے اس کی اعلیٰ خصوصیات
کی گرویدہ ہیں۔
آپ نے یقیناً للّی کا نام سنا ہے۔ آج ہی للّی
استعمال کیجئے۔
للّی آپ سب کے لئے بہترین۔

ذوالفقار انڈسٹریز لمیٹڈ —— اعلیٰ صابن تیار کرنے والا ادارہ

• جاری کردہ۔ ذوالفقار انڈسٹریز لمیٹڈ۔

The INSHA Monthly
98, New Cloth Market, Karachi-2.
Phone: 37433
30897

صرف سرورق بشیر آرٹ پریس - پرارتھنا سماج روڈ - کراچی میں چھپا -